ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
مئی ۱۹۹۵ء

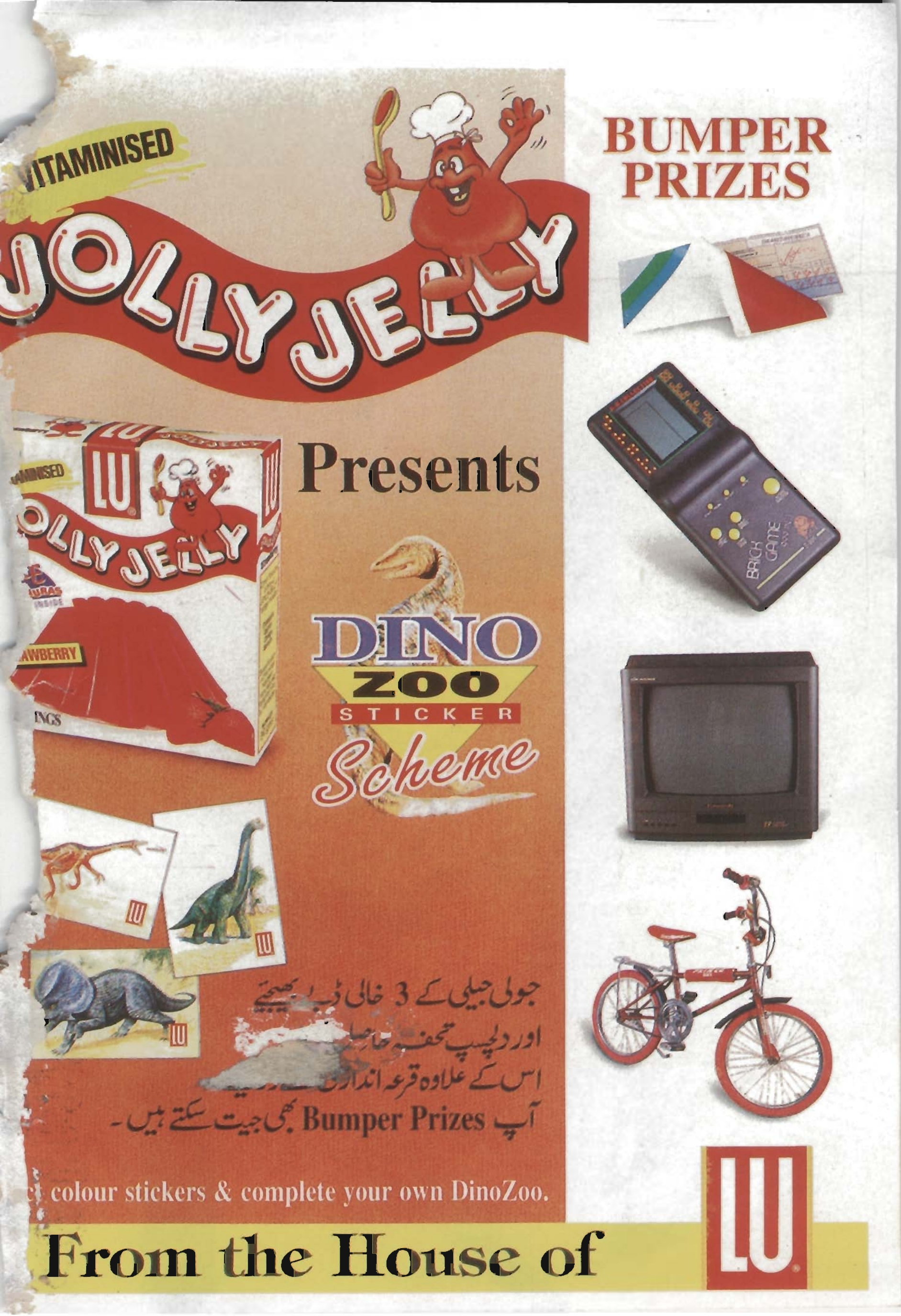

VITAMINISED
JOLLY JELLY
Presents
DINO
ZOO
STICKER
Scheme
BUMPER PRIZES
BRICK GAME
جولی جیلی کے 3 خالی ڈبے بھیجیے
اور دلچسپ تحفہ
اس کے علاوہ قرعہ اندازی
آپ Bumper Prizes بھی جیت سکتے ہیں۔
colour stickers & complete your own DinoZoo.
From the House of
LU

SUPER CRISP
Snacks for all seasons
مزے مزے کے چپس، دال مونگ، پی نٹس، نمکو مکس اور آب بادام بھی
حفظانِ صحت کے بین الاقوامی
معیار کے مطابق
ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک
WINNER OF MERIT
EXPORT TROPHY
SUPER CRISP
trippie-em
SUPER CRISP
SUPER CRISP
NIMKOMIX
SUPER CRISP
PEANUTS
SUPER CRISP
DAL MOONG
SUPER CRISP
ALMONDS
FRIED & SALTED

Pakola
bubble up
APPLE SIDRA
جو انعام جیتیں اُس کا ڈبل لے جائیں
DOUBLE YOUR PRIZE
30 Lakh Prizes
In each and every crown cap of the regular and junior bottles you will find one half of a cash or prize token. Find the other half and...
FREE
WE'LL DOUBLE WHATEVER YOU WIN!
اگر آپ نے 100 روپے کا انعام جیتا تو ہم آپ کو 200 روپے دیں گے۔ اسی طرح 1000 روپے جیتنے پر 2000 روپے دیں گے۔ آپ نقد کے علاوہ ہمارے دیگر انعامات بھی جیت سکتے ہیں جیسے ڈش انٹینا اور
علی حیدر کا نیا آڈیو کیسٹ
'داستان' (SONIC ریلیز)
نقد اور دیگر انعامات کی اس برسات سے آپ بھی فائدہ اٹھائیے۔
دو ملائیں، دگنا پائیں

ٹھنڈا ٹھنڈا ہرا ہرا
کوئس
آئسکریم سیرپ
کوئس
آئسکریم سیرپ
بچے کہیں، بڑے کہیں۔ اور، اور، اور

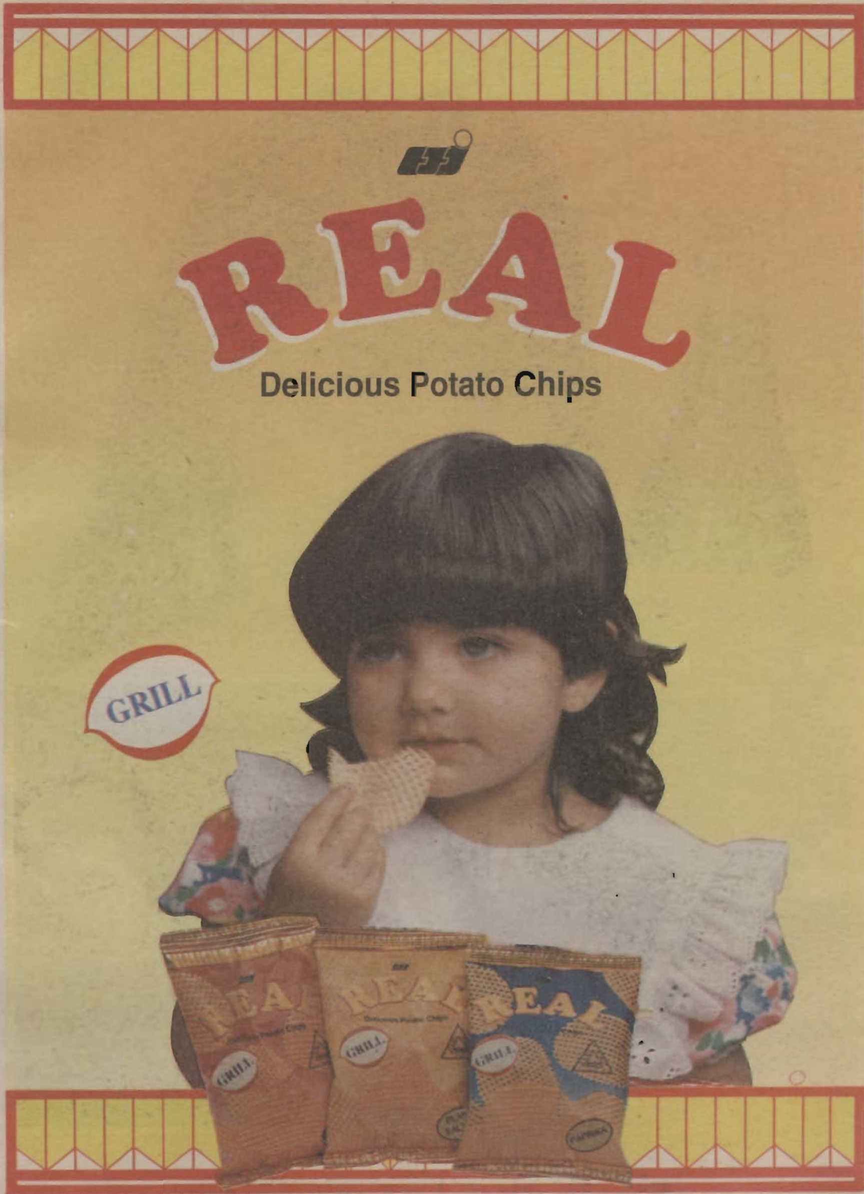
REAL
Delicious Potato Chips
GRILL

افزائشِ ذائقہ میں کیا مضائقہ
رُوح افزا
تسکینِ کام و دہن
کے نئے انداز
کسٹرڈ، فروٹ سلاد، جیلی، لسی،
ملک شیک، قلفی، آئس کریم یا آپ کی
پسندیدہ کوئی اور ٹھنڈی میٹھی ڈش ہو۔
اس میں رُوح افزا کا اضافہ کیجیے اور ایک
نئے ذائقے کا لطف اٹھائیے۔
دُہری لذّت، مزہ دوبالا
رُوح افزا
مشروبِ مشرق
ہمدرد
پاکستان سے محبت کرو — پاکستان کی تعمیر کرو
حکیم محمد سعید
Adarts-HRA-5/95

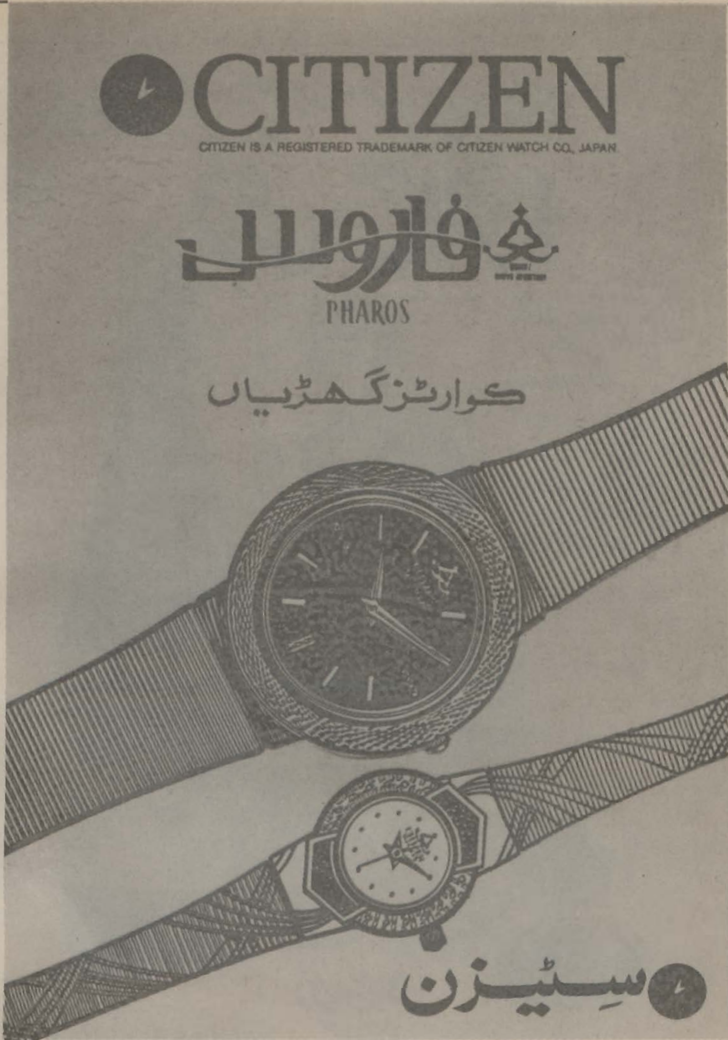

ایکسلسیئر واچ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ
شہزادہ چیمبرز، زیب النساء اسٹریٹ۔ کراچی فون نمبر: ۵۰۱۱۵۰۴-۵۶۸۱۶۷۲
۱۹۱۔ پینوراما سینٹر۔ شاہراہ قائداعظم۔ لاہور۔ فون نمبر: ۶۳۰۱۰۴۲-۶۳۰۱۰۴۳

SofTouch
Baby Lotion

SofTouch بے بی لوشن سے دِن کا آغاز
کریں تو ایک نئے پن کا احساس ہوتا
ہے ۔ اس میں شامل مخصوص موائسچرائزر
آپ کے بچے کی جِلد کی تازگی بَرقرار
رکھتا ہے اور نیپی ریش سے تحفّظ
دیتا ہے ۔

آپ اس یقین کے ساتھ SofTouch بے بی
لوشن ، شیمپو اور پاؤڈر استعمال کر سکتے ہیں کہ یہ
انتہائی معیاری اجزاء کا مرکّب ہیں اور ایک ایسے
ماحول میں تیار کئے گئے ہیں جہاں حفظانِ صحت کے اصولوں کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے ۔
اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ بچّوں کے لئے محفوظ ، ساز گار اور آرام دِہ ہیں ۔ بچوں کے ہر دن کا آغاز
SofTouch بے بی شیمپو ، لوشن اور پاؤڈر سے کیجئے ... غسل کرتے وقت ، نیپی تبدیل
کرتے وقت ... کسی بھی وقت !

Soft, Pure, Gentle.

ICI

ICI Pakistan Limited
Consumer Products

5-West Wharf, Karachi-74000.

Goldfish
Deluxe Pencil
حقیر سی لکیر
حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی
گولڈفِش ڈیلیکس پینسل
SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 2577392 - 95 (4 Lines)
جہاں چلے، رَواں چلے

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

ذی قعد ذی الحجہ ۱۴۱۵ مئی ۱۹۹۵ء

جلد ۹

شمارہ ۱۱

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

مینیجر اشتہارات
عمران احمد

مصور
مومن رحیم

فون نمبر: ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیرالدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۶، ۱-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

قیمت: ۳۰ روپے
۱۵ درہم ۱۵ ریال

ناشر: ظفر محمود شیخ ۔ طابع: زاہد علی ۔ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف	عبدالباسط راشد اعوان	۱۰
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۱۱
حمدِ باری تعالیٰ	معین تابش	۱۲
عدلِ فاروقی	عبدالستار خان طاہر	۱۳
اُداس لڑکا	اخلاق احمد	۲۰
اِک دن بکرا منڈی میں (نظم)	افشاں بشیر	۲۸
ڈپٹی نذیر احمد	ڈاکٹر اسلم فرخی	۳۱
چھٹی کا ایک دن	فصیح باری خان	۳۸
اِک دوجے سے پیار کرو (نظم)	قتیل شفائی	۴۷
مہمان	نائلہ صدیقی	۴۸
زندگی کیا ہے ؟	نگہت آرا چوہان	۵۲
دیر نہ ہو جائے	سلمان غزالی	۵۶
الارضُ لِلّٰہ (نظم)	محمد جاوید خالد	۶۰
شریف آدمی شریر شاعر	طاہر مسعود	۶۱
روئی کی نیکی	سیّدہ صدف عرفان	۶۵
آئی ایم سوری	شازیہ فرحین	۶۸
میری سب سے بڑی خواہش	سلیم خالق	۷۵
میرا دوست ولید	عابد سلطان	۸۰
یہ ہفتہ کیسا رہے گا ؟	سیما صدیقی	۸۴
چند لمحے سانپوں اور سپیروں میں	سلیم مغل	۹۳
مٹی کا تیل (نظم)	اُفق دہلوی	۹۸
شیطان کا دشمن	شہناز بانو	۹۹

بکرا سوا لاکھ کا ــــــ محمد جنید هارون لاکھانی ــــ ۱۰۴
ایک خبر ایک کہانی ــــ منیر احمد راشد ــــ ۱۱۱
تعریف اُس خدا کی (نظم) ــــ محمد علی انصاری ــــ ۱۱۷
آمنے سامنے ــــ سلیم خالق ــــ ۱۱۸
ہنستے ہنستے ــــ منتخب لطائف ــــ ۱۲۳
اب میں کیا کروں؟ ــــ ادارہ ــــ ۱۲۹
فرمانِ نبویؐ (نظم) ــــ زاهد الحسن زاهد ــــ ۱۳۳
بچے ہمارا مستقبل ــــ محمد عمر احمد خان ــــ ۱۳۴
صحیح طریقہ ــــ عثمان بن سلیم ــــ ۱۴۱
بچے کیا لکھتے ہیں؟ ــــ ادارہ ــــ ۱۴۷
یادِ وطن (نظم) ــــ سیّد انیس احمد ــــ ۱۴۹
حل ــــ اشتیاق احمد ــــ ۱۵۰
بوجھ ــــ راحت صلاح الدین ــــ ۱۵۷
بنام آنکھ مچولی ــــ خطوں کے جواب ــــ ۱۶۳
چڑ جلیبی ــــ فاروق حسن چانڈیو ــــ ۱۶۷
گرمی (نظم) ــــ ضیغم حیدی ــــ ۱۷۱
سوال آدھا جواب آدھا ــــ محمد بن مالک ــــ ۱۷۲
اس میں خطرہ ہے ــــ محمد عادل منہاج ــــ ۱۷۴
بے رحم ٹرائی اینگل ــــ عبد الوارث ــــ ۱۷۹
رکھنا یاد نصیحت میری (نظم) ــــ محمد انوار احمد ــــ ۱۸۴
ایک دفعہ کا ذکر ہے ــــ نعیم مشتاق نومی ــــ ۱۸۵
لڑکیاں زیادہ بہادر ہوتی ہیں ــــ ادارہ ــــ ۱۹۳
کشمیر جاگتا ہے (نظم) ــــ محمد شاهد فیروز ــــ ۲۰۲
سوتا جاگتا ابوالحسن ــــ نیّر مسعود ــــ ۲۰۴
قلم دوست ــــ ننھی تحریریں ــــ ۲۱۱

سنہرے حروف

چوتھی صدی میں سامانی خاندان کے فرمانروا النصر بن احمد جب نیشاپور میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنا دربار منعقد کیا اور جاہ و جلال کے ساتھ تختِ سلطنت پر بیٹھے۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد فرمائش کی کہ کارروائی کا افتتاح کلامِ پاک کی تلاوت سے ہو۔ ایک بزرگ تلاوتِ قرآن کے لئے تشریف لائے اور انہوں نے پر سوز لہجے میں سورۃ المومن کا دوسرا رکوع پڑھنا شروع کیا۔ اور جب وہ اس آیت پر پہنچے

لمن الملک الیوم لله الواحد القهار ○ (المومن)

آج اقتدار کس کا ہے؟ اللہ واحد و قہار کا۔

یعنی قیامت کے روز جب پوچھا جائے گا کہ بتاؤ آج کس کا اقتدار ہے؟ تو سارا عالم پکار اُٹھے گا، اقتدار صرف اللہ کا ہے جو واحد و قہار ہے۔

النصر بن احمد پر ہیبت طاری ہو گئی لرزتے ہوئے تخت سے نیچے اُترا، شاہی تاج سر سے اُتارا اور سجدے میں گر گیا وہ بار بار یہی فقرہ دہرا رہا تھا:

اے میرے رب! اقتدار تیرا ہی ہے نہ کہ میرا
بادشاہی تیری ہی ہے نہ کہ میری

مرسلہ... عبدالباسط راشد اعوان، کوٹری

ماہِ رواں کی پہلی بات

نو سال ہو گئے.................

نو سال کم تو نہیں ہوتے۔ اتنی مدت میں ایک بچہ اسکول جانے لگتا ہے اور اسکول کا طالب علم کالج کی آزاد فضاؤں میں پہنچ جاتا ہے...... تو اگر کوئی پوچھے کے اتنے عرصے میں آنکھ مچولی نے بچوں کو کیا دیا؟ اس بارے میں ہمارا کچھ کہنا شاید اچھا نہ لگے۔ یہ تو آپ لوگ بہتر بتائیں گے۔ ہم تو صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ آنکھ مچولی نے جو اتنی روایتوں کو جنم دیا تو اس میں ہمیں کتنا خون پسینہ بہانا پڑا۔ اور اس کے کیسے اچھے نتائج سامنے آئے۔ دیکھئے نا یہی فائدہ کیا کم ہے کہ آنکھ مچولی کی دیکھا دیکھی کتنے بہت سے نئے رسالے جاری ہوئے۔ یہاں تک کہ پرانے رسالوں کو بھی اپنے معیار اور انداز پر توجہ دینی پڑی۔ پھر یہ کہ رسالے کے ساتھ پہلے تحفہ دینے کا رواج کب تھا اور تو اور کسی خاص موضوع پر پورا شمارہ نکالنے کا رجحان بھی کہاں تھا؟ اور وہ بھی ایسے منفرد اور مفید موضوعات پر خصوصی شمارے جن کی کوئی مثال بچوں کی صحافت میں اس سے پہلے نہیں ملتی پھر یہ کہ آنکھ مچولی نے لکھنے والوں کی ایک بڑی اچھی ٹیم تیار کی...... تحریروں کا معاوضہ دینا بھی ایک معمول بنا۔ رسالے کے ساتھ ایسے ایسے اچھوتے تحفے دیئے کہ نہ اس سے پہلے کسی نے دیئے اور نہ بعد میں کوئی امکان ہے۔ انہی باتوں کی وجہ سے ایک بار ہم نے لکھا تھا "آنکھ مچولی کا مقابلہ خود آنکھ مچولی سے ہے۔" اس کے معنٰی یہ تھے کہ اس رسالے کو خود اپنا ہی ریکارڈ توڑنا ہے۔ اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسرے رسالے اچھے نہیں ہیں۔ سب ہی اچھے ہیں اور اپنے اپنے دائرے میں اپنا کام کر رہے ہیں۔ آنکھ مچولی کی ان کامیابیوں کو گنوانے کا مقصد ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا ہے اور وہ پہلو یہ ہے کہ ان تمام کامیابیوں کے باوجود آنکھ مچولی مالی اعتبار سے آج تک مستحکم ادارہ نہیں بن سکا۔ اور کبھی اتنا مالی فائدہ نہیں ہوا کہ یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا۔ تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ اگر آنکھ مچولی کے پیچھے ایک مستحکم ادارہ نہ ہوتا اور اس کے مدیرِ اعلیٰ کے دل میں بچوں کے لئے محبت و شفقت کا بے پناہ جذبہ نہ ہوتا تو یہ رسالہ کب کا دم توڑ چکا ہوتا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آنکھ مچولی یا بچوں کا کوئی بھی رسالہ کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اشتہارات سے ایسے رسالوں کو خاطر خواہ آمدنی ہوتی نہیں۔ رسالے کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کیا نہیں جا سکتا۔ پھر اس کے علاوہ کون سا طریقہ ہے بچوں کے کسی رسالے کی حالت کو بہتر بنانے کا؟ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے اکثر رسالے کچھ عرصے تک نکلنے کے بعد بند ہو جاتے ہیں۔ آنکھ مچولی پر بھی اخراجات کا بے پناہ بوجھ ہے۔ کبھی کبھی اس بوجھ تلے جب اس کی سانس اکھڑنے لگتی ہے تو مجبوراً نہ چاہتے ہوئے قیمت بڑھانی پڑتی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی رسالے کا بھی مستقبل محفوظ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اپنے اخراجات خود برداشت کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ آپ ہی بتایئے ہم کیا کریں!......؟ اس مسئلے کا کیا حل ہے........؟

انہی مسائل کے ہجوم میں خاص نمبر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کیسا لگا؟ اس بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرنا نہ بھولیئے گا۔ اور ہاں جو مسئلہ ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا...... اس کا جواب بھی آپ ہی کو دینا ہے۔ انتظار رہے گا۔

آپ کا دوست۔ طاہر مسعود

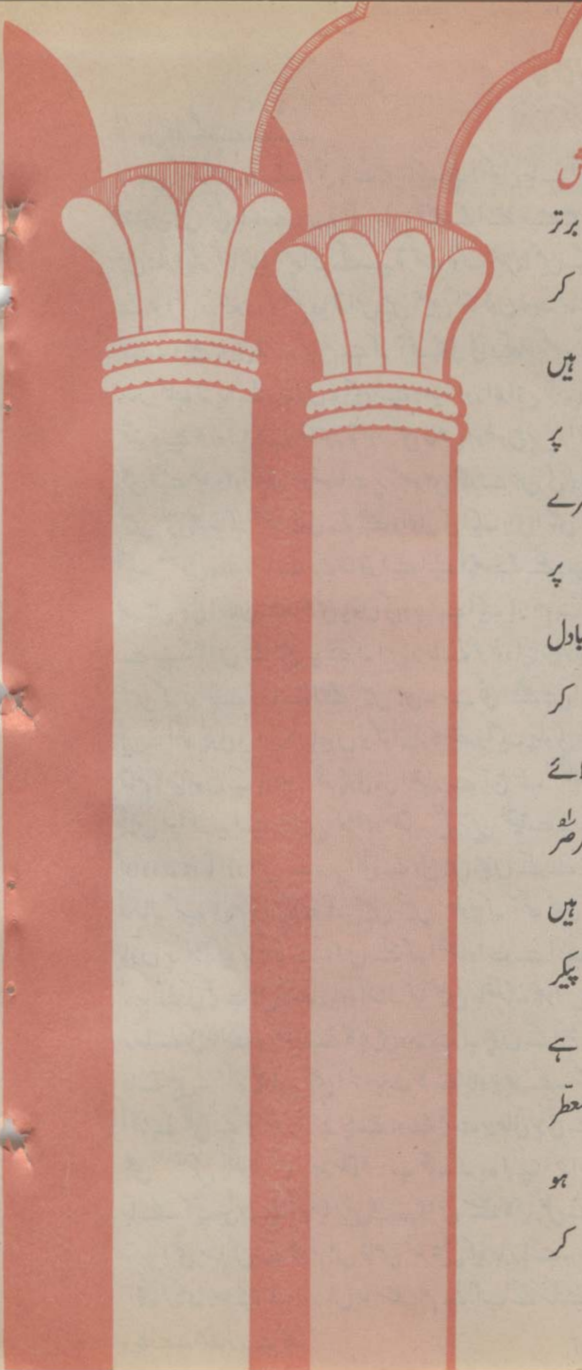

حمدِ باری تعالیٰ

معین تابش

سب سے اعلیٰ سب سے برتر
یکتائی میں سب سے بڑھ کر

تیری رحمت کے سائے ہیں
ارض و سما کیا جن و بشر پر

سورج تیرے حکم سے اُبھرے
دن نکلے تیرے اِیما پر

تیرے حکم سے کالے بادل
لاتے ہیں پانی بھر بھر کر

تو چاہے تو ٹھنڈک لائے
شام ڈھلے صحرا کی صرصر[1]

تیری قدرت کے مظہر ہیں
گلشن میں پھولوں کے پیکر

تیرے نام سے ہوجاتی ہے
آنکھ منوّر، روح معطّر

جس میں تیری رضا شامل ہو
تابشؔ کو وہ جذب عطا کر

۱۔ تیز ہوا

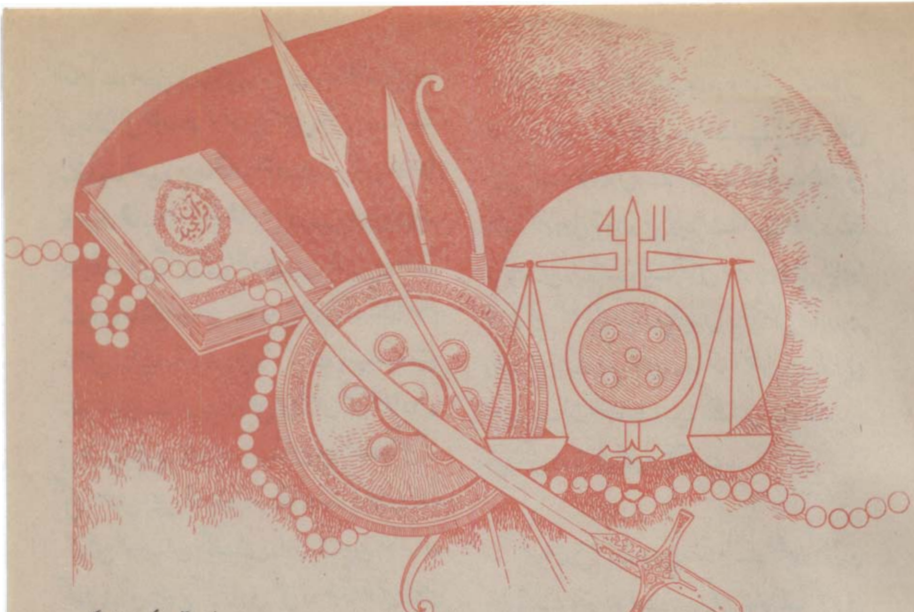

عدلِ فاروقی

عبدالستار خان طاہر

عمر بن الخطاب نے عدل و انصاف میں شہرت پائی ہے۔ "عدلِ فاروقی" ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ان کے عدل کی لاٹھی سے سب یکساں طور پر ہانکے جاتے تھے۔ ان کی لاٹھی غربت اور امارت، رنگ اور نسل، آقا اور غلام کو نہیں پہچانتی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت تھی اور زمانہ ۶۳۸ء بمطابق ۱۷ ہجری کا تھا۔ اسلامی فوجیں سلطنت اسلامیہ میں توسیع کرتی ہوئیں آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھیں۔ اسلامی فوجیں مختلف محاذوں پر برسرِپیکار تھیں شام کے محاذ پر حضرت خالد بن ولید اور ابو عبیدہؓ بن الجراح (جو کہ امین الامت کے لقب سے پکارے جاتے تھے) اسلامی فوجوں کی کمان کر رہے تھے۔ جب سلطنت شام مکمل طور پر فتح ہو گئی تو اس کے مختلف شہروں پر حضرت عمر فاروقؓ نے مختلف حاکم مقرر کر دیئے جن میں شہر قنسرین کا حاکم حضرت خالد بن ولیدؓ کو مقرر کر دیا۔ دن گزرتے گئے اور ملتِ اسلامیہ وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی ایک دن حضرت عمر فاروقؓ کو اپنے دارالخلافے مدینہ میں اطلاع ملی کہ خالد بن ولیدؓ نے ایک شاعر کو جس کا نام اشعث بن قیس تھا دس ہزار درہم صرف اس لئے

انعام کے طور پر دیئے ہیں کہ اس نے قنسرین جا کر خالدؓ کی فتوحات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ اشعث بن قیس بنو کندا کا سردار تھا۔ اس نے شاعری اور مدح سرائی کو پیشہ بنالیا تھا۔ اسی ضمن میں اشعث بن قنسرین خالدؓ کے ہاں جا پہنچا اور ان کے مداح سرائی کر کے انعام حاصل کر لیا۔ خالد بن ولیدؓ امیر باپ کے بیٹے تھے انہوں نے غربت دیکھی ہی نہیں تھی، شہزادوں کی طرح پلے بڑھے تھے۔ یہ تو ان کی عظمت تھی کہ صحیح معنوں میں شہزادہ ہوتے ہوئے انہوں نے آدھی عمر میدانِ جنگ میں، اور زمین پر سو کر اور گھوڑے کی پیٹھ پر گزار دی تھی وہ طبعاً خوش ذوق اور فیاض تھے۔ ہر حسین چیز کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے اس شاعر کو جو انعام دیا تھا وہ اپنی جیب سے دیا تھا اس زمانے میں سالار اس سے زیادہ امیر ہوتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ دشمن کے جس سالار کو وہ ذاتی مقابلوں (یہ اس زمانے کی جنگوں میں رواج تھا کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے دونوں فوجوں کے سالار اور بہادر آدمی انفرادی طور پر ایک دوسرے کو شکست دیتے تھے اور پھر بعد میں عام جنگ شروع ہو جاتی تھی) میں شکست دیتے تھے اس کے تمام تر مال و دولت کے خود حقدار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں مالِ غنیمت میں بھی حصہ ملتا تھا۔ خالد بن ولیدؓ نے دشمن کے بے شمار سالاروں کو ذاتی مقابلوں میں قتل کیا تھا ان کے مال و اموال خالد بن ولید کے حصے میں آئے تھے۔ لیکن تاریخ طبری، ابن ہشام اور علامہ واقدی کے مطابق خالد بن ولیدؓ نے اتنا مال و دولت اپنے پاس رکھا ہی نہیں تھا۔ مورّخوں نے لکھا ہے کہ جب شام کی جنگ ختم ہوئی تو خالد بن ولیدؓ نے اپنے سوار دستے (خالد بن ولیدؓ نے ایک اسپیشل سوار دستہ تیار کیا ہوا تھا جو غیر معمولی بہادر سپاہیوں پر مشتمل تھا اور ہر وقت ان کے زیر کمان رہتا تھا) گھسواروں کو اپنی جیب سے نقد انعامات دیئے تھے اس سے خالد بن ولیدؓ کی دریا دلی کا پتہ چلتا ہے۔

○

عمر فاروقؓ نے تاریخِ اسلام کے مشہور مؤذن بلالؓ کے ہاتھ ابو عبیدہ بن الجراح کو ایک تحریری حکمانہ بھیجا۔ جس کی تحریر کچھ اس طرح تھی۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" خدا کے بندے عمر فاروقؓ کی طرف سے ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے نام .... خالد بن ولیدؓ کو مجاہدین کی جماعت کے درمیان کھڑا کرو۔ اس کے سر سے دستار (پگڑی) اتارو۔ دستار سے اس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کے باندھو۔ ٹوپی بھی اس کے سر سے اتار دو۔ پھر اس سے پوچھو کہ اس نے ایک شاعر اشعث بن قیس کو انعام اپنی جیب سے دیا ہے یا مالِ غنیمت سے۔ اگر وہ اقبال کرے کہ مالِ غنیمت سے دیا ہے تو اسے خیانت میں پکڑو۔ اگر اس نے اپنی جیب سے دیا ہے تو اس پر فضول خرچی کا الزام عائد کرو۔ ان میں سے جس الزام کا بھی وہ اعتراف کرتا ہے اس کے جرم میں اسے اس کے عہدے سے معزول

کر دو اور اس کی جگہ تم خود عہدہ سنبھال لو۔ "
یہ عربوں کا رواج تھا کہ جس پر کوئی الزام ہوتا تھا اس کے ہاتھ اسی کی پگڑی سے باندھ کر لوگوں کے سامنے پوچھا جاتا تھا کہ اس نے یہ جرم کیا ہے یا نہیں ایک عام آدمی کے ساتھ یہی سلوک ہوتا تھا لیکن عمر فاروقؓ نے خالد بن ولیدؓ جیسے عظیم اور تاریخ ساز سالار کو بھی عام آدمی کی سطح پر کھڑا کر دیا تھا۔ (کیونکہ اسلام میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز نہیں ہے) محمد حسین ہیکل مختلف مؤرخوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے جب یہ حکم پڑھا تو ان پر سناٹا طاری ہو گیا۔ اگر عمر فاروقؓ ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو تھوڑی سی بھی اجازت دے دیتے کہ وہ یہ تحقیقات اپنے طور پر کریں تو ابو عبیدہ بن الجراحؓ خالد بن ولیدؓ کے ساتھ یہ طریقہ اختیار نہ کرتے لیکن وہ جانتے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ ڈسپلن اور عدل و انصاف کے معاملے میں کس قدر سخت ہیں۔ اس وقت ابو عبیدہ بن الجراح حمص میں اور خالد بن الولیدؓ قنسرین میں تھے۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے قاصد بھیجا کہ وہ قنسرین سے خالد بن الولیدؓ کو بلا لائے۔ قاصد نے جب خالد بن الولیدؓ کو پیغام دیا تو وہ اچھل کر اٹھے۔ "خدا کی قسم!" خالد نے نعرہ لگانے کے انداز میں کہا۔ "مجھے ایک اور جنگ لڑنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ " خالد بن ولید اس خوشی کو دل میں بسائے حمص پہنچے کہ رومیوں یا بازنطینیوں کے خلاف کوئی بڑی جنگ لڑی جانے والی ہے۔ لیکن وہ جب ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے سامنے گئے تو ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے چہرے پر اداسی کے آثار دیکھے۔ "امین الامت!" خالد بن ولیدؓ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ غلط ہے جو میں سمجھ کر آیا ہوں۔ " "ابو سلیمان! (خالد بن ولیدؓ کی کنیت) " ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے غم سے بوجھل آواز میں خالد بن الولیدؓ سے کہا۔ "امیر المومنین نے تجھ پر الزام عائد کیا ہے کہ تو نے دس ہزار درہم اشعث بن قیس کو دیئے ہیں۔ وہ اگر مالِ غنیمت سے دیئے ہیں تو یہ خیانت کا جرم ہے اور اگر اپنی جیب سے دیئے ہیں تو یہ فضول خرچی ہے جو اسلام کی نگاہ میں ناجائز ہے۔ بلالؓ یہی جواب لینے آیا ہے۔ " خالد بن الولیدؓ کا ردِ عمل یہ تھا کہ ان پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے ایک بار پھر پوچھا لیکن خالد بن الولیدؓ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ دراصل ابو عبیدہ بن الجراحؓ چاہتے تھے کہ خالدؓ کچھ نہ کچھ ضرور کہیں تاکہ وہ طریقہ اختیار نہ کرنا پڑے جو امیر المومنین نے اختیار کرنے کو لکھا تھا۔ خالد بن الولیدؓ پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے بلالؓ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ آخر ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے حضرت بلالؓ کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بلال عربوں کے رواج کے مطابق خالدؓ سے بیان لیں۔ بلالؓ پورا حکم لے کر آئے تھے۔ انہیں کارروائی مکمل کر کے جانا تھا۔ خالد نے تھوڑی سی مہلت مانگی جو انہیں دے دی گئی۔ یہ

مہلت تو انہیں ملنی ہی تھی کیونکہ دستور کے مطابق تمام فوج کو اکٹھا کرنا تھا۔ جس کے سامنے خالد بن ولید سے اعتراف جرم کرانا تھا۔

○

خالد بن الولید کی ایک بہن فاطمہؓ حمص میں رہتی تھیں۔ خالد اس کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ عمر فاروقؓ نے ان پر کیا الزام عائد کیا ہے بہن سے مشورہ لینے کی ضرورت یہ پیش آئی تھی کہ عمر فاروقؓ خالد بن ولیدؓ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ فاطمہؓ نے بڑے دکھ سے عمرؓ کے خلاف ایک بات کہہ دی۔ خالد بن الولیدؓ پہلے ہی مغموم تھے۔ انہیں بھی اپنی بہن کا مشورہ اچھا لگا اور وہ واپس آکر ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے پاس چلے گئے۔ "امین الامّت!" خالد نے کہا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔" اس کے بعد فلک نے وہ منظر دیکھا اسے دیکھ کر کوئی بھی فرد یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سلوک اس عظیم شخصیت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جو عظمتِ اسلام کا ستون ہے اور جس کے بغیر اسلام اس جگہ تک نہ پہنچتا جہاں تک پہنچ گیا تھا۔ خالدؓ کے ہاتھ ان کی پیٹھ کے پیچھے ان کی دستار (پگڑی) سے بندھے ہوئے تھے اور بلالؓ ان کے سامنے کھڑے اعتراف جرم کرا رہے تھے۔ "اے ابن ولیدؓ!" بلالؓ پوچھ رہے تھے۔ "تو نے اشعث بن قیس کو دس ہزار درہم اپنی جیب سے دیئے ہیں یا مالِ غنیمت سے؟" خالد بن ولید کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ خاموش رہے

بلالؓ نے ایک بار پھر پوچھا خالد بن ولیدؓ پھر بھی خاموش رہے "ابنِ ولیدؓ!" بلالؓ نے کہا "میں امیر المومنین کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جواب دے تو نے دس ہزار درہم اشعث بن قیس کو اپنی جیب سے دیئے تھے یا مال غنیمت سے؟" "اپنی جیب سے" خالد بن ولیدؓ نے آخر جواب دیا۔ بلالؓ نے ان کے ہاتھ کھول دیئے اور اپنے ہاتھوں سے پگڑی ان کے سر پر رکھی۔ "ہم سب پر امیر المومنین کے حکم کی تعمیل فرض ہے۔" بلالؓ نے کہا۔ "ہم ہر سالار کی عزّت کرتے ہیں۔" وہاں جتنی فوج تھی اس پر خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی میں اضطراب چھپا ہوا تھا۔ ہر کسی کے چہرے پر گلہ اور شکوہ تھا۔ کم از کم خالد بن ولیدؓ کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن نظم و ضبط کا تقاضا تھا کہ ایک جائز کارروائی کے خلاف کوئی نہیں بول سکتا تھا۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور بلالؓ کی بھی کیفیت یہ تھی کہ وہ آنکھیں اوپر کر کے نہیں دیکھتے تھے ان کے نظریں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ خالد بن الولیدؓ اس خیال سے گھوڑے پر سوار ہوئے اور وہاں سے نکل آئے کہ معاملہ یہیں پر ختم ہو گیا ہے۔ سات آٹھ دن گزر گئے خالد بن الولیدؓ کو کوئی حکم نہ ملا۔ وہ حمص گئے اور ابو عبیدہ بن الجراحؓ سے ملے۔ "ابو سلیمان!" ابو عبیدہ بن الجراح نے امیر المومنین کا حکم نامہ خالد بن الولید کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ پڑھ لو۔" یہ وہ حکم نامہ تھا جو امیر المومنین نے ابو عبیدہؓ کی طرف بھیجا تھا کہ

خالدؓ جو بھی اعتراف کریں انہیں معزول کر دیا جائے۔ "تجھ پر اللہ کی رحمت ہو امین الامّت!" خالدؓ نے ابو عبیدہؓ سے کہا۔ "امیر المومنین کا یہ حکم نامہ مجھے اسی روز کیوں نہ سنا دیا؟" "خدا کی قسم ابو سلیمان!" ابو عبیدہؓ نے کہا۔ "مجھے اندازہ تھا کہ اس دکھ کا جو تجھے ہوتا تھا۔ میں اپنی زبان سے تجھے دکھ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ دکھ میرے لئے بھی کم نہیں کہ تجھے معزول کر دیا گیا ہے۔" خالدؓ خاموشی سے اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور حمص سے نکل آئے تاریخ میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس وقت خالدؓ کیا سوچ رہے تھے۔ ان کی جذباتی دنیا میں کیا کیا زلزلے آ رہے تھے۔ انہوں نے یہ انعام اپنی جیب سے دیا تھا اسے وہ جرم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ انہیں جو سزا دی گئی وہ بہت سنگین ہے وہ حمص اور قنسرین میں موجود اپنے دوست احباب اور عزیز و اقارب سے ملے اور انہیں بتایا کہ وہ اب ہمیشہ کے لئے ان کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ خالد بن ولیدؓ ان سب کو مغموم چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

.... ○ ....

کئی دنوں کی مسافت کے بعد خالد بن ولیدؓ مدینہ میں داخل ہوئے لیکن ایک فاتح سالار کی حیثیت سے نہیں کہ لوگ گھروں سے باہر آ کر ان کا استقبال کرتے۔ ان کی حیثیت ایک سزا یافتہ مجرم کی سی تھی۔ اتفاق سے عمرؓ انہیں ایک گلی میں آتے مل گئے۔ "ابو سلیمان!" عمرؓ نے خالدؓ کے جنگی کارناموں کو ان الفاظ سے سراہا۔ "تو نے وہ کام کیا ہے جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ہر کام اللہ کرتا ہے۔"

"اور تو نے جو کام کیا ہے وہ کسی مسلمان کو پسند نہیں آیا۔" خالدؓ نے کہا۔ "اے ابن خطاب تو نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے۔"

"کہاں سے آئی ہے یہ دولت کہ تو اسے ناجائز خرچ کرتا پھر رہا ہے؟" عمر فاروقؓ نے کہا۔ "ابو سلیمان! کیا تو رومیوں اور فارسیوں جیسا بادشاہ بننا چاہتا ہے؟ خدا کی قسم، تو میرے لئے قابل احترام ہے، تو مجھے عزیز ہے۔ اب تجھے مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ خدا کی قسم! میں کسی سالار، کسی امیر اور کسی حاکم کو بادشاہوں جیسا نہیں بننے دوں گا۔ کہ جس نے جھوٹی خوشامد کی اس کی جھولی دولت سے بھر دی۔" تاریخ طبری، ابن ہشام، علامہ واقدی اور ابو سف نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دل میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے لئے ذرا سی بھی دشمنی نہ تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ تو خود ابن ولید کے جنگی کارناموں اور ان کی فہم و فراست سے متاثر تھے۔ جب خالد بن ولیدؓ نے شام کے ایک شہر قنسرین کو فتح کیا تھا تو حضرت عمر فاروقؓ نے کہا تھا۔ "اللہ نے خالدؓ کو سپاہ گری اور سالاری پیدائش کے ساتھ ہی عطا فرمائی تھی۔ ابو بکرؓ پر اللہ کی رحمت ہو۔ وہ مجھ سے بہتر مردم شناس تھے۔" لیکن دوسری طرف ان کے عدل کا یہ عالم تھا کہ وہ اسلام کے منافی ذرا سی بات کو بھی پسند نہیں

بہترین جہاد

ایک دفعہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں۔ جواب دیا۔ ہاں ان کا سایہ میرے سر پر ہے۔ فرمایا۔ تو جاؤ ان کی خدمت کرو تمہارے لئے یہی بہترین جہاد ہے۔

مرسلہ: کاشف جمیل، اظہر، تربت

کرتے تھے۔ چونکہ خالدؓ نے فضول خرچی کی تھی جو اسلام کے سراسر منافی ہے اس لئے حضرت عمر فاروقؓ کو یہ سزا دینا پڑی۔ غور کیجئے۔ عمرؓ نے کہا تھا کہ تم بادشاہ بننا چاہتے ہو بادشاہوں کے انداز یہی ہوتے ہیں کہ جس نے تعریف میں دو کلمے کہہ دیئے تو اسے انعام سے مالا مال کر دیا۔

اس کے علاوہ خالد بن ولیدؓ کو سزا دینے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت عمر فاروقؓ چاہتے تھے کہ عدل و انصاف میں چھوٹے بڑے کا فرق نہ رہے۔ عمر فاروقؓ دور اندیش تھے انہوں نے سوچا تھا کہ خالدؓ کو معاف کر دیا تو یہ دستور بن جائے گا کہ سالار، امیر، حاکم اور حیثیت والے لوگوں کو سزا مل ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح عدل و انصاف ختم ہو جائے گا اور اسلامی معاشرہ چھوٹے اور بڑے میں بٹ جائے گا۔ عمر فاروقؓ احکام منوانے میں اس قدر سخت تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو ایک جرم میں ایک سو کوڑوں کی سزا دی تھی۔ ابھی اسی کوڑے مارے گئے تھے کہ ان کا بیٹا مر گیا۔ عمر فاروق کو اطلاع دی گئی انہوں نے حکم دیا کہ ایک سو کوڑے پورے کرو۔ باقی بیس کوڑے اس کی لاش پر مارو۔ یہ تھے حضرت عمر فاروقؓ جنہوں نے انصاف کے معاملے میں اپنی سگی اولاد کو بھی نہ بخشا تھا۔ دوسری طرف حضرت خالد بن ولیدؓ کی عظمت ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے حکم کو بطورِ سزا قبول کر لیا اور علیحدہ سے اپنی سیاسی پارٹی نہ بنائی حالانکہ وہ اگر بغاوت کرتے تو تمام فوج ان کا ساتھ دیتی۔ لیکن ان مجاہدینِ اسلام کو اپنے اقتدار کی بجائے پیغمبرِ اسلام کے دین کی عظمت پیاری تھی۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ حضرت بلالؓ جو قبولِ اسلام سے قبل غلام تھے۔ لیکن جب اسلام قبول کیا تو غلام اور آقا کا امتیاز نہ رہا اور اسی بلالؓ نے حضرت خالد بن الولیدؓ سے اعترافِ جرم کرایا۔

ان تمام باتوں سے ہمیں بہت سے اہم نتائج ملتے ہیں جن پر عمل کر کے ہم آج بھی اسی طرح اسلام کو دنیا میں پھیلا سکتے ہیں جس طرح مجاہدینِ اسلام نے پھیلا دیا تھا۔ مدینہ آنے کے بعد خالد بن الولیدؓ چند دن وہاں رہے اور پھر قنسرین چلے گئے۔ وہ ہمیشہ کے لئے مدینہ چھوڑ گئے تھے وہاں سے وہ حمص گئے اور مرتے دم تک وہیں رہے۔ اس واقعہ کے چار سال بعد ۵۸ سال کی عمر میں حمص میں ہی انتقال کر گئے۔ اللہ کی تلوار ہمیشہ کے لئے نیام میں چلی گئی تھی ان کا مزار آج بھی حمص میں ہے!!۔

NAZ
DELICIOUS PAN MASALA
جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا.... بتادو نا
ناز
پان مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS
P.O. BOX 3546, KARACHI-5 (PAKISTAN)
CABLE: "TWO-IN-ONE"

REPCOM

اداس لڑکا

اخلاق احمد

سیٹھ کرامت نے اس قدر مزاحیہ شہر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جب سے وہ جام نگر کے اسٹیشن پر ٹرین سے اترا تھا اسے ہر قدم پر یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں ہر شخص مذاق کرنے کے موڈ میں ہے۔

پہلے قلی نے اس کا سامان اٹھانے سے پہلے اس سے ہاتھ ملایا سامان سر پر اٹھا کر جام نگر آنے پر خوش آمدید کہا اور قہقہہ مار کر ہنسا۔

پھر تانگے والے نے اسے گلے سے لگایا اور کہا۔ "سیٹھ صاحب کدھر جانا ہے؟ یہاں ہوٹل میں ٹھہرنا ہے یا کسی کے گھر ؟" یہ کہہ کر وہ بلا وجہ ہنسا۔

سیٹھ کرامت نے کہا۔ "کسی اچھے سے ہوٹل لے چلو۔" اور تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر سنجیدگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

تانگہ روانہ ہو گیا۔ سیٹھ کرامت خاموشی سے

سفر طے کرنا چاہتا تھا۔ مگر تانگے والا بے حد باتونی آدمی تھا۔

"آپ پہلی بار آئے ہو سیٹھ صاحب ادھر؟"

"ہاں۔" سیٹھ کرامت نے کہا۔

"سیدھا ہو جاورنہ ایک جھانپڑ رسید کروں گا۔"

سیٹھ کرامت اچھل پڑا۔ "کیا کہا؟"

تانگے والا ہنسا۔ "میں گھوڑے سے بات کر رہا تھا جی۔ یہ سالا کبھی کبھی بہت تنگ کرتا ہے۔ ہاں تو آپ سیر کرنے آئے ہو؟"

"ہاں۔"

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔" تانگے والے نے پھر بلا سبب قہقہہ مارا۔ "اصل میں آپ کا سامان اتنا ذرا سا ہے۔ ایک سوٹ کیس ہے اور بس۔ تو میں نے اندازہ لگایا کہ آپ گھومنے پھرنے ہی آئے ہو گے۔ جو مستقل رہنے کے لئے آتا ہے وہ تو ٹرک میں گھر کا سارا سامان اور منجی بستر لے کر آتا ہے۔" وہ اپنی ہی بات پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

سیٹھ کرامت خاموش بیٹھا رہا۔ اسے جام نگر کے ان مزاحیہ لوگوں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے اپنا سوٹ کیس اُٹھایا، تانگے والے کو پیسے دیئے اور شیشے کا دروازہ کھول کر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔

کاؤنٹر پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سیٹھ کرامت کے قدموں کی آواز سن کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سیٹھ کرامت نے اس سے کمرہ حاصل کرنے کی بات کی۔

"کمرے کا کرایہ سو روپے روز ہو گا۔" اس نے تیز تیز بولنا شروع کیا۔ "کمرے کے ساتھ باتھ روم بھی ہے۔ کمروں کی روزانہ صفائی کی جاتی ہے۔ ایک نل سے ٹھنڈا پانی آتا ہے۔ دوسرے سے گرم۔ پیسے ہر روز ایڈوانس دینے ہوں گے۔ دیکھا، کیسا زبردست انتظام ہے۔" وہ ہنسا۔

سیٹھ کرامت نے جواب میں مسکرانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے پرس کھول کر پانچ سو روپے نکالے اور بوڑھے کے سامنے رکھ دیئے۔ "یہ پانچ دن کا کرایہ ہے۔ کمرے کی چابی دے دیجئے۔"

جو کمرہ اسے ملا تھا وہ دوسری منزل پر تھا۔ نہا دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ اس کے سامنے جام نگر تھا۔ خوبصورت، ہرا بھرا اور پرسکون شہر۔ کراچی اور لاہور کے مقابلے میں یہاں کتنا سکون تھا۔ کتنی خوبصورتی تھی۔ سیٹھ کرامت نے سوچا، یہاں ٹریفک کا شور نہیں تھا اور گاڑیوں کا دھواں نہیں تھا اور ایک دوسرے سے ٹکراتے لوگوں کا ہجوم نہیں تھا اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا پاگل پن نہیں تھا۔ یہ ایسا خوبصورت شہر تھا جہاں بہت اچھی، بہت پرسکون زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے مسکرایا۔ بس ایک خرابی تھی اس شہر

میں۔ یہاں ہر شخص ہر وقت ہنسنے پر تیار رہتا تھا۔

دو دن بعد وہ ایک ایسے شخص کے سامنے بیٹھ تھا جو جام نگر میں مکانوں کی خرید و فروخت میں مدد دیتا تھا۔

سیٹھ کرامت نے کہا۔ "میں یہاں جام نگر میں کوئی مکان خریدنا چاہتا ہوں۔ یہ شہر مجھے بہت پسند آیا ہے۔ ایک دو دن میں میں نے یہاں کئی اچھے مکانات دیکھے ہیں۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ یہاں کون کون سے مکان فروخت کے لئے ہیں۔"

مکانوں کی خرید و فروخت میں مدد دینے والے کا نام عبدل تھا۔ وہ بے حد موٹو آدمی تھا۔ اسے دیکھ کر کسی بہت بڑے پھولے ہوئے غبارے کا خیال آتا تھا۔ اس کا منہ گول تھا، توند گول تھی، ناک گول تھی، اور حد یہ کہ اس نے چشمہ بھی گول لگا رکھا تھا۔

سیٹھ کرامت کی بات سن کر اس کے گول منہ پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بولا۔ "نہایت عمدہ فیصلہ ہے آپ کا۔ یعنی یہاں رہنے کا فیصلہ۔ اور نہایت اچھا کام کیا آپ نے۔ یعنی یہ کہ آپ میرے پاس چلے آئے۔ مجھے یہاں مکان بیچنے والے چیمپئن کہتے ہیں۔ عبدل چیمپئن۔ یعنی میں تو آپ کو نہایت شاندار مکان دلواؤں گا۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا تو اس کے پورے بدن میں طوفان سا آ گیا۔ اس کی توند ہلنے لگی، نتھنے پھولنے اور پچکنے لگے اور پھولے ہوئے گال سرخ ہو گئے۔ خاصی دیر کے بعد اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور میز کی دراز میں سے ایک رجسٹر نکال لیا۔ اس رجسٹر میں ان مکانات کی فہرست تھی جن کے مالکان انہیں بیچنا چاہتے تھے۔

سیٹھ کرامت کو اس نے چار پانچ مکانات کے بارے میں بتایا۔

"یعنی سب ایک سے ایک مکان ہیں۔" عبدل بولا۔ "یعنی نہایت عمدہ ہیں اور نہایت سستے ہیں۔ دو لاکھ روپے سے زیادہ تو کسی کی قیمت ہی نہیں۔ ہے۔ یعنی اتنے سستے مکان جام نگر میں ہی مل سکتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں وہاں شہروں میں تو اتنے پیسے میں مرغی کے ڈربہ جتنی جگہ ملتی ہے۔"

وہ پھر اپنی ہی بات پر ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا سیٹھ کرامت نے سنجیدگی سے کہا۔ "قیمت کی فکر نہ کیجئے۔ مکان مجھے پسند آ گیا تو میں منہ مانگی قیمت دوں گا۔ مگر یہ جو مکان آپ نے بتائے ہیں یہ تو عام سے مکان ہیں۔ مجھے تو کوئی بڑا مکان چاہئے۔ جیسے پرانے زمانے کی بڑی بڑی حویلیاں ہوا کرتی تھیں۔"

عبدل مسکرایا اور بولا۔ "اب لوگ پرانے زمانے کے بنے ہوئے مکان پسند نہیں کرتے۔ میں نے تو آپ کو بالکل نئے بنے ہوئے مکان بتائے ہیں۔"

سیٹھ کرامت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں...... یاد آیا...... کل میں نے بازار کے پاس

کونے پر بنا ہوا مکان دیکھا تھا۔ وہی جس میں ناریل کے بڑے بڑے پیڑے لگے ہیں۔ پرانا سا مکان ہے...... ایسا کوئی مکان مل جائے تو اچھا ہو...... بلکہ وہی مکان اگر اس کا مالک بیچ رہا ہو تو اسی کی بات کر لو......"

عبدل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"وہ بازار کے پاس بنا ہوا کونے والا مکان۔ مگر وہ تو بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا ہے...... اور پھر ایک اور مسئلہ بھی ہے۔"

"کیا مسئلہ ہے؟"

"اس مکان کا مالک ایک بارہ سال کا لڑکا ہے۔ اس کا نام تو پتہ نہیں کیا ہے مگر سب اسے چھوٹو کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جام نگر کا سب سے اداس لڑکا ہے۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔" سیٹھ کرامت نے کہا۔ "میں نے تو اس شہر میں آج تک کسی کو اداس نہیں دیکھا۔ ہر شخص کارٹون بنا قہقہے لگاتا پھرتا ہے۔"

"چھوڑیئے صاحب...... کسی اور مکان کی بات کیجئے۔ ویسے بھی وہ جو چھوٹو ہے نا وہ اس مکان کو بیچنے کے لئے بہت زیادہ پیسے مانگ رہا ہے...... دراصل بیچارے کے باپ کو ایک سال پہلے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ تب سے چھوٹو نے ہنسنا بولنا چھوڑ دیا ہے۔ بس ہر وقت اپنے گھر میں ہی رہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کا باپ ڈاکو تھا۔ بس ایک دن اسے کوئی قتل کر کے غائب ہو گیا۔ اب چھوٹو کہتا ہے کہ یہ مکان میرے باپ کی نشانی ہے۔ میں اسے اپنی مرضی کی قیمت پر بیچوں گا۔"

"اچھا۔" سیٹھ کرامت مسکرایا۔ "کتنے پیسے مانگتا ہے وہ؟"

عبدل نے سر کھجایا، مسکرایا۔ سنجیدہ ہوا اور بولا۔ "کیا بتاؤں صاحب یعنی نہایت نامعقول لڑکا ہے...... کہتا ہے دس لاکھ روپے میں مکان بیچوں گا۔"

"دس لاکھ!"

"جی، دس لاکھ۔ ایک پیسہ کم نہیں کرتا۔ اب سوچئے نا صاحب، یعنی اتنا فضول سا، اول جلول سا مکان بھلا دس لاکھ میں کون خریدے گا؟"

سیٹھ کرامت کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔

پھر اس نے کہا۔ "یار عبدل اس لڑکے سے...... کیا نام ہے اس کا......؟"

"چھوٹو۔"

"ہاں، چھوٹو سے بات تو کرو، شاید کچھ پیسے کم کر دے...... دراصل مجھے وہ مکان بہت اچھا لگا ہے...... جیسا مکان میں چاہتا ہوں وہ ویسا ہی ہے۔ میں اس پر سکون شہر میں بالکل ایسا ہی مکان چاہتا ہوں۔ تم کوشش کر کے دیکھو اگر پیسے کم ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اگر وہ نہ مانے تو پھر اس سے دس لاکھ روپے میں ہی سودا کرنا پڑے گا...... مگر مجھے بس ایسے ہی مکان کی ضرورت تھی...... تم سمجھ رہے ہو نا بات کو؟ پیسے کی مجھے فکر نہیں ہے۔ بس مکان میری پسند

کا ہونا چاہئے۔"

"یعنی میں تو آپ کی بات سمجھ رہا ہوں صاحب۔" عبدل نے کہا۔ "مگر وہ کمبخت چھوٹو کوئی بات نہیں سمجھتا۔ آپ کہتے ہیں تو میں پیسے کم کرانے کی کوشش کر لیتا ہوں۔

مگر میرا خیال ہے، وہ مانے گا نہیں۔ بہر حال، یعنی کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں آخر عبدل اپنے کام کا چیمپئن ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں آپ کو ایک دو دن میں بتاؤں گا۔"

سیٹھ کرامت عبدل سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

تین دن بعد سیٹھ کرامت، چھوٹو سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔

ان تین دنوں میں عبدل چیمپئن نے چھوٹو سے مل کر مکان کو سستے داموں خریدنے کی سر توڑ کوششیں کی تھیں مگر ناکام رہا تھا۔ عبدل نے سیٹھ کرامت کو بتایا تھا کہ چھوٹو دس لاکھ روپے سے کم میں مکان بیچنے پر تیار نہیں ہے۔

اب سیٹھ کرامت اس مکان کو دس لاکھ روپے میں خریدنے کے لئے چھوٹو کے گھر پہنچ گیا تھا۔

مکان باہر سے ایک کھنڈر لگتا تھا۔ دیواروں پر سے پلستر اکھڑ رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے پودے اور گھاس اور جھاڑیاں ہر طرف اگ رہی تھیں۔ سیٹھ کرامت نے پرانی سی گھنٹی کو دبایا تو اندر دور کہیں گھنٹی کی گونج سنائی دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ چرچرایا اور کھل گیا۔

سامنے وہی کھڑا تھا۔ چھوٹو۔ جسے عبدل نے جام نگر کا سب سے اداس لڑکا کہا تھا۔ واقعی وہ بے حد اداس لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ چہرے پر اداسی تھی۔ حیرت سے سامنے کھڑے سیٹھ کرامت کو دیکھنے کے انداز میں اداسی تھی۔

"میرا نام سیٹھ کرامت ہے۔ عبدل نے تمہیں بتایا ہو گا میں تمہارا یہ مکان خریدنا چاہتا ہوں۔"

"آیئے۔" چھوٹو نے اداسی سے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ چھوٹو کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ مکان بہت پرانا تھا۔ اندر نیم تاریکی تھی اور ہلکی سی نمی تھی۔ وہ جس کمرے میں جا کر بیٹھے وہ بھی نیم تاریک ہی تھا مگر چھوٹو نے باہر کھلنے والی کھڑکیاں کھولیں تو کمرہ دھوپ سے روشن ہو گیا۔

"عبدل نے آپ کو بتایا ہو گا۔" اداس آنکھوں والے چھوٹو نے سامنے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "مکان بیچنے کے لئے میری ایک ہی شرط ہے۔"

"ہاں۔" سیٹھ کرامت نے مسکرا کر کہا۔ "تم دس لاکھ روپے لینا چاہتے ہو۔ اس سے کم میں راضی نہیں ہو گے۔ ہے نا؟"

"ہاں۔" چھوٹو نے کہا۔

"اگر میں تم سے کہوں کہ میں نو لاکھ روپے دینے کو تیار ہوں۔ ابھی اسی وقت پھر؟ چھوٹو نے آہستہ سے کہا۔ "تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ

ابھی اسی وقت تشریف لے جائیں۔" اس کی آواز میں ایسی سختی تھی کہ لمحہ بھر کو سیٹھ کرامت بھی لرز گیا۔ اس لڑکے سے بے مقصد سودے بازی کرنا ٹھیک نہ تھا۔

سیٹھ کرامت نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اگر تم یہی چاہتے ہو..... تمہاری اگر یہی ضد ہے کہ دس لاکھ سے ایک پیسہ کم نہیں کرو گے تو ٹھیک ہے۔ یونہی سہی۔ میں تمہارے اس مکان کے عوض دس لاکھ روپے دینے کو تیار ہوں۔ دراصل مجھے کسی ایسے ہی پر سکون سے شہر میں، ایسے ہی پرانے مگر شاندار مکان کی تلاش تھی..... بہت دنوں سے میں ایسا مکان تلاش کر رہا تھا جسے..........."

"سیٹھ کرامت صاحب۔" چھوٹو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تو پھر یہ سودا طے ہو گیا نا؟ آپ دس لاکھ روپے میں میرا یہ مکان خرید رہے ہیں؟"

"بالکل خرید رہے ہیں۔" سیٹھ کرامت نے کہا۔

یہ سن کر چھوٹو کے اداس چہرے پر خوشی کی لہر آئی۔ یوں جیسے گہرے سیاہ بادلوں کے درمیان سے اچانک چاندنی جھانکنے لگی۔ ذرا سی دیر کو اس کا اداس چہرہ مسرت سے چمک اٹھا۔ اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلانے لگی۔

"میں آپ کے لئے شربت بنا کر لاتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "پھر میں آپ کو اس مکان کے بارے میں دوسری باتیں بھی بتاؤں گا۔"

چند منٹ بعد وہ کمرے میں دوبارہ داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی ٹرے پر شربت سے بھرا جگ اور دو گلاس رکھے تھے۔

سیٹھ کرامت کو شربت کا گلاس بھر کر پکڑانے کے بعد اس نے کہا۔ "سیٹھ صاحب۔ آپ اگر برا نہ مانیں تو میں آپ کو اپنے بارے میں اور اس مکان کے بارے میں کچھ باتیں بتا دوں۔"

سیٹھ کرامت نے ایک ہی سانس میں شربت کا گلاس خالی کر کے رکھ دیا اور بولا۔ "کہو بیٹا! اطمینان سے پوری بات بتاؤ۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

چھوٹو نے اس کے گلاس میں دوبارہ شربت بھر دیا اور گلاس اسے تھما کر بولا۔ "یہ مکان بہت پرانا ہے۔ شاید سو سال پرانا۔ یہاں میں اپنے امی ابو کے ساتھ رہتا تھا۔ مگر پھر میری امی کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میں اور ابو تنہا رہ گئے میرے ابو کو اس شہر کے لوگ اچھے نام سے یاد نہیں کرتے۔ انہیں ڈاکو سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکو کہا جاتا ہے۔ ٹھیک ہی کہا جاتا ہے وہ تھے بھی ڈاکو۔ سال میں ایک یا دو ڈاکے ڈالتے تھے اور پھر کئی مہینے تک آرام سے زندگی گزارتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو ہر روز زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ آپ سن رہے ہیں ناں میری بات؟"

"ہاں ہاں، بہت غور سے سن رہا ہوں۔" سیٹھ کرامت نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بہر حال، دن گزر رہے تھے۔ سال بھر پہلے ایک دن ابو بے حد پریشان سے آئے۔ ان کے پاس صرف ایک بڑا بریف کیس تھا۔ انہوں نے آتے ہی مجھ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے، آدھ گھنٹے کے لئے گھر سے باہر چلا جاؤں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کہیں ڈاکہ مار کر آئے تھے اور شاید رقم گھر میں کسی جگہ چھپانا چاہتے تھے۔ میں گھر سے باہر چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں واپس آیا تو وہ ذرا مطمئن نظر آرہے تھے۔ مگر اسی رات جب میں سو رہا تھا تو کسی کے زور زور سے بولنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ آوازیں دوسرے کمرے سے آ رہی تھیں۔ میرے ابو بھی چلّا چلّا کر بول رہے تھے اور کوئی دوسرا آدمی بھی چیخ رہا تھا۔ میں نے غور سے سنا تو پوری بات سمجھ گیا۔ ابو نے کسی کے ساتھ مل کر ڈاکہ مارا تھا۔ ان کا اور ان کے ساتھی کا خیال تھا کہ وہ جس گھر کو لوٹنے جا رہے ہیں وہاں سے انہیں چار پانچ لاکھ روپے ملیں گے۔ مگر ان کی قسمت اچھی تھی۔ انہیں پورے پچاس لاکھ روپے مل گئے۔ اتنے پیسے انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ میرے ابو کی شاید نیت خراب ہو گئی۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ اگر یہ پچاس لاکھ روپے ان کو مل جائیں تو انہیں زندگی بھر کوئی برا کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ان کا بیٹا آسانی سے پل بڑھ کر جوان ہو چکے گا۔ تعلیم حاصل کر سکے گا۔ کاروبار کر سکے گا۔ بڑا آدمی بن سکے گا۔ وہ پورے پچاس لاکھ لے کر فرار ہو گئے۔ اب ان کا دوسرا ساتھی آ پہنچا تھا اور اپنا حصہ مانگ رہا تھا۔ ابو چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ راستے میں پولیس کو دیکھ کر وہ بریف کیس چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ اور وہ دوسرا آدمی گرج رہا تھا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم نے پیسے اپنے اس گھر میں ہی کہیں چھپا دیئے ہیں۔ مجھے ان دونوں کے چیخ چیخ کر لڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر اچانک کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ جیسے کوئی میز وغیرہ گر گئی ہو۔ پھر ایک دھماکہ ہوا۔ کسی نے گولی چلائی تھی۔ میں بھاگتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچا تو وہ اجنبی آدمی میرے ابو کو گولی مار کر دروازہ کھول کر فرار ہو چکا تھا۔"

سیٹھ کرامت نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ تو بڑی زیادتی ہوئی تمہارے ساتھ۔"

"جی ہاں۔" چھوٹو نے کہا۔ "میں تنہا رہ گیا۔ اس ظالم آدمی نے میرے ابو کو مار دیا۔ مگر وہ پچاس لاکھ روپے اسے پھر بھی نہیں مل سکے۔ پولیس نے انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ جس کمرے سے وہ فرار ہوا تھا اس کے دروازہ پر اور کمرے کی کچھ چیزیں پر اس کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ پولیس سارے ملک کے کروڑوں لوگوں کے انگلیوں کے نشان تو چیک نہیں کر سکتی۔ بہر حال میں نے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔" وہ مسکرایا۔

سیٹھ کرامت نے حیرت سے اسے دیکھا۔

چھوٹو نے کہا۔ "میں نے اس مکان کی قیمت دس لاکھ روپے رکھ دی۔ اس چھوٹے سے شہر

میں اس ٹوٹے پھوٹے مکان کی قیمت دو لاکھ یا زیادہ سے زیادہ تین لاکھ ہو سکتی تھی۔ مگر میں نے کہا کہ میں تو اسے دس لاکھ سے کم میں نہیں بیچوں گا۔ میں جانتا تھا کہ اس مکان میں کہیں نہ کہیں کسی دیوار کے پیچھے کسی فرش کے نیچے پچاس لاکھ روپے دفن ہیں۔ اور میرے ابو کا قاتل بھی جانتا ہے کہ اس مکان میں کسی جگہ پچاس لاکھ روپے چھپے ہوئے ہیں۔ اس مکان کو خریدنے کے عوض دس لاکھ روپے وہی چالاک قاتل دے سکتا تھا جو جانتا ہو کہ اسے مکان میں کسی نہ کسی جگہ سے پچاس لاکھ روپے مل جائیں گے۔ کیوں سیٹھ کرامت میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

سیٹھ کرامت کو اپنا پورا جسم بے جان ہوتا محسوس ہوا۔

چھوٹو اٹھا اور اس نے احتیاط سے سیٹھ کرامت کے ہاتھوں سے شربت کا گلاس لے لیا۔

"اس شربت میں آدمی کو بے ہوش کرنے کی دوا شامل تھی سیٹھ کرامت۔" اس نے کہا۔ "جو آدمی میرے ابو کو قتل کر کے فرار ہوا تھا اس کی انگلیوں کے نشانات تو پولیس کے پاس موجود ہیں۔ مگر اب تمہاری انگلیوں کے نشانات اس گلاس پر بھی موجود ہیں جو تھوڑی دیر کے بعد علاقے کے انسپکٹر کو پہنچا دیا جائے گا۔ پولیس آئے گی اور تمہیں تھانے لے جائے گی۔ کچھ دیر جوتے کھانے کے بعد تم خود ہی اگل دو گے کہ تم نے میرے ابو کو قتل کیا تھا۔"

اقوال زریں

○ دوست کو ادھار دو یہ سوچ کر کہ کبھی واپس نہیں لینا اور لو یہ سوچ کر کہ وعدے سے پہلے لوٹا دینا ہے۔

○ کتنے عظیم ہیں وہ آنسو جو کسی کی بے بسی پر بہتے ہوں۔

مرسلہ: ش۔ م۔ شہزاد، کراچی

سیٹھ کرامت کی آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔ اسے زمین گھومتی ہوئی لگ رہی تھی۔

"سیٹھ کرامت۔" اسے دور کہیں سے چھوٹو کی آواز آئی۔ "تم قاتل تو واقعی اچھے ہو مگر مجرم نہایت بے وقوف قسم کے ہو۔ دو چار سال اگر اور صبر کر لیتے تو شاید میں خود ہی یہ مکان بیچ کر کہیں اور چلا جاتا۔ مگر تمہیں بہت جلدی تھی۔ اور تم نے وہ مثل تو سنی ہوگی۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ سنی ہے نا؟" اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور پھر قہقہے لگاتا گیا۔

سیٹھ کرامت کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اسے صرف ایک خیال آیا۔ جام نگر میں صرف ایک اداس لڑکا تھا۔ مگر اب وہ بھی قہقہے لگا رہا ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو کر صوفے سے لڑھک کر نیچے گر چکا تھا۔

فضلو بابا نے جو مثل بولی وہ یہ تھی:
سپّاں دے پُتّر نہ بَندے مِتّر
بھاویں چُلیاں دودھ پلایئے

ایک دن بکرا منڈی میں

افشاں بشیر

جیب تھی کچھ گرم اور تھی شام ٹھنڈی ایک دن
بکرا لینے ہم بھی پہنچے بکرا منڈی ایک دن
بیوی اور بچوں کی فرمائش تھی بکرا لائیے
کچھ کچھ اپنی بھی یہی خواہش تھی بکرا لائیے
اِس طرح کچھ پُر فضا تھی بکرا منڈی کی بہار
ایک طرف گائے کی ایک جانب تھی بکروں کی قطار
بکرا منڈی میں ہر ایک جانب کھڑے تھے جانور
کچھ ٹرک ایسے بھی تھے جن میں لدے تھے جانور
سندھی بکرے، سرحدی بکرے بہت تھے جاندار
قیمتی تھے یہ کہ ان کی قیمتیں تھیں شاندار
ایک بکرا تخت پہ بیٹھا تھا ایسی شان سے
اِس کی خاطر ہورہی تھی دودھ لسّی، پان سے
آسماں کو چھو رہے تھے گائے اور بکروں کے دام
میں نے بھی جاکر کیا ایک بکرے والے کو سلام
اور پوچھا دام کیا بکرے کے ہیں فرمائیے
بولا بسم اللہ جی بس مفت میں لئے جائیے
ہاں مگر جو سال بھر میں نے کھلایا ہے اسے
بیس ہزار اِس پر ہوئے ہیں خرچ وہ دے دیجئے
سُن کے قیمت عالمِ حیرت میں ہم کچھ پڑ گئے
گھور کے بکرے نے یوں دیکھا کہ ہم کچھ ڈر گئے
منہ سے یوں گویا ہوا، بکرا ہوں میں ملتان کا
میں نے پایا ہے لقب بھی شیرِ پاکستان کا
میرے مالک نے مجھے پالا ہے ناز و نعم سے
رات دن یونہی پڑا رہتا ہوں میں آرام سے
ناشتہ میں دودھ دلیہ شوق سے کھاتا ہوں میں
بعد اس کے دو کلو بھی دودھ پی جاتا ہوں میں

لنچ میں تازہ ڈبل روٹی و تازہ سبزیاں
یعنی گاجر توری ٹنڈے پھول گوبھی بھنڈیاں
رات کو ہوتا ہے یوں میرے ڈنر کا اہتمام
حلوہ پوری ، کینو، آڑو، کیلے، امرود اور آم
شوقیہ بادام پستے بھی چبا لیتا ہوں میں
نام پہ چارے کے میٹھا پان کھالیتا ہوں میں
آپ میں ہمت ہے اس خرچ کی تو فرمایئے
دام دے کے میرے مالک کو مجھے لے جایئے
میں نے اپنی جیب کو حسرت سے دیکھا اور کہا
بس میاں بکرے تمہاری پیشکش کا شکریہ
راہ حق میں ہے یہ واجب جانور قربان ہو
مجھ کو بکرا چاہیے، تم شیرِ پاکستان ہو
بولا مالک دوسرا بکرا منگالیتا ہوں میں
دانت سینگ اور کان بھی اس کے دکھا دیتا ہوں
یہ کہا اور ایک لاغر سا دکھایا جانور
گوشت تھا بالکل برائے نام جس کے جسم پر
ہڈیاں ابھری ہوئیں اور پیٹ تھا پچکا ہوا
سانس بھی کچھ دیر کو سینے میں تھا اٹکا ہوا
پُستہ قد کالا بھجنگا چھوٹا سا بکرا تھا وہ
ایک طرف ایسے پڑا تھا جیسے کہ کچرا تھا وہ
چار ہزار اس نے بتائے اور اسے سستا کہا
مجھ کو تو وہ چار سو میں بھی بہت مہنگا لگا
خیر صاحب جیب اپنی دیکھ کر شرمائے ہم
دے کے قیمت بس وہی بکرا اٹھالے آئے ہم
خیر قربانی اسی بکرے کی ہوئی دھوم سے
یوں لگا قربان اس بکرے پہ ہم خود ہوگئے

آنکھ مچولی البم

بوتل کی ڈائن

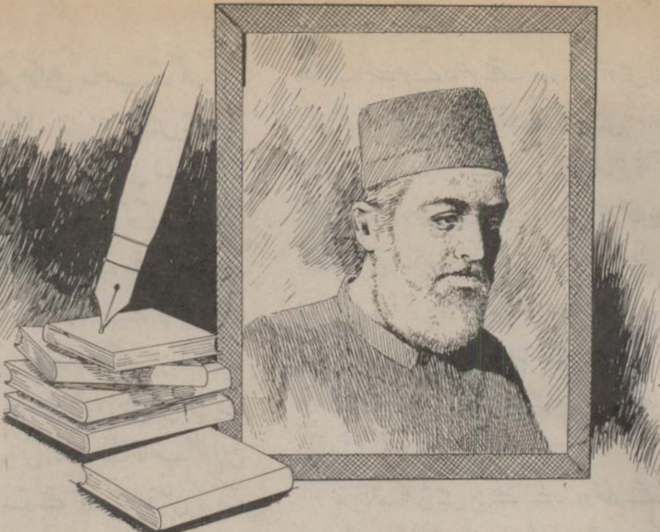

ڈپٹی نذیر احمد

ڈاکٹر اسلم فرخی

اب سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے کی بات ہے۔ مولوی سعادت علی ایک بزرگ تھے۔ اتر پردیش بھارت کا ایک صوبہ ہے اس کے ایک ضلع بجنور کے ایک چھوٹے سے قصبے ریہٹر میں رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے دو بیٹے تھے۔ علی احمد اور نذیر احمد۔ دونوں ذرا بڑے ہوئے تو مولوی سعادت علی نے خود انہیں پڑھایا۔ پھر ایک بڑے قابل آدمی تھے مولوی نصر اللہ۔ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے سپرد کر دیا۔ وہ پڑھاتے رہے۔ ان کا تبادلہ ہو گیا۔ اب کون پڑھائے۔ مولوی سعادت علی دونوں بچوں کو اپنے ایک پرانے اور مشہور استاد مولوی عبدالخالق کے پاس دلی لے گئے۔ مولوی عبدالرزاق بہت بڑے عالم تھے۔ بزرگ تھے شہزادوں اور شہزادیوں کے استاد تھے۔ دلی کی ایک پرانی اور شاندار مسجد میں طالب علموں کو پڑھاتے تھے۔ بہت بڑی مسجد تھی۔ سو سوا سو طالب علم رہتے تھے۔ نذیر احمد اور علی احمد بھی انہیں میں شامل ہو گئے۔

نذیر احمد کا رہنا سہنا۔ پڑھنا لکھنا سب کچھ مسجد میں تھا، صبح ہوئی۔ پڑھنے بیٹھ گئے۔ دوپہر تک

پڑھائی لکھائی۔ پھر مولوی صاحب کے گھر چلے گئے۔ گھر کا کام کیا۔ نذیر احمد عمر میں چھوٹے تھے۔ لڑکے تھے اس وجہ سے مولوی صاحب کے بیٹے مولوی عبدالقادر کے بچوں کو گود میں لئے پھرتے تھے۔ کھلاتے اور ٹہلاتے تھے شام ہوئی تو محلے میں گھر گھر پھرے۔ جہاں سے جو کھانا ملا۔ کھالیا۔ گرمی ہوئی تو مسجد کے صحن میں لوٹ مار دی۔ جاڑا ہوا تو صفوں میں گڑی مڑی بن کر لپٹ گئے اور سو رہے۔ اس زمانے کے طالب علم اس طرح زندگی گزارتے تھے اور علم حاصل کرتے تھے۔

ایک دن نذیر احمد کی چھٹی تھی۔ گھومنے پھرنے نکل کھڑے ہوئے گھومتے پھرتے دلّی کالج پہنچ گئے۔ وہاں اس وقت بڑا جلسہ ہو رہا تھا طالب علموں میں انعام تقسیم ہو رہے تھے۔ نذیر احمد بھی وہاں کھڑے ہو گئے۔ بھیڑ بہت تھی۔ دھکا جو لگا تو گر پڑے۔ چوٹ آئی۔ رونے لگے۔ اتفاق سے کالج کا انگریز پرنسپل ادھر سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا کھڑا رو رہا ہے۔ سمجھا کالج کا کوئی طالب علم ہے۔ پاس بلایا چمکارا سر پر ہاتھ پھیرا۔ پوچھا کس جماعت میں ہو نذیر احمد نے کہا۔ میں کالج کا طالب علم نہیں ہوں۔ پرنسپل نے پوچھا اچھا کیا پڑھتے ہو۔ نذیر احمد نے عربی کی ایک کتاب کا نام لیا جو اعلیٰ جماعتوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ پرنسپل کو بڑا تعجب ہوا ایسا چھوٹا لڑکا اور ایسی کتاب! نذیر احمد کا ہاتھ پکڑ کر مفتی صدرالدین کے پاس لے گیا مفتی صاحب بہت بڑے عالم تھے۔ سارے شہر میں ان کے علم کا شہرہ تھا۔ اس وقت وہ کالج میں موجود تھے۔ پرنسپل نے ان سے کہا۔ یہ چھوٹا سا لڑکا اتنی مشکل کتاب پڑھ رہا ہے آپ ذرا اس کا امتحان تو لیجئے۔ مفتی صاحب نے کتاب نکلوا کر پڑھائی۔ نذیر احمد نے فرفر پڑھ دی۔ مفتی صاحب حیران رہ گئے۔ پرنسپل بھی نذیر احمد کی ذہانت سے بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ تم کالج میں پڑھو چار روپے مہینہ وظیفہ ملے گا۔ نام لکھوا لو۔

نذیر احمد کالج میں پڑھنے لگے۔ ہونہار تھے۔ ذہین تھے بلا کے محنتی تھے۔ کالج کے اچھے اور لائق طالب علموں میں ان کا شمار ہونے لگا کالج میں پڑھنے سے نذیر احمد کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ انہیں نئے نئے خیالات اور سائنس کی ترقی سے بھی واقفیت ہو گئی۔ دہلی کالج نئے خیالات کا مرکز تھا اس وقت ملک میں بہت بڑی تبدیلی آ رہی تھی۔ مغربی خیالات اور مغرب کے علم تیزی سے پھیل رہے تھے۔ انہیں خیالات اور علوم کی وجہ سے انگریز سارے ملک کے حاکم بن گئے تھے۔ نذیر احمد نے کالج میں انگریزی تو نہیں پڑھی مگر وہ انگریزی کے اثر اور زندگی کے نئے انداز کو سمجھ گئے۔

کالج سے فارغ ہوئے تو نذیر احمد کو پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر **کنجاہ** میں پڑھانے کے لئے نوکری مل گئی۔ کچھ دن کام کیا مگر دل نہیں لگا اس لئے واپس دلّی چلے گئے۔ اب کے کانپور میں نوکری ملی۔ اسکول کا معائنہ کرنے والے ڈپٹی ہو

گئے۔ سارے ضلع کے اسکولوں کا معائنہ کرنے لگے۔ دورے کرتے پھرتے، تھے یہاں بھی نذیر احمد کا دل نہیں لگا۔ نوکری چھوڑ دی - ہوا یہ کہ ان کے انگریز افسر نے کوئی سخت بات کہہ دی۔ نذیر احمد بڑے خود دار اور غیرت مند آدمی تھے۔ انہوں نے سخت بات کا سخت جواب دیا اور نوکری بھی چھوڑ دی۔

اب، پھر وہی دلی، نذیر احمد کو دلی آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی۔ جنگ ہوتی رہی۔ نذیر احمد گھر میں چپکے بیٹھے رہے۔ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ جنگ میں انگریز کا پلا بھاری ہا۔ سارے ملک پر ان کی حکومت ہو گئی۔ کچھ امن چین ہوا تو نذیر احمد نے پھر ملازمت کی تلاش کی۔اس دفعہ ملازمت الہ آباد میں ملی۔ وہی اسکولوں کے معائنہ کی نوکری۔ نذیر احمد ایک بار پھر اسکولوں کے معائنہ میں مصروف ہو گئے۔

اس زمانے میں انگریزی قانون کا اردو ترجمہ ہو رہا تھا تاکہ ملک کے وہ تمام لوگ جو انگریزی نہیں جانتے تھے قانون کو اردو میں پڑھ کر سمجھ لیں۔ بہت سے لائق آدمی مل جل کر یہ کام کر رہے تھے۔ انگریز حاکم نگرانی کرتے تھے اور ترجمے کا کام ہوتا رہتا تھا۔ نذیر احمد ان دنوں اپنے شوق سے انگریزی سیکھ رہے تھے۔ وہ بھی اس ترجمے میں شریک ہوئے اور انہوں نے ایسے کمال کے ترجمے کئے کہ دھوم مچ گئی۔ قانونی کتابوں کے ترجمے بڑے مشکل ہوتے ہیں مگر نذیر احمد نے اس مشکل کام کو آسان بنالیا اور ایسے ترجمے کر دیئے جو آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔ انگریزی حکومت نے ان کے اس کام کو پسند کیا انہیں تحصیل دار بنا دیا۔ انہوں نے امتحان پاس کر لیا تو ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ امتحان بھی اس شان سے پاس کیا کہ اوّل آئے اور بڑا نام ہوا۔

نذیر احمد کی شادی اسی زمانے میں ہو گئی تھی جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ جب یہ تینوں پڑھنے کے قابل ہو گئے تو نذیر احمد نے انہیں خود پڑھانا شروع کیا۔ مگر مشکل یہ آ پڑی کہ جو کتابیں موجود تھیں۔ پرانی، دقیانوسی، انہیں پڑھنے میں بچوں کا دل نہیں لگتا تھا۔کیا کریں ایسی کتابیں کہاں سے لائیں جنہیں بچے شوق سے پڑھیں۔ جب کوئی کتاب نہیں ملی تو نذیر احمد نے اپنے بچوں کے لئے خود کتابیں لکھ دیں۔ بچیوں کے لئے مرات العروس (دلہن کا آئینہ) اور بیٹے کے لئے چند پند (کچھ نصیحتیں) مرات العروس دو بہنوں کا قصہ ہے۔ بڑی اکبری۔ بلا کی پھوہڑ۔ بد مذاق۔ لڑاکا اور زبان دراز تھی۔ شادی ہوتے ہی اس نے ساس نند اور شوہر کی زندگی دوبھر کر دی اور اپنا گھر برباد کر لیا۔ چھوٹی بہن اصغری نیک بخت سلیقہ مند سگھڑ اور ہوشیار تھی۔ اس نے اپنی محنت اور سلیقے سے گھر کو جنّت بنا دیا۔ نذیر احمد نے یہ قصہ ایسے مزے دار انداز سے لکھا ہے کہ آج بھی جو پڑھتا ہے خوش ہوتا ہے اور لطف لیتا ہے۔ یہ سوا سو برس پہلے کے

مسلمان گھرانوں کا ایسا نقشہ ہے جس سے ہر چیز آئینہ ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد کی یہ کتاب صوبائی محکمہ تعلیمات کے انگریز سربراہ نے دیکھی۔ وہ اس کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کے مشورے پر حکومت نے نذیر احمد کو انعام دیا۔ ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ مرات العروس کا دوسرا حصہ بنات النعش (نعش کی بیٹیاں ستاروں کا ایک جھرمٹ) لکھا۔ یہ بھی بہت پسند کیا گیا۔ اب انہوں نے اپنی مشہور کتاب توبتہ النصوح (نصوح کی توبہ) لکھی۔ بڑی زبردست کتاب ہے۔ اولاد کی تربیت کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں نذیر احمد نے والدین کی توجہ دلائی ہے کہ اولاد کی پرورش اور تربیت اس طرح ہونا چاہئے کہ وہ بڑی ہو کر بہترین انسان ثابت ہو۔ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین کے حکم پر چلے اور ملک و قوم کی خدمت کرے۔ توبتہ النصوح کا قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس کے پڑھنے سے دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ توبتہ النصوح کا ایک کردار "مرزا ظاہر دار بیگ" ایسا جیتا جاگتا کردار ہے جو ہر عہد اور ہر زمانے میں ہوتا ہے اور ہر شخص اسے جانتا پہچانتا ہے۔ نذیر احمد کی یہ کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ مرات العروس اور بنات النعش شادی کے وقت لڑکیوں کو جہیز میں دی جاتی تھیں۔ بعض پڑھی لکھی عورتوں نے انہیں زبانی یاد کر لیا تھا۔ ان کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں بھی ہوئے اور پسند کئے گئے۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی ریاست تھی۔ حیدر آباد، اس کا نام تھا۔ وہاں کے حکمراں کو نظام کہتے تھے۔ حیدر آباد کے ایک بڑے لائق وزیر اعظم سر سالار جنگ نے ریاست کے انتظام کے لئے ملک کے مختلف حصوں سے لائق اور محنتی آدمی بلوائے۔ نذیر احمد بھی بلائے گئے۔ انہوں نے حیدر آباد میں بڑی محنت سے کام کیا۔ بڑے عہدے پر رہے۔ دن رات سرکاری کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ مگر حافظہ ایسا تھا کہ چھ مہینے میں قرآن شریف حفظ کر لیا حیدر آباد میں نذیر احمد سات برس رہے پھر یہ ہوا کہ سالار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بیٹے وزیر اعظم ہو گئے یہ نذیر احمد کے شاگرد تھے۔ ان سے دفتری کام سیکھا تھا مگر سر سالار جنگ کے بعد نذیر احمد کا دل اچاٹ ہو گیا۔ پنشن لے کر گھر آ گئے اور ایک بار پھر لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گئے اور قومی کاموں میں مشہور مسلمان رہنما سر سید احمد خاں کا ہاتھ بٹانے لگے۔

اس عہد میں نذیر احمد نے اپنی کتابوں کے ذریعے سے وہ اصلاحی کام پھر شروع کیا جو مرات العروس سے جاری ہوا تھا۔ اب انہوں نے فسانہ مبتلا لکھا۔ ایامیٰ لکھی۔ رویائے صادقہ لکھی۔ ابن الوقت لکھی۔ فسانہ مبتلا میں ایک وقت میں دو شادیاں کرنے کی خرابیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایامیٰ میں بیواؤں کی شادی پر زور دیا گیا ہے۔ رویائے صادقہ میں یہ بتایا ہے کہ سچی اسلامی زندگی کسے کہتے

ہیں اور ابن الوقت میں بے سوچے سمجھے انگریزوں کی نقل میں کالے انگریز بننے کی خرابیاں ظاہر کی گئی ہیں یہ چاروں کتابیں بھی ان کی پہلی کتابوں کی طرح بہت پسند کی گئیں۔

نذیر احمد کے زمانے میں قرآن شریف کے اردو ترجمے عام نہیں ہوئے تھے۔ دو بزرگوں شاہ رفیع الدین" اور شاہ عبدالقادر" کے ترجمے عام طور پر پڑھے جاتے تھے۔ نذیر احمد نے سلیس، سادہ اور بڑے آسان انداز میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ آج بھی خوب پڑھا جاتا ہے اور اسے نذیر احمد کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ نذیر احمد نے ایک کتاب الحقوق والفرایض، لکھی۔ اس میں زندگی رہن سہن اور اخلاق کے بارے میں دینی معلومات ہیں، الاجتہاد میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے اور امہات الامہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیگمات کا حال ہے۔

اللہ تعالٰی نے نذیر احمد کو تقریر کرنے کا ملکہ بھی دیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے بڑے زبردست مقرر تھے۔ تقریر کرتے تو سماں باندھ دیتے۔ سرسید کے جلسوں میں جب وہ تقریر کرتے تو چندے کی بارش ہو جاتی۔ لاہور کی انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسوں میں بھی ان کی تقریر سننے کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ نذیر احمد سرسید کے اصلاحی خیالات کے بڑے حامی تھے۔ ان کی وجہ سے سرسید کی تحریک اور علی گڑھ کالج کو بہت فائدہ ہوا۔

نذیر احمد صاف گو، نڈر، اور حق بات کہنے والے تھے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ مزاج میں شگفتگی بھی تھی۔ ایک دفعہ وہ کسی بڑے انگریز سے ملنے گئے جو ان کا دوست تھا۔ افسر کے اردلی نے دیکھا کہ ایک معمولی سا پرانی وضع کا آدمی اتنے بڑے افسر سے ملنے آیا ہے۔ اس نے جھڑک دیا۔ بیٹھو میاں انتظار کرو۔ صاحب تم جیسے لوگوں سے ملنے کے لئے نہیں بیٹھے رہتے۔ بڑی دیر ہو گئی اردلی اپنی بات پر اڑا رہا۔ آخر نذیر احمد نے جیب سے دو روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے اردلی فوراً دوڑا اندر گیا۔ صاحب کو اطلاع دی۔ صاحب نے انہیں فوراً اندر بلایا۔ نذیر احمد اندر پہنچے تو انگریز نے ہاتھ بڑھایا کہا۔ مزاج شریف نذیر احمد نے کہا مزاج بہت خراب ہے۔ اور میں آپ سے ہاتھ بھی نہیں ملا سکتا۔ انگریز نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ مولوی صاحب کیا ہوا ہے۔ نذیر احمد نے کہنے لگے۔ آپ کے اردلی کو دو روپے دے کر یہاں پہنچا ہوں۔ مزاج کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے۔ صاحب یہ سنتے ہی غصے سے لال ہو گیا۔ اردلی کو بلایا پوچھا تم نے روپے لئے ہیں وہ انکار کرتا ہے۔ روپے جیب میں موجود تھے صاحب نے گرج کر کہا۔ تم

کرنیں

○ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔

دنیا میں اس طرح رہو جیسے تم ایک مسافر ہو۔

ابھی برخواست یہ کہہ کر نذیر احمد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نذیر احمد چپکے سے بیٹھے رہے۔ صاحب نے کہا مولوی صاحب اب کیا بات ہے۔ نذیر احمد بولے میرے روپے تو مجھے ملے ہی نہیں۔ انگریز نے ان کے روپے واپس دلوا کر کہا اب تو ہاتھ ملائیں۔ آپ کے روپے بھی واپس مل گئے۔ نذیر احمد کہنے لگے۔ اس اردلی کا قصور بھی معاف کر دیجئے تو پھر ہاتھ ملاؤں گا۔ انگریز نے مجبور ہو کر اس کا قصور معاف کر دیا۔ اور اپنی نوکری پر قائم رہا۔ بظاہر نذیر احمد بڑے سخت تھے لیکن اندر سے نرم بھی تھے۔

نذیر احمد نے خوب لکھا اردو نثر کو نیا انداز دیا۔ مسلمانوں اور خاص طور پر عورتوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ نئے اور اچھے خیالات پھیلائے دین کا چرچا کیا۔ ساری زندگی قومی اصلاح کے کاموں میں مصروف رہے۔ ہمیشہ سادہ زندگی گزاری مگر قومی کاموں میں دل کھول کر خرچ کیا۔ ان کا شمار اردو ادب کے بہت بڑے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے مصلح اور رہنما بھی سمجھے جاتے ہیں۔ قومی تاریخ میں ان کا نام بہت نمایاں ہیں۔

نذیر احمد نے بڑی مصروف اور بھرپور زندگی گزاری۔ ۱۹۱۲ء میں وہ اسی مہینے کی تین تاریخ کو اللہ تعالٰی سے جا ملے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی کتابیں اور کارنامے زندہ ہیں۔ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

آنکھ مچولی آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔ ہماری کاوش آپ تک اور آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے مُعاون ہمارے مددگار

صُوبہ سرحد و پنجاب میں "آنکھ مچولی" کے ایجنٹ

نمبر	ایجنسی	شہر	فون
۱	افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
۲	سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۳۹
۳	ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
۴	اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
۵	فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
۶	اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
۷	سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
۸	پاکستان اسٹنڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
۹	خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
۱۰	طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
۱۱	چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶-۷۲
۱۲	مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
۱۳	رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
۱۴	رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاولنگر	
۱۵	ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
۱۶	سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
۱۷	اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹
۱۸	کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷

خط وکتابت کے لیے سرکولیشن مینجر" ماہ نامہ آنکھ مچولی، ا-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

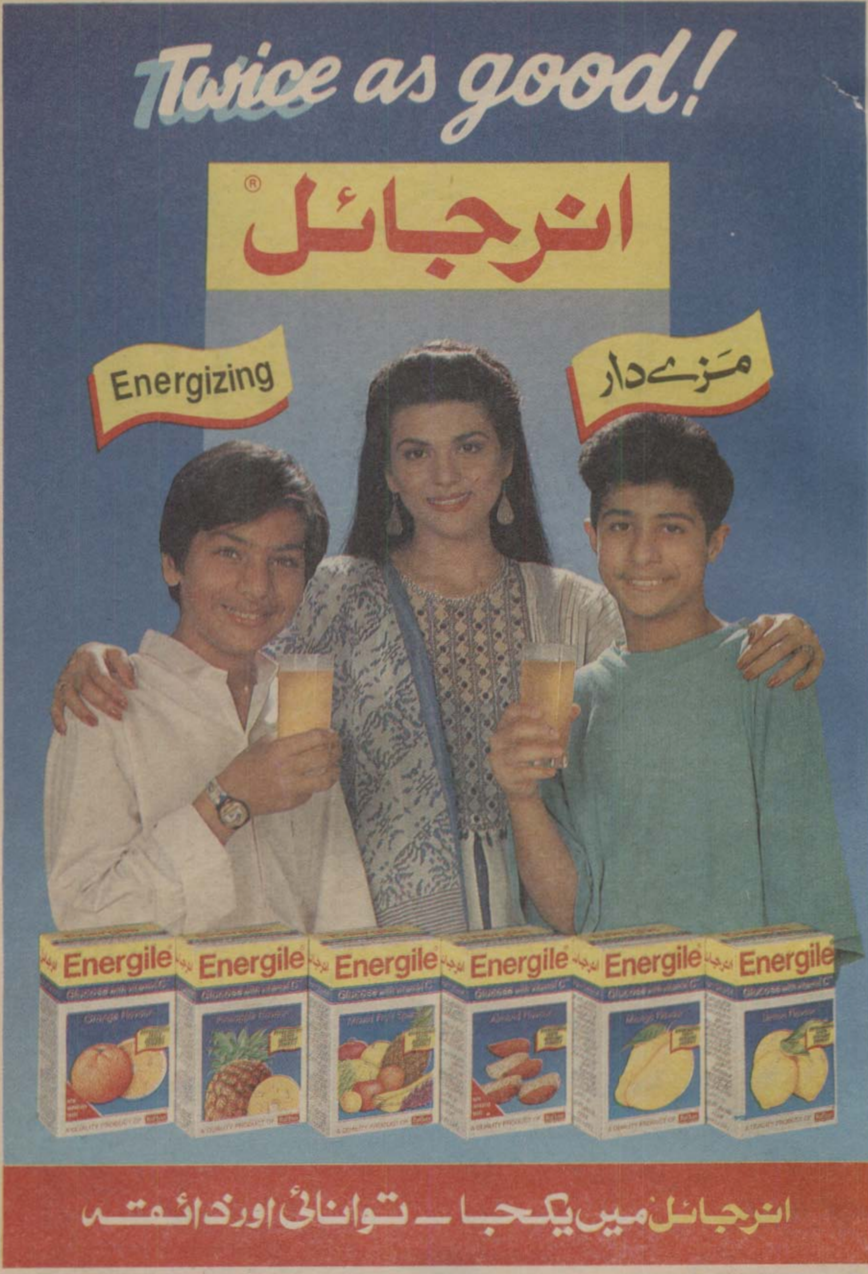
Twice as good!
انرجائل®
Energizing
مزے دار
Energile
Energile
Energile
Energile
Energile
Energile
انرجائل میں یکجا ۔ توانائی اور ذائقہ

چھٹی کا ایک دن

فصیح باری خان

کردار اس ترتیب سے اسٹیج پر آتے ہیں

(۱) گوگی (۲) نونی (۳) نیٹو (۴) مینا (۵) چھٹکی (۶) گبر

پردہ کھلتا ہے

چھوٹا سا ڈرائنگ روم جس میں جا بجا سامان بکھرا پڑا ہے۔ کمرے کی بے ترتیبی یقین دلا رہی ہے کہ اس کے مکین کتنے بد ذوق ہیں۔ پینٹنگ الٹی لٹکی ہوئی ہے اور کارپٹ پر رسالے بکھرے ہوئے ہیں۔

گوگی اسٹیج پر آتا ہے

گوگی ...... "یہ چھٹیاں کیوں ہوتی ہیں؟"

نونی ...... (پیچھے سے سامنے آکر) "ماں باپ کو برداشت کرنے کے لئے۔"

گوگی ...... "او چپ کرو موٹے مینڈک۔"

نونی ...... (گوگی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) "گوگی آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں ساری دنیا کی برگر شاپس کے برگر کھا جاؤں۔"

گوگی ...... "ندیدے کہیں کے۔"

نونی ...... "ممی آج پھر وہی سڑا ہوا کھانا پکا کر گئی

ہیں۔ "

گوگی ...... "کیا پکا کر گئی ہیں۔ "

نونی ...... "وہی جوان کو بہت پسند ہے۔ "

گوگی ...... "کیا.....؟"

نونی ...... (مایوسی سے) "گوبھی آلو..... "

گوگی ...... "شکر کرو انہوں نے کدو نہیں پکایا ورنہ آج کل وہ کدو پر بھی خاصی مہربان ہیں۔ "

ٹیٹو ...... (اندر سے آتا ہے) "بری بات ہے اب اس کا نام کدو بھی نہ رکھو۔ ویسے یہ ہے تو ویسا ہی گول مٹول ...... کدو اچھا نام ہے ــ کتنا سوٹ کرتا ہے ناں نونی پر ــ نونی کدو..... "

نونی ...... "میں پاپا سے شکایت کروں گا۔ "

ٹیٹو ...... (پاس آکر پچکارتے ہوئے) "بری بات اچھے بچے شکایتیں نہیں کرتے۔ "

نونی ...... (بیچارگی سے) "تو پھر اچھے بچے کیا کرتے ہیں۔ "

ٹیٹو ...... "صبر..... "

نونی ...... (جھٹ سے) "پتہ ہے برابر والوں کے ہاں فرائیڈ رائس بن رہے ہیں۔ سچ اتنی اچھی خوشبو آرہی ہے۔ "

ٹیٹو ...... (افسردگی سے) "ایک تو ممی نجانے کیوں پڑوسیوں سے لڑتی پھرتی ہیں۔ حالات اچھے ہوتے تو ایک آدھ پلیٹ فرائیڈ رائس کی آ ہی جاتی۔ "

گوگی ...... "کیا بوریت ہے۔ دس دن ہو گئے ہیں اسکول کی چھٹیوں کو مگر لگتا ہے دس سال گزر گئے ہیں۔ روز امی پاپا آفس جاتے ہوئے ہمیں لاک کر جاتے ہیں۔ کہتے ہیں حالات اچھے نہیں۔ یہاں تو حالات کبھی بھی اچھے نہیں ہوتے۔ "

نونی ...... "اور وہ خبروں والے انکل کہتے ہیں سب ٹھیک ہے۔ "

ٹیٹو ...... "شاید ان کے ہاں سب ٹھیک ہوتا ہو۔ "

نونی ...... "وہ تو ٹی وی میں رہتے ہیں ــ ایک دن میں ٹی وی کھول کر انکل کو نکالوں گا اور ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں سناؤں گا۔ "

ٹیٹو ...... (ناراض ہو کر) "تم تو واقعی کدو ہو ــ پھسپھسے کدو کچھ سمجھ بوجھ ہے تمہیں کیا وہ ٹی وی کے اندر گھسے رہتے ہیں؟"

نونی ...... (بات بدل کر) "کاش ممی برابر والی آنٹی سے نہ لڑتیں تو فرائیڈ رائس...... "

گوگی ...... "نونی کیا تمہیں کبھی کچھ کھانے کو نہیں ملتا؟ "

نونی ...... (جل کر) "ہاں ملتا ہے۔ گوبھی آلو اور ...... "

ٹیٹو ...... "اور کدو..... "

نونی ...... (چیخ کر) "میں مینا باجی سے شکایت کروں گا۔ مینا باجی دیکھئے یہ مجھے کدو کہہ رہے ہیں۔ "

(مینا شور کی آواز سن کر اندر سے آتی ہے)

مینا ...... (برہمی سے) "تم لوگوں نے یہ کیا شور لگا رکھا ہے بیوقوفو ...... "

ٹیٹو ...... "مجھے آپ کی یہی بات بری لگتی ہے کہ آپ کو اپنے علاوہ سب بیوقوف نظر آتے ہیں۔"
گوگی ...... (چپکے سے) "ایسا ہر بیوقوف کو محسوس ہوتا ہے۔"
مینا ...... "کیا کہا تم نے ...... بولو ...... جواب دو ......"
گوگی ...... (کھسیا کر) "میں تو کہہ رہا تھا بہت دنوں سے آپ کی فرینڈ راشدہ باجی نہیں آئیں۔"
ٹیٹو ...... "ہائے راشدہ باجی کتنی موٹی ہیں بالکل نونی پارٹ ٹو لگتی ہیں۔"
مینا ...... (غصے سے) "تم لوگوں کو شرم نہیں آتی ہر ایک کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہو۔ اگر راشدہ کا بھائی میرا مذاق اڑائے تو تم لوگوں کو کیسا لگے گا......؟"
ٹیٹو ...... "اچھا بلکہ......"
مینا ...... "کیا؟"
ٹیٹو ...... "میرا مطلب ہے بالکل اچھا نہ لگے گا۔"
مینا ...... "تو...... ہمیں کسی کا دل نہیں دُکھانا چاہئے۔"
نونی ...... "ہمیں کسی کا دل نہیں دُکھانا چاہئے"
نیکی کی راہ چل
برائی سے منہ موڑ
خوشحال خاں خٹک
اصغری اکبری
مینا ...... "بیوقوف۔"
نونی ...... "نہیں شاید یہ ہماری بک میں نہیں ہے۔"
(چھٹکی آنکھیں مسلتی ہوئی داخل ہوتی ہے)
چھٹکی ...... (آنکھیں ملتے ہوئے) "مینا باجی کیا صبح ہو گئی ہے۔"
گوگی ...... "صبح ...... پورے بارہ بج رہے ہیں دوپہر کے۔"
ٹیٹو ...... "اتنی دیر تک مت سویا کرو ورنہ بھوت چمٹ جائے گا۔"
چھٹکی ...... (سہم کر مینا کے پاس آتی ہے) "مینا باجی دیکھئے ٹیٹو بھائی مجھے ڈرا رہے ہیں ــــ کیا واقعی بھوت چمٹ جاتا ہے؟"
گوگی ...... "توبہ کرو چھٹکی تم سے چمٹ کر کیا بھوت کو پاگل خانے جانا ہے۔"
چھٹکی ...... "رات میں نے ایک بڑا عجیب خواب دیکھا۔"
نونی ...... "ڈراؤنا خواب دیکھا ــــ نائٹ میئر باپ رے باپ!"
ٹیٹو ...... "کیا دیکھا؟"
گوگی ...... "کیا دیکھا؟"
(چھٹکی سب لوگوں کو کندھے سے پکڑ کر ایک طرف کرتی ہے۔ پھر پورے اسٹیج پر گنگناتے ہوئے چکر کاٹتی ہے)

سب ایک ساتھ ...... "ارے اسے کیا ہوا۔"

چھٹکی ...... "میں نے دیکھا میں چلی جا رہی ہوں۔

میرے پیروں کے نیچے نرم نرم گھاس ہے۔

میرے سر کے اوپر بادل کے چھوٹے چھوٹے بچے اپنی زبانیں نکال کر آئسکریم چاٹ رہے ہیں۔ میں خوش ہوں بہت خوش کہ"

(باہر سے فائرنگ کی تیز آوازیں)

بچے سہم کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں

چھٹکی ...... (حیرت سے) "بالکل ایسی ہی آوازیں ...... کیوں آتی ہیں یہ آوازیں۔ میری دوست مونا کہتی ہے گبر گولیاں چلاتا ہے۔"

نونی ...... "یہ گبر کون ہے۔"

چھٹکی ...... "ہے ایک برا آدمی۔"

(قہقہہ لگانے کی آوازیں)

گبر ...... (بھاری آواز میں) "کھولو دروازہ ــ دروازہ کھولو۔"

بچے ایک ساتھ ...... "کون ــ کون ہے؟"

گبر ...... "میں ہوں گبر تمہارا چاچا۔"

(سارے بچے چیخ مار کر ادھر ادھر چھپ جاتے ہیں)

گبر ...... دروازہ کھولو ــ نہیں کھولو گے۔ ٹھیک ہے میں لاک توڑ کر اندر آ جاتا ہوں۔"

نونی ...... (غصے سے) "یہ سب چھٹکی کی بچی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی نے اس کا نام لیا تھا۔ ایک تو اس کے گلے میں منی بس والوں کا ٹیپ ریکارڈر فٹ ہے۔ تب ہی تو وہ اپنا نام سن کر آ گیا۔ اوپر سے بیٹھے بٹھائے ہمارا چاچا بھی بن گیا۔"

ٹیٹو ...... "خیر اپنے چھوٹے چاچا سے تو اچھا ہی ہو گا کم از کم ناک میں تو نہیں بولتا ناں۔"

مینا ...... "بیوقوفو! آہستہ بولو۔"

ٹیٹو ...... (خفگی سے) "ایک تو آپ ہمیشہ ہم لوگوں کو بیوقوف ہونے کا طعنہ دیتی ہیں۔"

مینا ...... "جانتے ہو گبر شہر کا سب سے بڑا بدمعاش ہے۔"

نونی ...... "مگر بابا تو کہتے ہیں ان کا باس سب سے بڑا بدمعاش ہے۔"

مینا ...... خاموش ــ شاید اس نے لاک توڑ دیا ہے۔"

(اسٹیج پر مکمل سکوت ہے۔ قدموں کی چاپ قریب ہوتی ہے)

گبر ...... (پاس آکر) "تم لوگ چھپے کیوں ہو۔ سامنے آؤ۔ میں خاصا نرم مزاج ڈاکو ہوں اور بچے تو مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ میرے پاس ہاتھی کے، شیر کے، بلی کے اور کتے کے بچے ہیں۔"

نونی ...... "مگر انکل ہم تو انسان کے بچے ہیں۔"

گبر ...... "اوہو بھئی مجھے انسانوں کے بچے بھی بہت پسند ہیں۔"

ٹیٹو ...... (سر اٹھا کر) "تب ہی آپ انہیں کم کرتے جا رہے ہیں۔"

گبر ...... "بھئی بچو! میرے سامنے آؤ اکھٹے ہو کر — آ جاؤ پلیز میں نے کہا ناں میں بہت Sophisticated ڈاکو ہوں۔"

(بچے ڈرتے ڈرتے گبر کے پاس آتے ہیں)

چھٹکی ...... (گبر کی مونچھیں دیکھ کر زور سے تالی بجاتی ہے) "تم لوگ کہہ رہے تھے ناں اس دن ایک دم کٹا چوہا باہر پھر رہا تھا......"

سب ایک ساتھ ...... "ہاں"

چھٹکی ...... "دیکھو گبر انکل نے کتنی صفائی سے اس کی کٹی ہوی دم اپنے ہونٹوں پر چپکائی ہے۔"

گبر ...... (کھسیا کر) "پہلے میری مونچھیں بہت موٹی ہوتی تھیں مگر آج کل موٹی مونچھوں کا فیشن نہیں ہے۔ اس لئے......"

چھٹکی ...... "آپ فیشن کرتے ہیں؟"

گبر ...... "بالکل — یہ دیکھو میری پونی۔"

چھٹکی ...... "اللہ کتنی اچھی پونی ہے۔ آپ کی می نے بنائی ہے (منہ بنا کر) "مینا باجی تو میری اتنی گندی پونی بناتی ہے کہ بس۔"

مینا ...... "خاموش رہو۔ جہاں موقع ملا میری برائیاں شروع کر دیں۔ چغل خور کہیں کی۔"

گبر ...... "مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہے؟"

مینا ...... "آلو گوبی۔"

ٹیٹو ...... "اور شاید فرج میں کل رات کے بچے ہوئے کدو بھی ہوں۔ لے آؤں۔"

گبر ...... (مایوسی سے) "نہیں رہنے دو۔"

نونی ...... (قریب آکر) "آپ کو بھی آلو گوبھی اور کدو نہیں اچھے لگتے ناں۔"

گبر ...... (لاچاری سے) "نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔"

نونی ...... "تو میں آپ کو ایک ترکیب بتاتا ہوں۔"

گبر ...... "کیا؟"

نونی ...... "آپ برابر والوں کے ہاں چلے جایئے اور پستول دکھا کر سارے فرائیڈ رائس لے آیئے۔"

گبر ...... "آئیڈیا اچھا ہے۔"

نونی ...... "تو جایئے ناں۔"

گبر ...... "ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔ کھانے کے بعد تمہارے گھر کا سامان لوٹوں گا۔"

(باہر نکل جاتا ہے)

چھٹکی ...... (بڑی بوڑھیوں کے لہجے میں) "بیچارا بھلا آدمی ہے۔"

گوگی ...... "کون......؟"

چھٹکی ...... "ارے یہی اپنا گبر۔"

مینا ...... (طنز سے) "ہاں بہت اچھا آدمی ہے۔ تم لوگ تو بالکل ہی بیوقوف ہو۔ اس سے یوں فری ہو گئے جیسے وہ تم لوگوں کا ماما ہو۔ اب وہ آئے گا اور ہم سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔"

چھٹکی ...... (سہم کر) "نہیں......" (مینا سے لپٹ جاتی ہے)

مینا ...... (گہرے طنز سے) اوہو بھئی آپ کو

کیوں ڈر لگ رہا ہے!!"

چھٹکی ...... (کانپتی ہوئی آواز میں) "مجھے ...... نہیں تو۔ میں تو نہیں ڈر رہی ...... خود ہی ڈر رہی ہوں گی آپ ......"

ٹیٹو ...... (سب کو مخاطب کرتے ہوئے) "ارے ارے دیکھو چھٹکی کیسی لگ رہی ہے!!"

گوگی ...... "کیسی لگ رہی ہے۔"

ٹیٹو ...... "لگ رہا ہے کوئی چوہیا کھمبے سے چپکی ہو۔"

(چھٹکی فوراً مینا سے الگ ہو جاتی ہے)

مینا ...... (ناراضگی سے) "میں دیکھ رہی ہوں تم لوگوں کے Jokes آج کل کچھ زیادہ ہی اوور ہو گئے ہیں۔"

نونی ...... "گبر ضرور آنٹی کی پوری دیگ اٹھا لائے گا۔"

ٹیٹو ...... (حیرانی سے) دیگ ...... آنٹی نے اپنے گھر والوں کے لئے کھانا پکایا ہوگا۔ تمہارے لئے نہیں کہ دیگ کی ضرورت پڑے۔"

مینا ...... (نونی سے) "کیا تم صرف کھانے کے لئے زندہ ہو؟"

نونی ...... (جھینپ کر) "نہیں تو......"

مینا ...... "پھر۔"

ٹیٹو ...... "یہ صرف کھانے کے لئے نہیں بلکہ صرف اور صرف کھانے کے لئے زندہ ہے۔"

نونی ...... "یہ کیا بات ہوئی؟"

ٹیٹو ...... "تم نہیں سمجھ پاؤ گے اس لئے کہ تم کدو ہو۔ (نونی کے پاس آکر) "باہر سے گول گول اور اندر سے پھسپھسا اور پلپلا۔"

نونی ...... "آنے دو آج پاپا کو۔"

ٹیٹو ...... "کیا کریں گے پاپا صرف ایک چانٹا ہی لگائیں گے نا۔ میں تو عادی ہوں I am Superman کیا سب کے پاپاؤں کے پاس چانٹے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔"

مینا ...... "یہ تو ہے۔"

چھٹکی ...... "پاپا اتنے چڑچڑے کیوں ہیں۔"

گوگی ...... "شاید اس لئے کہ وہ سارا دن آفس میں کام کرتے ہیں۔"

چھٹکی ...... "کیا آفس میں ممی جیسی کوئی اور ممی بھی ہوتی ہیں؟"

مینا ...... "پاگل ہو گیا!"

نونی ...... "پاپا آفس والی ممی سے بھی لڑتے ہوں گے۔ گھر، آفس، آفس، گھر۔ دنیا کی ساری ممیاں شادی نہ کریں تو دنیا میں کتنا سکون ہو جائے۔"

چھٹکی ...... "پھر کوئی پاپا جیسی چیز نہ ہو۔"

ٹیٹو ...... "جن کے پاس ہر سوال کا جواب چانٹا ہے۔"

مینا ...... (سمجھاتے ہوئے) "پاگلوں پاپا اور امی اتنی محنت کس لئے کرتے ہیں۔ صرف ہمارے لئے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم اچھے اسکولز میں پڑھیں۔ ہمارا یونیفارم نیا ہو اور ہمارے ٹفن باکس میں ڈھیر ساری چیزیں ہوں اگر وہ تھوڑا بہت ڈانٹ لیتے ہیں تو

اس میں برائی ہی کیا ہے۔ ممی کو دیکھو انھوں نے میری اور چھٹکی کی کتنی ڈھیر ساری فراکس بنائی ہیں اور خود کے پاس وہی برسوں پرانی اڑے اڑے رنگوں والی ساڑھیاں اور پاپا...... "

(سب بچے جماہیاں لینے لگتے ہیں۔ مینا بولتے بولتے رک جاتی ہے)

ٹیٹو ...... "کتنا بولتی ہیں آپ مینا باجی۔ "

مینا ...... (اکتا کر) "مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر۔ "

ٹیٹو ...... "وہ کیا ہوتا ہے؟ "

مینا ...... (چڑ کر) "میرا سر...... "

چھٹکی ...... "سر سے کیا یاد آیا میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ "

مینا ...... "اور دیکھو رات کو میوزک چینل چارٹ!"

چھٹکی ...... "مجھے اچھا لگتا ہے۔ ہاں مگر جب پروگرام ختم ہوتا ہے ناں تو میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ "

نونی ...... "میں تو MCC روز اسکول سے آتے ہوئے سنتا تھا۔ جب ڈھیر ساری گاڑیاں ہارن بجاتی ہوئی ایک ساتھ گزرتی تھیں۔ " (زور زور سے)

"پوں پوں پوم پوم پوں پوں۔ "

گوگی ...... "نونی تمہیں تو بولنے کا کینسر ہو گیا ہے۔ "

نونی ...... "یہ گبر اب تک نہیں آیا؟ "

ٹیٹو ...... "پہلے خود ٹھونسے گا پھر بچا ہوا، ہمارے لیے لائے گا۔ "

چھٹکی ...... "آج کل کے ڈاکو بھی کتنے selfish ہو گئے ہیں۔ "

نونی ...... "وہ فلم والے ڈاکو کو دیکھا ہے۔ وہ تو امیروں کو لوٹ کر غریبوں کو بانٹتا ہے۔ "

گوگی ...... "تب ہی تو وہ صرف فلم میں ہوتا ہے۔ "

ٹیٹو ...... (فلسفیانہ انداز میں) "ہاں یار اب اچھے لوگ صرف فلم اور ٹی وی پر ہی رہ گئے ہیں۔ "

نونی ...... (ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے) "کہاں رہ گیا گبر؟ "

گبر ...... (اندر داخل ہوتا ہے) "تم لوگ بڑے ڈپلومیٹ بچے ہو۔ میرے سامنے تو گبر انکل گبر انکل کہتے ہوئے تم لوگوں کی زبان نہیں سوکھ رہی تھی اور یہاں سے جانے کے بعد میں صرف گبر رہ گیا۔ "

نونی ...... (بے صبری سے) "کچھ لائے گبر انکل؟ "

گبر ...... "اگر کچھ لاتا تو تمہیں نظر نہیں آتا۔ "

نونی ...... "یعنی؟ "

گبر ...... "جب میں کچن میں پہنچا تو صرف ایک پلیٹ فرائیڈ رائس ہی بچے تھے۔ "

نونی ...... "تو...... تو...... یقیناً آپ نے کچن سے کوئی تھیلی اٹھا کر فرائیڈ فرائس اس میں بھر لئے ہوں گے...... ہیں ناں یو آر سو سوئیٹ گبر انکل"۔

(گبر کی جیبیں کھنگالنے لگتا ہے)
گبر...... "یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے گدگدی ہو رہی ہے۔"
نونی ...... "تھیلی تلاش کر رہا ہوں۔"
گبر...... "بھئی تمہارا اندازہ غلط ہے...... ایک پلیٹ فرائیڈ رائس میں تم اتنے ڈھیر سارے بچوں کا کہاں بھلا ہوتا۔ اس لئے وہ پلیٹ میں نے ہی ...."
(نونی جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی گبر کی کمر پر مکے مارنے لگتا ہے)
نونی ...... "جھوٹے مکار، دو نمبر کے ڈاکو۔ سب کھا گئے تمہارے پیٹ میں درد بھی نہیں ہوا۔"
گبر...... (مکوں سے بچتے ہوئے) "بھئی اس کو سمجھاؤ نا تم لوگ۔"
(سب لاپرواہی سے کندھے اُچکاتے ہیں)
نونی ...... "تم لوگ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ابھی تو جناب کا گھر لوٹنے کا بھی ارادہ ہے۔"
(سارے بچے گبر پر پل پڑتے ہیں۔ گبر زور زور سے چلا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بچوں کے نرغے سے نکلتا ہے اور باہر بھاگنے لگتا ہے)
نونی ...... "یہ اپنا کھلونا تو لیتے جاؤ۔"
(گبر رُک جاتا ہے)
ٹیٹو...... "نونی ذرا پستول دکھاؤ۔"
(ٹیٹو پستول کو غور سے دیکھتا ہے)
ٹیٹو ...... (گبر کی طرف دیکھتے ہوئے) "یہ پستول تو کاوس جی کی شاپ پر چھبیس روپے کی مل رہی ہے۔"
گبر ...... (بھڑک کر) "دماغ صحیح ہے تمہارا پورے بیالیس روپے کی لی ہے وہ بھی رعایت کرا کے۔"
ٹیٹو...... "وہ تم سے بھی بڑا ڈاکو تھا جو تمہیں ڈاکو بنا گیا۔ کوڑھ مغز ڈاکو۔"
گبر...... (سر کھجا کر) "وہ کیا ہوتا ہے؟"
(سب بچے ایک ساتھ گبر کی طرف بڑھتے ہوئے)
بچے ...... "ہم تمہیں بتاتے ہیں وہ کیا ہوتا ہے۔"
(گبر کی طرف بڑھتے ہیں۔ گبر باہر بھاگ جاتا ہے)
چھٹکی ...... (ٹھنڈی سانس بھر کر) "آدمی کس پر بھروسہ کرے۔ ڈاکو تک تو جعلی ہیں یہاں۔"
نونی ...... "میرا تو بھوک کے مارے دَم نکل رہا ہے۔"
گوگی ...... "مینا باجی میرے لئے تو آلو گوبھی بھی ہی گرم کر دیجئے۔"
ٹیٹو...... "میں بھی کھا لیتا ہوں۔ ایک بات ہے ممی کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے۔ ٹھیک ہے آلو گوبھی سے ان کو زیادہ محبت ہے مگر اتنے برے تو نہیں پکاتیں کہ آدمی کھانا ہی نہ کھائے۔"
چھٹکی...... "میں بھی کھاؤں گی مینا باجی بھوک کے مارے میرا دم نکل رہا ہے۔"

(نونی منہ پھلائے بیٹھا ہے۔ مینا اپنی جگہ سے اٹھتی ہے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس تک پہنچتی ہے۔ پیار سے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتی ہے)

مینا ...... (نرمی سے) "سنو آج اگر یہ بھی کھانے کو نہیں ہوتا تو پھر...... "

(نونی چونک کر مینا کی طرف دیکھتا ہے)

مینا...... "ممی تمہاری پسند والے کڑک پراٹھے پکا کر گئی ہیں۔ آلو گوبھی کے ساتھ بڑا مزا دیں گے۔ اور یوں بھی نونی چوری کے فرائیڈ رائس سے پیٹ بھرنے والے کا حشر تم دیکھ چکے ہو۔"

نونی ...... (پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) "مینا باجی جلدی سے کھانا گرم کر دیجئے اور ہاں رات والے کدو بھی فرج سے نکل کر گرم کر لیجئے گا۔ اب کدو اتنے برے بھی نہیں ہوتے۔ کیوں مینا باجی؟"

مینا مسکراتی ہے۔

سب ایک ساتھ ...... "کدو زندہ باد۔"

تمام کردار اپنی جگہ اسٹل ہو جاتے ہیں۔

پردہ گرتا ہے!!

بچوں کے مشہور و معروف مصنف

اشتیاق احمد

کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور ناول

۶۰۰ــ سونے کا گھوڑا ــ انسپکٹر جمشید سیریز ــ ۱۵ روپے

۶۰۱ــ شاہی مجرم ــ " ــ ۱۵ روپے

۶۰۲ــ چوہے دان ــ " ــ ۱۵ روپے

۶۰۳ــ اونٹ رے اونٹ ــ " ــ ۱۵ روپے

۹۵ــ خول در خول ــ " ــ ۱۵ روپے

۹۶ــ سوزانی درندہ ــ " ــ ۱۵ روپے

۹۷ــ سلاٹر کی واپسی ــ خاص نمبر ــ ۳۰ روپے

۲۰ رمئی ۱۹۹۵ء

کو آپ کے شہر میں ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب

یا

پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانده کلاں لاہور، ــ فون ۷۲۴۶۳۵۶

اک دوجے سے پیار کرو

قتیل شفائی

ایسا ہو اک سویرا   اک ایسی شام آئے
میں تیرے کام آؤں   تو میرے کام آئے

رونق ہو ہر گلی میں   ہر گھر میں ہو اجالا
محروم رہ نہ جائے   کوئی بھی شہر والا
آئے تو روشنی کا   سب کو پیام آئے
میں تیرے کام آؤں   تو میرے کام آئے

اَن پڑھ جو رہ گئے ہیں   پڑھنا اُنہیں سکھائیں
بیکار جو ہیں اُن کو   ہم کام پر لگائیں
اِن ساری نیکیوں میں   ہم سب کا نام آئے
میں تیرے کام آؤں   تو میرے کام آئے

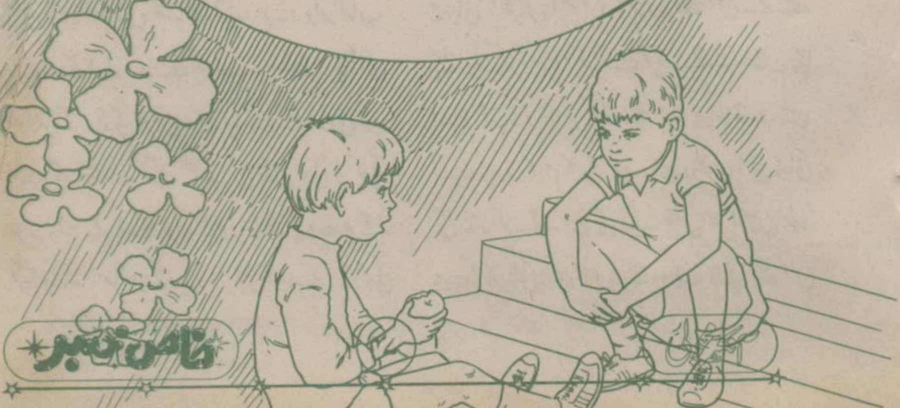

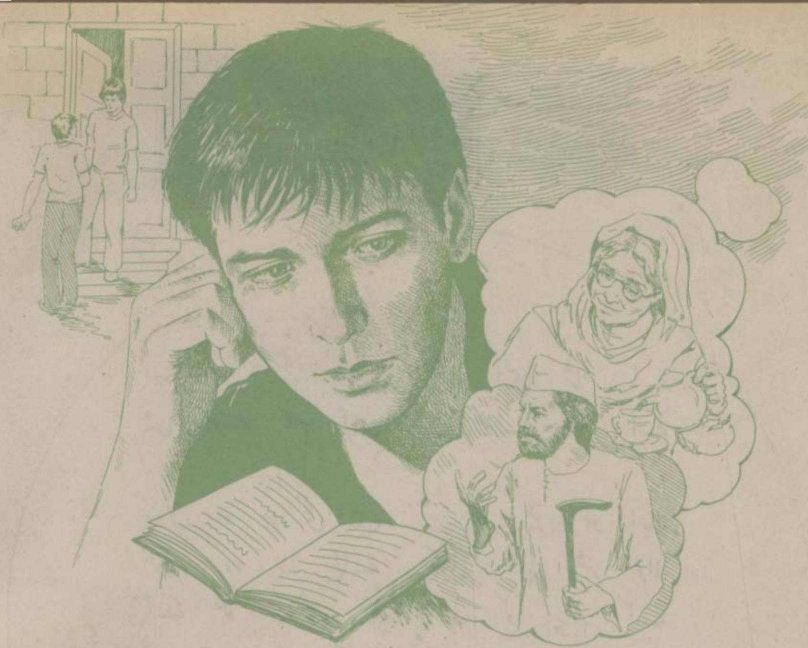

مہمان

نائلہ صدیقی

"عثمان بھائی! سلطان چچا آئے ہیں"۔ روبی نے اطلاع دی تو عثمان سر سے پیر تک سلگ گیا۔ ابھی ابھی تو وہ بستر میں گھسا تھا ایک مزے دار کتاب پڑھنے کے ارادے سے مگر اب یہ سلطان چچا! امی ابو عمرہ کرنے کی غرض سے کیا گئے تھے، روبی اور عثمان کی شامت آگئی تھی۔ صبح شام کوئی نہ کوئی عزیز رشتہ دار یا محلے دار "بچوں" کی خیریت پوچھنے پہنچ جاتا۔ مہمانوں کی یہ ریل پیل ان کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ان کے والدین انتہائی بااخلاق اور وضع دار واقع ہوئے تھے لہٰذا اللہ کی رحمت ان کے گھر خوب برستی تھی۔ والدین کی موجودگی میں بھی وقت بے وقت مہمانوں کی آمد پر دونوں بہن بھائی منہ بنایا کرتے مگر اب تو انہیں خود میزبانی کا فرض انجام دینا پڑ رہا تھا۔ ان کے ملنے جلنے والے بھی تو ایک سے ایک تھے۔ سلطان چچا اپنے آپ کو شاعر کہتے تھے اور ہر ملاقات میں اپنے مجموعہ کلام کا کچھ حصہ ان دونوں بہن بھائی کی نذر کرتے۔ ان کی ایک غزل جو انہیں خود بہت پسند آئی تھی، اس کے ردیف قافیے کچھ اس

قسم کے تھے ہر چند کے شعر بے وزن تھے۔

دریا ہمارے شہر کے تالابوں میں بٹ گئے
بچے ہمارے گھر کے ہمسایوں میں بٹ گئے
اس کے بعد کے اشعار لفافوں میں بٹ گئے'
لحافوں میں بٹ گئے جیسے ردیف قافیوں پر مشتمل

تھے۔ روبی کا خیال تھا کہ چچا کا پورا کلام نقل سے آراستہ ہے جب کہ عثمان کا کہنا تھا کہ ایسے اشعار کسی اور کے نہیں ہوسکتے۔ یہ تمام زہریلا لٹریچر سلطان چچا کی تخلیق ہے۔ سلطان چچا کی عادت تھی کہ وہ آجاتے تو جانا بھول جاتے۔ رات گئے تک ان کے اشعار کا سلسلہ جاری رہتا۔ آج بھی یہی کچھ ہوا۔ عثمان نے اکتا کر کہا" "چچا! ایک شعر میں بھی سناؤں گا"؟ "ہاں ہاں ضرور"۔ چچا چہک کر بولے۔" سنیئے !"

وہ جائیں ہمارے گھر سے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

"واہ میاں! کیا نادر خیال ہے؟" چچا پھڑک اٹھے اور عثمان بھنا کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی مہمان تھے جن کی آمد خاصی پریشان کن ثابت ہوتی تھی۔ مثلاً اسما خالہ جن کی زبان پر مشورے دھرے رہتے تھے۔ ان کا کوئی جملہ مشورے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ والدین کی عدم موجودگی میں تنہا بچوں کو مشورے دینے کا جو نادر موقع ہاتھ آیا تھا وہ اسے مسلسل استعمال کر رہی تھیں۔ ان کا پہلا مشورہ یہ تھا "رات کو کھڑکیاں دروازے بند کر کے سویا کرو" "اور آنکھیں؟" روبی نے معصومیت سے پوچھا مگر اسما خالہ سنی ان سنی کر کے کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں اور اب کھانے کے بخیئے ادھیڑ رہی تھیں۔ "یہ شوربہ اس قدر پتلا کیوں ہے؟ اتنا پانی کیوں ڈال دیا اس میں؟ اتنا پانی تو لان میں ڈالتے ہیں۔" اسما خالہ کا تنقیدی لیکچر جاری تھا۔ اب روبی انہیں کیا بتاتی کہ یہ پتلا شوربہ اچانک آنے والے مہمانوں کے لئے ایمرجنسی ڈنر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مہمانوں کی تعداد کے لحاظ سے شوربے میں پانی کی سطح بلند ہوتی جاتی تھی۔ بہرحال اسما خالہ جب تک گھر میں موجود رہتیں، عثمان اور روبی ان کے مشوروں کی زد میں رہتے۔ اس کے علاوہ سرفراز انکل تھے جو عثمان کے خیال میں صرف اس لئے ان کے گھر آتے تھے تاکہ کوئی چیز مانگ کر لے جاسکیں۔ روبی کا کہنا تھا کہ وہ انکل نہیں برمودا ٹرائی اینگل ہیں ان کے پاس جو چیز جاتی ہے واپس نہیں آتی۔ غرضیکہ ان جیسے مہمانوں کی مسلسل آمدورفت نے دونوں کو سخت بیزار کر رکھا تھا اور وہ ان سے نجات کے لئے ترکیبیں سوچتے رہتے تھے کہ اچانک ایک دن قدرت ان پر مہربان

ہو گئی۔ ہوا یوں کہ ایک دن عثمان بک شاپ پر کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مصروف تھا، اچانک اسے ایک چھوٹی سی کتاب نظر آئی جسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ کتاب کا نام تھا "مہمانوں سے نجات پایئے" مصنف کے دعوے کے مطابق اس کتاب میں ایسے مشورے اور ہدایات درج تھیں جن پر عمل کر کے مہمانوں سے چھٹکارہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، عثمان نے فوراً کتاب خرید کر گھر کی راہ لی۔

کتاب میں درج ہدایات اس قسم کی تھیں :

۱۔ صوفے پر اس طرح بیٹھئے جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائیں گے۔ بار بار گھڑی دیکھئے اور مہمانوں کو جتایئے کہ آپ کو ایک ضروری کام سے جانا ہے۔

۲۔ گفتگو کے لئے بالکل خشک موضوعات کا انتخاب کیجئے۔

۳۔ باتوں باتوں میں اپنی قابلیت جتایئے، دوسروں کی کم علمی کو نشانہ بنایئے۔

۴۔ مہمانوں کو بولنے کا موقع بالکل نہ دیجئے، اپنی سناتے رہیئے دوسروں کی ہرگز نہ سنئے۔

۵۔ اگر مہمان ڈھیٹ ہیں اور کسی نہ کسی بہانے سے بول رہے ہیں تو ان کی ہر بات کاٹیئے، ان کی ہر بات کی نفی کیجئے ہر رائے سے اختلاف کیجئے۔

۶۔ مہمانوں کی کسی بات میں دلچسپی نہ لیں، اکتاہٹ کا اظہار کیجئے، ان کی ہر بات پر اپنی زندگی کا کوئی واقعہ سنایئے۔

۷۔ مہمانوں کے سامنے اپنی کسی بیماری کی تفصیل بیان کیجئے، تکلیف کی شدت اور طریقہ علاج پر روشنی ڈالئے، اخراجات کا ذکر سونے پہ سہاگہ ہوگا۔

۸۔ گھر میں موجود بچوں کی شرارتوں کا احوال مفصل بیان کیجئے۔ مہمانوں کو اپنے بچوں سے گنتی اور نظمیں سنوایئے۔

۹۔ مہمانوں کو شہر میں پھیلی ہوئی بیماریوں سے ڈرایئے۔

۱۰۔ اپنی گفتگو میں کوئی ایسا موضوع نہ آنے دیں جس سے مہمانوں کا خیال چائے کولڈ ڈرنکس جیسی اشیا کی طرف منتقل ہو۔

یہ ہدایات پڑھتے ہوئے عثمان کا دل خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس نے روبی کو بھی یہ کتاب پڑھنے کے لئے دی اب وہ مہمانوں کا استقبال کرنے کے لئے تیار تھے۔ ایک دن سلطان چچا حسب معمول ان کے یہاں بور کرنے کے مشن پر آئے ہوئے تھے مگر آج عثمان بھی تیار تھا چنانچہ جیسے ہی سلطان چچا نے اپنے چہرے پر شاعرانہ تاثرات پیدا کرنے شروع کیے، عثمان

چوکنا ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ شعروں کا پیش خیمہ ہے چنانچہ ان کی غزلوں پر بند باندھنے کی غرض سے اس نے مہنگائی کا موضوع چھیڑ دیا "چچا! آخر اس مہنگائی کا انجام کیا ہو گا؟" "انجام! بھئی ہمیں کیا معلوم؟" چچا نے بدمزگی سے کہا۔ وہ تو شعر اگلنے کے موڈ میں تھے، عثمان نے بے جا مداخلت کر کے ان کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ "بھئی جب تک افراط زر کو کنٹرول نہیں کیا جاتا تب تک مہنگائی ختم نہیں ہو سکتی۔ دراصل زر کی مقدار اور اشیا کی قیمت آپس میں معکوس تناسب رکھتی ہیں لہٰذا جب زیرِ گردش کرنسی کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے تو اشیا کی قیمتیں۔۔۔" عثمان نے ایک سانس میں اکنامکس کے تمام فارمولے اگل دیئے۔ سلطان چچا گم سم بیٹھے اس کا منہ تکتے رہے۔ جیسے ہی وہ سانس لینے کو رکا، وہ اٹھ کھڑے ہوئے "اچھا بھئی اب چلتا ہوں آج مجھے کہیں جانا ہے، پھر آؤں گا۔" اس دن کے بعد سے سلطان چچا کی آمد و رفت کم ہو گئی۔ کتاب کی دیگر ہدایات پر عمل کر کے وہ دوسرے مہمانوں کی روک تھام کرنے میں بھی کامیاب رہے۔

"عثمان بھائی! کہاں کی تیاری ہے؟" روبی نے پوچھا۔ "ارے ذرا بابر کے گھر جا رہا ہوں۔" عثمان نے جواب دیا۔ "ذرا یعنی چار پانچ گھنٹے، ہے ناں؟" روبی بھنائی۔ "اوہو بھئی! بابر کے گھر جا کر وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا، اس کے گھر والے بھی بڑے بااخلاق واقع ہوئے ہیں، مل کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اچھا خیر! اب میں چلتا ہوں" عثمان سیٹی بجاتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ بابر کے گھر پہنچا تو اس کے بھائی نے گیٹ کھولا اور سلام دعا کے بعد اسے بابر کے کمرے میں لے گیا۔ بابر اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا لیکن آج وہ کچھ بجھا بجھا نظر آ رہا تھا۔ گفتگو کے دوران عثمان نے کئی بار اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا مگر وہ چپ رہا۔ وہ عثمان کی باتوں میں بھی زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا بس ہوں ہاں کر رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر عثمان جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا "اچھا بابر! میں چلتا ہوں، آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں پھر آجاؤں گا۔" بابر نے اسے روکنے کے بجائے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس سے ہاتھ ملا کر عثمان نے جانے کے لئے قدم بڑھائے، اچانک وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کی نظر بابر کے بستر پر تھی جہاں تکیے کے نیچے سے ایک کتاب جھانک رہی تھی، جس کا نام تھا "مہمانوں سے نجات پایئے۔"

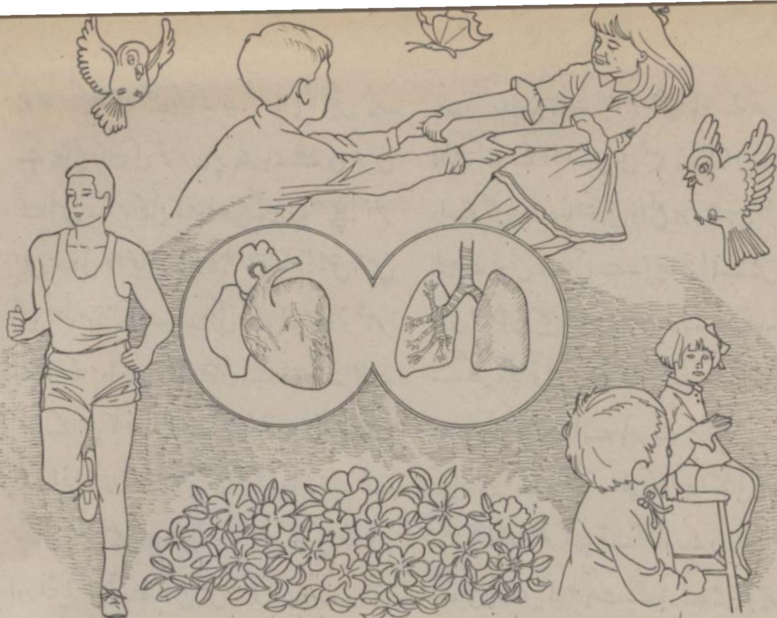

زندگی کیا ہے

نگہت آرا چوہان

یہ سب سے اہم اور پیچیدہ سوال ہے جس کا جواب دینے کی کوشش میں انسان مصروف ہے۔ سائنس دانوں نے دریافت کیا ہے کہ تمام زندہ چیزیں ایک مادے سے بنی ہیں جسے پروٹوپلازم کہتے ہیں۔ سائنس دانوں نے پروٹوپلازم کے لئے ایک کیمیکل فارمولا بنالیا ہے جس میں انہوں نے بہت سے مالیکول اور مرکبات لے کر مصنوعی پروٹوپلازم بنالیا ہے لیکن یہ زندہ نہیں ہے۔ جو کچھ انسان کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ زمین پر تمام جانداروں اور حیات کا مطالعہ کرے اور معلوم کرے کہ ان میں کیا چیز مشترک ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ مشترک خصوصیات زندگی کی تشکیل کرتی ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ یہ خصوصیات کیا ہیں؟

تمام جاندار اشیا نشوونما کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ ایک خاص شکل اور سائز میں بڑھتی ہیں۔ ایک بلوٹا بلی بن جاتا ہے۔ ایک پودا دیو دار کا درخت بن جاتا ہے۔ کچھ جاندار اپنے پورے سائز میں جلدی بڑھ جاتے ہیں...... سرخ لکڑی کا درخت ہزاروں سالوں میں بڑھتا ہے لیکن تمام جاندار اشیا بڑھتی ضرور ہیں۔ ایک جاندار شے اپنے جسم کے مختلف حصے بھی خود بنالیتی ہے۔ ایک جھینگا مچھلی نیا پنجہ بنالیتی ہے۔ آدمی نئی کھال اور ہڈیاں اور درخت نئے پتے۔ ایک اور خصوصیت زندہ اشیا کی یہ ہے کہ وہ اپنی جیسی دوسری اشیاء پیدا کر سکتی

ہیں۔ اگر یہ صلاحیت نہ ہوتی تو ہر جاندار دنیا سے مٹ جاتا ہے۔ پرندے، جانور، پودے، مچھلیاں سب اولاد پیدا کرتے ہیں۔

جاندار اشیا اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتی ہیں اور آدمی دماغ کی وجہ سے دیگر جانوروں سے اس معاملے میں ممتاز ہے لیکن پودے صرف ایک حد تک یہ کرتے ہیں۔ زندہ اشیا میں عمل اور ردِ عمل کی خصوصیت بھی ہوتی ہے ہم جب سونگھتے ہیں تو یہ خوشبو یا بدبو کا ردعمل ہے۔ پودے روشنی کی طرف رخ کر لیتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے آپ کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ زندگی کیا ہے لیکن آپ کو زندہ اشیا کی خصوصیات ضرور معلوم ہو جاتی ہیں۔

ہم سانس کیوں لیتے ہیں؟

ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ہمیں سانس لینا چاہئے لیکن پودوں اور جانداروں کا سانس لینا کیوں ضروری ہے؟

اس کا آسان سا جواب ہے کہ سانس لینے کے عمل سے ہم ہوا میں سے آکسیجن لیتے ہیں جس کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ جب ہم ہوا باہر چھوڑتے ہیں تو یہ بدل چکی ہوتی ہے۔ جیسے ہی یہ ہمارے نظام میں داخل ہوتی ہے تو آکسیجن استعمال میں آجاتی ہے جبکہ اس میں شامل کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی خارج ہو جاتا ہے۔ قدرت ہمارے سانس لینے کے لئے مسلسل آکسیجن فراہم کرتی ہے۔ در حقیقت سینکڑوں سالوں سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کی مقدار میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جو کاربن ڈائی آکسائڈ باہر نکالتے ہیں وہ پودے جذب کر لیتے ہیں اور وہ آکسیجن خارج کرتے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔ سانس لینے کا عمل دو طرح ہوتا ہے **اندرونی اور بیرونی۔** بیرونی تنفس تو یہ ہے کہ ہوا اندر لیتے اور خارج کرتے ہیں لیکن ہوا جس میں ایک بٹا پانچ فیصد آکسیجن ہوتی ہے اتنی ہی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائڈ خارج ہوتی ہے اور یہ عمل پھیپھڑوں میں ہوتا ہے۔

اندرونی تنفس بیرونی کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔ وہ آکسیجن جو ہوا سے لی جاتی ہے اسے پھیپھڑوں سے جسم کی رگوں میں خون کے سرخ خلیات لے جاتے ہیں۔ جسم میں یہ آکسیجن خوراک کو جلاتی ہے تاکہ بدن ان کا استعمال کر سکتے اور پھر خون فاضل پیداوار جس میں پانی اور کاربن ڈائی آکسائڈ بھی شامل ہے الگ لے جاتا ہے۔ یہ پھیپھڑوں میں واپس آجاتی ہیں تاکہ سانس کے ذریعے باہر خارج ہو سکیں۔ کیونکہ دونوں گیسوں کا تبادلہ پھیپھڑوں اور جسم کی رگوں میں ہوتا ہے تو اس کے لئے بڑی سطح کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک بالغ شخص کے پھیپھڑوں کی ضخامت تین مربع میٹر ہوتی ہے یہ ایک اوسط سائز کے کمرے کی چھت سے بڑا سائز ہے۔ ان میں سے بہت سی جگہ ریزو ہوتی ہے کیونکہ کام کے دوران آٹھ سے دس گنا زیادہ آکسیجن درکار

ہوتی ہے۔ اگر ہمیں زیادہ آکسیجن کی ضرورت ہو تو ہم زیادہ تیزی سے اور گہرے سانس لیتے ہیں۔ مختلف جاندار مختلف طریقے سے سانس لیتے ہیں اس کا انحصار اس پر ہے کہ ان کو کتنی آکسیجن چاہئے۔ ایک نومولود بچہ ہر سیکنڈ پر سانس لیتا ہے لیکن پندرہ سال کی عمر میں ایک منٹ میں بیس بار سانس لیتا ہے۔ ہاتھی ایک منٹ میں دس بار اور ایک کتا ایک منٹ میں پچیس بار سانس لیتا ہے۔

دل کی دھڑکن

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں دل ایک پمپ ہے۔ یہ جسم میں خون کی گردش جاری کرتا ہے لیکن یہ کتنا حیرت انگیز پمپ ہے۔ اپنی ہر دھڑکن کے ساتھ یہ ایک سو کیوبک سنٹی میٹر خون بھیجتا ہے اور ایک دن میں دس ہزار لٹر خون پمپ کیا جاتا ہے۔ ایک اوسط زندگی میں یہ دل پچیس کروڑ لیٹر خون پمپ کرتا ہے۔ انسانی دل کی دھڑکن سیکنڈ کے ہر آٹھویں حصے میں ہوتی ہے۔ دن میں دل ایک سو ہزار مرتبہ دھڑکتا ہے اور اتنا ہی عرصہ آرام کرتا ہے جس کا دورانیہ چھ گھنٹے بنتا ہے۔ ہم جسے دھڑکن کہتے ہیں وہ دل کا حرکت کرنا اور رکنا ہے۔ دھڑکنے کے دوران خون پمپ ہوتا ہے اور رکنے کے دوران اندر داخل ہوتا ہے لیکن یہ اتنی سادگی سے نہیں ہوتا جیسے آپ مٹھی کھولتے اور بند کرتے ہیں۔ دھڑکن لہر کی صورت میں دل کی تہہ سے اوپر کی طرف بڑھتی ہے۔ دل کی دھڑکن کو کیا چیز جاری رکھتی ہے۔ کیا یہ خود بخود ہوتی ہے یا کہیں اور سے؟ یہ بیالوجی کا سب سے اہم سوال ہے اور ابھی تک معمہ بنا ہوا ہے۔ آیئے آپ کو ایک دلچسپ تجربہ بتاتے ہیں جو صدیوں سے معلوم ہے۔

فرض کریں آپ مرغی کا انڈہ لیں اور اسے چھبیس گھنٹے تک انکوبیٹ کریں پھر اسے کھولیں اور محدب عدسے کی مدد سے ان خلیات کا مطالعہ کریں جو بعد میں چوزے کا دل بنائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ خلیات دھڑک رہے ہیں حالانکہ ابھی یہ خلیات دل نہیں بنے ہیں۔ اب آپ یہ خلیات نکال لیں اور ویسے ہی بڑھنے دیں اگر آپ دل کو چھ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں تو ہر ٹکڑا کچھ دیر دھڑکے گا۔ اس کی وضاحت کیا ہے؟ ہم نہیں جانتے ہم بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ دل میں خود کار طریقے پر دھڑکنے کی صلاحیت ہے لیکن یہ کس طرح دھڑکن جاری رکھتا ہے ابھی تک راز ہے۔ سائنس کی دنیا میں سائنس دانوں کے پاس ایسے بہت سے سوالوں کے جواب نہیں ہیں اور آخر کار وہ بھی تھک ہار کر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کائنات کے اس کارخانے کو کوئی پوشیدہ قوت چلا رہی ہے۔ اس قوت کو ہم دیکھ تو نہیں سکتے ہیں لیکن اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم مسلمان اس غیبی قوت کو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔

Crescent C mmunications International (Pvt) Ltd.

دیر نہ ہو جائے

سلمان غزالی

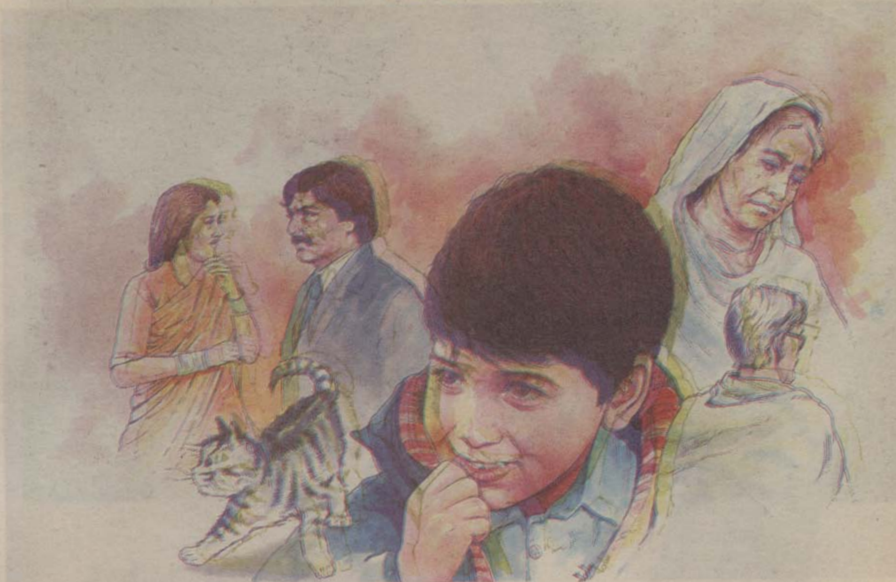

سالن کا ڈونگا ننگا پڑا تھا اور اس کے اوپر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں بڑی بی نے ہاتھ جھلا کر مکھیاں پرے کیں اور ڈونگے کو پلیٹ سے ڈھک دیا۔

"بہو۔" بڑی بی نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے گڈو کی ماں کو مخاطب کیا۔

"کیا ہے؟" گڈو کی امی نے پلٹ کر بڑی بی کی طرف دیکھا حسبِ عادت اس کے چہرے پر ناگواری تاثرات تھے۔

"بیٹی میں کہہ رہی تھی کہ ذرا کھانے کی چیزوں کو ڈھک دیا کرو، اس طرح صفائی اور پاکی رہتی ہے۔" بڑی بی نے دھیمے لہجے میں رک رک کر کہا

"اب میں کیا کیا کروں؟" گڈو کی امی کے لہجے میں بیزاریت تھی "اتنے کام ہوتے ہیں، تھک جاتی ہوں بری طرح خالی اعتراضات کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے آپ ڈھک دیتی نا اگر کوئی چیز ایسے پڑی تھی۔"

"وہ تو میں نے کر دیا تھا مگر ویسے بتا رہی تھی....." بڑی بی کی آواز دھیمی ہوتے ہوئے لبوں کی جنبش تک محدود ہو گئی تھی۔

"ہوں!" گڈو کی امی منہ پھلا کر بڑ بڑائی اور بڑی بی خاموشی سے لونگ روم سے باہر نکل گئیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ گڈو کی ماں اب کافی دیر تک یونہی بڑبڑاتی رہے گی۔

بڑی بی کا ایک ہی بیٹا تھا جمشید۔ جس کی تعلیم و تربیت میں انھوں نے کوئی کسر نہ رکھی تھی جمشید کے والد مرزا صاحب ایک کلرک تھے مگر انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی پرورش ہمیشہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کی تھی جس کے نتیجے میں وہ آج ایک اچھے عہدے پر فائز تھا اور اس کے باوجود کہ اپنے اکلوتے بیٹے کے گھر میں دونوں ماں باپ کی حیثیت کسی بے کار سامان سے زیادہ نہ تھی وہ اپنے بیٹے کی ترقی اور خوشحالی دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے تھے اور اپنے واحد پوتے گڈو کو پیار کر کے اپنے ارمان پورے کر لیتے تھے ایک وہ ہی تو تھا گھر میں جو دو گھڑی دونوں بوڑھوں کے پاس بیٹھ جایا کرتا اور ان سے محبت سے پیش آتا۔

جمشید کو ماں باپ کا کوئی خاص خیال نہ تھا اور پھر گھر میں کیا ہو رہا ہے یہ دیکھنے کی اسے فرصت ہی نہ ہوتی تھی جب کہ اس کی بیوی کو تو ساس سسر بالکل نہ بھاتے تھے ان کی نصیحتوں، ان کی بزرگانہ باتوں سے اسے سخت چڑ تھی۔ اس کے خیال میں ان دونوں کا وجود اس گھر میں بے کار تھا جو اسے برداشت نہ تھا اس کی زبان درازی کی وجہ سے تو اب مرزا صاحب اور بڑی بی نے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا اور نہ ہی گھر کے کسی معاملے میں دخل دیتے تھے کہ کسی دن بھول کر بچوں کے بھلے کو کوئی بات کہہ دیتے تو گڈو کی امی کی گز بھر کی زبان باہر آجاتی اور سارا دن بک بک جھک جھک ہوتی رہتی جو قطعاً ایک طرفہ ہوتی اور جمشید یوں لاتعلق اپنے کاموں میں مصروف رہتا جیسے کچھ ہو ہی نہ رہا ہو۔

مرزا صاحب اور بڑی بی پہلے جس کمرے میں رہتے تھے وہ اب گڈو کے لئے سجا دیا گیا تھا ایک بڑی سی الماری، میز، کرسی، وال ریک کھلونوں سے بھرے ہوئے۔ گڈو اب بڑا ہو رہا تھا اسے اپنے کمرے کی ضرورت تھی جب کہ چھوٹے سے اسٹور روم کو صاف کر کے مرزا صاحب اور بڑی بی کا بستر ادھر لگا دیا گیا تھا شائد وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔

گڈو اس دن اسکول سے لوٹا تو دادا دادی کے کمرے میں نیا سامان اور اپنی چیزیں سجی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"امی یہ نیا سامان کہاں سے آیا ہے اور میری چیزیں ادھر کیوں پڑی ہیں۔" اس نے چھوٹتے ہی ماں کو پکڑ لیا تھا۔

"بیٹا یہ سارا سامان آپ کا ہے اور آج سے یہ کمرہ بھی آپ کا ہے، میرے گڈو کا" ماں نے فخر سے گڈو کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا

"اور دادا دادی؟" گڈو نے جھٹ پوچھا۔

"بیٹا وہ اب دوسرے کمرے میں رہیں گے۔"

"وہ چھوٹے والے کمرے میں؟" گڈو نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"ہاں بیٹے، وہ اب بوڑھے ہو گئے ہیں نا انہیں اب بڑے کمرے کی ضرورت نہیں رہی۔" ماں نے پیار سے گڈو کو سمجھایا اور گڈو نے آگے سے یوں

"اچھا" کہا جیسے بات سمجھ گیا ہو۔

مرزا صاحب اور بڑی بی کو کسی سے کوئی شکوہ نہ تھا، نہ ہی وہ کسی بات پہ اعتراض کرتے تھے۔ وہ تو بس بچوں کو خوش دیکھ کر خوش رہتے تھے۔ ضرورتیں ان کی اتنی محدود تھیں کہ کبھی کسی سے کچھ کہنا نہ پڑتا تھا۔ ہاں بڑی بی کو "مومی" بہت پیاری تھی۔ مومی بھوری آنکھوں والی، سفید مخملی جلد کی بڑی پیاری سی بلی تھی، ایک دن نجانے کدھر سے یہ گھر میں آگئی تھی۔ بالکل چھوٹی سی تھی۔ بڑی بی نے دیکھا کہ لان میں ایک خوبصورت سا چھوٹا سا بلی کا بچہ ایک کونے میں سہما ہوا ٹھٹھر رہا ہے تو انہیں بڑا ترس آیا وہ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئیں، محبت کی زبان تو بے جان بھی سمجھتے ہیں، وہ فوراً ہی بڑی بی سے مانوس ہو گئی اور پھر بڑی بی کا بھی دل نہ مانا اسے خود سے علیحدہ کرنے کو۔ انہیں بھی شائد اب کسی ایسے جاندار کی ضرورت تھی جو ان کے پیار کا جواب پیار سے دے سکتا۔ ان کے بلانے پہ بھاگ کے آسکتا، گھنٹوں ان کی گود میں بیٹھا رہتا، انسان نہ سہی مگر جاندار لمس تو تھا۔

ایک دن گڈو بڑی بی کے پاس بیٹھا ہوا دودھ پی رہا تھا۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا اور اسے نیند آرہی تھی، اس کا دودھ پینے کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دادی کے بہت کہنے کے باوجود وہ آدھا گلاس دودھ کا چھوڑ کر چلا گیا۔ مومی کی نظریں بچے ہوئے دودھ پر جمی ہوئی تھیں مگر بڑی بی کی اجازت کے بغیر وہ کسی چیز کو منہ نہیں مارتی تھی۔

بڑی بی کو اس وقت مومی پر بڑا پیار آیا اور انہوں نے وہ بچا ہوا دودھ اسے ڈال دیا۔ گڈو کی امی کو پتہ چلا تو گویا قیامت آگئی۔

"غضب خدا کا بچے سے دودھ لے کر بلی کو ڈال دیا۔"

"نہیں بہو ایسی بات نہیں....." بڑی بی نے کہنا چاہا۔

"مما میں نے خود....." گڈو نے بھی بتانا چاہا مگر گڈو کی ماں ایک دفعہ بولنا شروع کرتی تو پھر اور کسی کی آواز سنائی نہ دیتی۔ "یہاں انسانوں کو کھانے کو نہیں ملتا اور یہ چونچلے....."

کچھ روز بعد ہی مومی گھر سے غائب ہو گئی اور ایسی غائب ہوئی کہ پھر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جمشید حسبِ معمول اپنے کاموں میں مشغول تھا۔ اسے تو شاید مومی کے آنے کا بھی پتہ نہیں چلا تھا اور نہ ہی جانے کا احساس ہوا۔

بڑی بی کافی دنوں تک اداس رہی تھیں اور اب بھی مومی انہیں یاد آتی تھی۔

وہ ایک خوشگوار شام تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے گلاب کے پودے لہرا رہے تھے اور لان کی سرسراتی ہوئی گھاس بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ جمشید صاحب ایزی چیز میں دھنسے ہوئے گرما گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور گڈو اپنی امی کی گود میں بیٹھا ہوا ان کے دوپٹے کے کونے سے کھیل رہا تھا۔

جمشید صاحب نے خوبصورت موسم کا جائزہ لیا۔ وہ اس وقت اپنے گھر کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ان کا بیٹا اپنی ماں کی گود میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔ سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ زندگی کتنی پرفیکٹ تھی۔ انہوں نے سوچا اور ان کا سینہ جیسے خوشی سے بھر گیا۔

"ہمارا بیٹا بڑا ہو کر کیا بنے گا؟" گڈو کی امی اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"میں افسر بنوں گا، بہت بڑا افسر بالکل پاپا کی طرح۔" گڈو نے کہا۔

"اچھا...... پھر ہمارے بیٹے کے پاس بہت سا روپیہ ہو گا، گھر ہو گا، گاڑی ہو گی، مگر یہ بتاؤ کہ پھر ہمارا بیٹا ہمیں کیا لے کر دے گا؟" گڈو کی امی نے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو......؟" گڈو سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں بھی اپنی ممی کو، اپنے پاپا کو۔"

"میں...... میں اپنی تنخواہ میں سے پیسے بچا کر آپ کے لئے بازار سے پرانے کپڑے لایا کروں گا۔" گڈو نے سوچ کر جواب دیا۔

"پرانے کپڑے۔" گڈو کی امی ہنس پڑیں، جمشید صاحب بھی مسکراتے ہوئے حیرت سے گڈو کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ہاں مگر میں نا اپنے گھر میں پچھلی طرف پہلے سے ایک چھوٹا سا کمرہ بنوالوں گا تاکہ جب آپ اور پاپا بوڑھے ہوں گے اور آپ کو بڑے کمرے کی ضرورت نہیں ہوگی تو پھر مجھے اسٹور روم خالی نہیں کرنا پڑے گا۔" گڈو داد طلب نظروں سے امی کی طرف دیکھ رہا تھا اور ایک لمحے کے لئے ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور جمشید صاحب کے ہاتھ میں چائے کی پیالی کانپ گئی۔

"نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے" گڈو کی امی نے فوراً کہا مگر گڈو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

"مگر مما میں ایک کام نہیں کروں گا۔"

"وہ کیا۔" گڈو کی امی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"مما، آپ کہتی ہیں نا کہ روتے ہوئے لوگ اچھے نہیں لگتے، بس تو پھر میں آپ کی مومی کو اٹھا کر گھر سے باہر نہیں پھینکوں گا کیونکہ پھر دادی اماں کی طرح تین دن تک آپ بھی اپنے کمرے میں بیٹھ کر روتی رہیں گی تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

گڈو کے چہرے پر معصومیت ہی معصومیت تھی۔ گڈو کی امی کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ یکلخت ان کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ جمشید صاحب کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر گئی تھی۔ وہ گڈو کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے شیشے جیسے شفاف ذہن میں جمع ہونے والی حقیقتیں کتنی سچائی کے ساتھ باہر آ رہی تھیں۔ ایکدم وہ اٹھ کر اندر کی طرف چل دیئے۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" گڈو کی امی نے بمشکل کہا۔

"پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے، کہیں اور دیر نہ ہو جائے۔" انہوں نے ایک لمحے کو رک کر جواب دیا اور پھر مڑ کر اندر کی طرف چل دیئے۔ ■

اَلاَرضُ لِلّٰہ

مُحمّد جاوید خالد

کون ومکاں کا
خالق ہے اللہ
بس اس کی شاہی
اونچے فلک کی
اور جو زمیں ہے
گلزار اس میں
جس پر ہے مرتی
مخلوق ساری
اللہ بس ہے
اَلاَرضُ لِلّٰہ

دونوں جہاں کا
مالک ہے اللہ
سچی گواہی
جن و ملک کی
کتنی حسیں ہے
کہسار اس میں
دعویٰ ہے کرتی
کہہ کر "ہماری"
باقی ہوس ہے
اَلاَرضُ لِلّٰہ

رکھتے ہیں اَن بن
کیا مسئلہ ہے
اس پر ہے سب کا
اس پر ہیں مرتے
ہیں بھائی، لیکن
اک دوسرے کے
مارا کسی کو
نوبت یہ آئی
ہوکر زمیں کے
اَلاَرضُ لِلّٰہ

بنتے ہیں دشمن
بس ارض کا ہے
پُرجوش دعویٰ
سازش ہیں کرتے
وہ آگیا دن
خوں کے ہیں پیاسے
خود بھی مرا وہ
اک قبر پائی
احمق کہیں کے
اَلاَرضُ لِلّٰہ

قومیں بھی یوں ہی
میری زمیں ہے
میری زمیں پر
اس سے کدورت
اس سے لڑائی
کوئی یہ کہہ دے
تم سے بھی پہلے
عزم و ارادہ
رکھتے تھے وہ پر
اَلاَرضُ لِلّٰہ

اکثر ہیں لڑتی
سب سے حسیں ہے
کوئی ہو کیونکر
کی ہے ضرورت
لازم ہے بھائی
اندھے سمجھ کے
کتنے یہاں تھے
تم سے زیادہ
آخر گئے مر
اَلاَرضُ لِلّٰہ

شریف آدمی، شریر شاعر

م۔ طاہر مسعود

بھئی یہ جو اپنے عبدالقادر صاحب ہیں نا۔ ارے بھئی وہی جو بچوں کے لئے مزے مزے کی نظمیں لکھتے ہیں۔ اس ہفتے دفتر تشریف لائے تو ہم نے ان سے کہا۔ "جناب! آپ کے لئے نہایت بُری خبر ہے۔" وہ تو یہ سنتے ہی گھبرا گئے۔ بولے "کیوں خیریت تو ہے؟"

ہم نے عرض کیا : "خیریت کہاں۔ اس بار خاص نمبر میں آپ کا انٹرویو شائع کیا جائے گا۔ تیار ہو جایئے۔"

ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نہیں معلوم شرم سے یا خوشی سے۔ نظریں جھکا کر بولے : "میں اس قابل کہاں"۔ واقعی ہمارے عبدالقادر صاحب۔ حیرت انگیز طور پر شریف آدمی ہیں۔ اپنی نظموں میں یہ جتنے شوخ اور شریر نظر آتے ہیں، دیکھنے میں یہ اس کے بالکل برعکس ہیں۔ لیکن ٹھہریئے تو سہی۔ پہلے یہ قصہ سن لیجئے کہ یہ دریافت کیسے ہوئے۔ یہ اب سے چار سال پہلے کی بات ہے۔ ایک دن ہمارے دفتر کے کاتب عارف سعید صاحب نے ایک نظم چھپنے کے لئے دی۔ نظم کا عنوان تھا : "شہزادہ گلفام" اور شاعر تھے عبدالقادر۔ نظم بہت ہی عمدہ تھی۔ چونکہ شاعر کا

نام اس سے پہلے کبھی سنا تھا اور نہ پڑھا تھا اس لئے شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ کہیں سے چوری کی گئی ہے۔ چنانچہ اگلے دن ہم نے عارف سعید صاحب سے کہا : "بھئی یہ آپ کے عبدالقادر صاحب نے تو کسی دوسرے شاعر کے کلام پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ یہ نظم ان کی تو نہیں معلوم ہوتی۔"

عارف سعید یہ سن کے حیران ہوئے، بولے "عبدالقادر صاحب ایسا نہیں کرسکتے وہ بہت بھلے آدمی ہیں۔"

اگلے ہی ہفتے ہمیں عبدالقادر صاحب کا جواب مل گیا۔ انہوں نے اپنے خط میں بڑی سختی سے اس الزام کی تردید کی تھی کہ "شہزادہ گلفام" والی نظم کسی پرانے شاعر کے دیوان سے چرائی گئی ہے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے ایک اور نظم بھی ارسال کر دی تھی۔ یہ نظم بھی نہایت مزیدار تھی۔ چنانچہ اگلے ہی ماہ چھپ گئی......اور

یوں عبدالقادر صاحب رفتہ رفتہ آنکھ مچولی' کے پڑھنے والوں کے محبوب شاعر بن گئے۔ پھر ایک دن وہ دفتر تشریف لائے......ان کے ہاتھ میں خطوط کا ایک بنڈل تھا۔ یہ وہ خطوط تھے جو دفتر آنکھ مچولی سے انہیں وقتاً" فوقتاً" بھیجے گئے تھے۔ ہم نے پوچھا، "ان خطوط کو لانے کی کیا ضرورت تھی" کہنے لگے، "بھئی میں نے سوچا کہ میری پہلی نظم پر آپ کو یقین نہیں آیا تھا کہ یہ میری ہے۔ اب پہلی بار دفتر آنکھ مچولی جا رہا ہوں' کہیں آپ یہ ماننے سے انکار نہ کر دیں کہ میں ہی عبدالقادر ہوں۔ اس لئے احتیاطاً" سارے خط لے آیا۔"

ہم نے جھجکتے جھجکتے کہہ ہی دیا "ویسے آپ شاعر عبدالقادر تو کہیں سے نہیں لگتے" "تو پھر کیا لگتا ہوں؟" انہوں نے پوچھا "بس ایک شریف آدمی" چہرہ لال ہو گیا۔ نظریں جھکا کر کہا، "خیر اب میں اتنا شریف بھی نہیں ہوں۔"

عبدالقادر صاحب ہفتے میں ایک بار دفتر آنکھ مچولی ضرور تشریف لاتے ہیں۔ بچوں کی لکھی ہوئی جو نظمیں ملتی ہیں' ان کی نوک پلک درست کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو پوری نظم بدل جاتی ہے۔

ان سے انٹرویو کرتے ہوئے ہمارا پہلا سوال یہ تھا کہ عبدالقادر صاحب آپ ہمارے قارئین کو کچھ اپنے بارے میں بتائیے........

عبدالقادر صاحب تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گئے۔ پھر بولے، "میرا نام عبدالقادر ہے۔" ہم نے کہا، "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

انہوں نے میری مداخلت کو فراخ دلی سے نظر انداز کرتے ہوئے کہا، "میرے آباؤ اجداد ایک صدی پہلے یمن سے آکر ہندوستان میں آباد ہوئے تھے۔ میں نے وہیں میٹرک پاس کیا اور پھر کراچی آگیا۔ یہاں آکر میں نے سی ٹی کا کورس مکمل کیا اور قوم کی خدمت کے جذبے کے ساتھ سرکاری ثانوی اسکول میں پڑھانے لگا۔ ساتھ ہی حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ایف اے' بی اے' بی ایڈ اور ایم ایڈ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی.... پڑھانے کے ساتھ ساتھ خود پڑھنا ضروری ہے بقول شخصے ایک اچھا استاد وہی ہوتا ہے جو ہمیشہ طالب علم رہنا پسند کرتا ہے۔"

"مگر آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ شاعری کے کوچے میں کیسے داخل ہو گئے۔"

"کیا شاعری کے کوچے میں داخل ہونے پر پابندی ہے؟" انہوں نے مجھے گھورا۔

"میرا مطلب ہے شاعری کیسے کیسے شروع کی آپ نے؟" ہم نے وضاحت کی۔

"ہاں۔ اب بات واضح ہوئی۔" انہوں نے

اطمینان کا سانس لیا۔ "بھئی ہوتا یوں تھا کہ جب اسکول میں کسی کی الوداعی پارٹی ہوتی یا اور کوئی تقریب ہوتی تو میں اپنے خیالات کا اظہار اشعار کی صورت میں کرتا۔ رفتہ رفتہ اس صلاحیت میں ترقی ہوتی رہی۔ میرے احباب مجھ سے رسالوں میں نظمیں چھپوانے کا اصرار کرتے لیکن مجھ پر ہچکچاہٹ اتنی غالب تھی کہ ہمت ہی نہیں ہوتی۔ میں یہی سوچتا کہ کیا میری نظم قابل اشاعت ہوسکتی ہے؟ آخر میں نے بڑی محنت سے ایک طویل نظم "شہزادہ گلفام" لکھی۔ زندگی میں میری پہلی نظم "آنکھ مچولی" کے اگست ۱۹۹۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی جس کا عنوان تھا "مچھر اور بیل" اس سے میری ہمت افزائی ہوئی اور نظموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

"عبدالقادر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ بچوں کے پسندیدہ شاعر ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"آنکھ مچولی کے خطوط کے کالم میں جو مراسلے شائع ہوتے ہیں۔ میں انہیں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں میں قارئین کا بے حد ممنون ہوں کہ وہ میری نظمیں پسند کرتے ہیں۔ علوم اور فنون کی کوئی انتہا نہیں ہوتی میں تو صرف مبتدی ہوں۔ اپنے آپ کو شاعر کہلوانا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ میرے دوست احباب جب مجھ سے کوئی تخلص رکھنے کی بات کرتے ہیں تو میں یہی کہتا ہوں "بھائی مجھے پہلے کچھ بننے تو دو۔ تخلص رکھنے کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔" یہ بات میں کسرنفسی کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ حقیقت بھی یہی ہے۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک بہت بڑے مصوّر کی عمر جب اسّی سال ہوئی تو اس نے کہا "میں نے چالیس سال کی عمر تک جتنی تصاویر بنائی ہیں، ان سب کو جلادو۔ اس کے بعد ستّر سال کی عمر تک کی تصاویر میں سے اچھی تصاویر چن کر باقی کو تلف کردو۔ ستّر سال کی عمر کے بعد والی تمام تصاویر کو محفوظ رکھو۔"

"آپ کی نظموں میں عام طور پر کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے۔ آپ یہ کہانی خود گھڑتے ہیں یا کسی کتاب سے لیتے ہیں؟"

"آنکھ مچولی" میں میری اب تک بیالیس نظمیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے چودہ نظموں میں کوئی کہانی ہے اور باقی نظمیں دوسرے موضوعات سے متعلق ہیں۔ اس طرح کہانی والی نظمیں صرف ایک تہائی ہیں یہ کہانیاں بالعموم میری پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ البتہ میں ان میں کچھ تبدیلیاں بھی کرلیتا ہوں۔

"آپ کو بچوں کے کون کون سے شاعر پسند ہیں اور کیوں؟" ہم نے رسمی سا سوال کیا کیونکہ ایسے سوالات ہر انٹرویو میں کیئے جاتے ہیں۔

وہ سنجیدگی سے بولے " بچوں کے اچھے شاعروں میں سب سے پہلے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا نام ہی زبان پر آتا ہے۔ محمد شفیع نیر، صوفی تبسم، قتیل شفائی اور راجہ مہدی علی خان نے بھی بچوں کے لئے اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ علامہ اقبال نے بچوں کے لئے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ یوں بھی علامہ اقبال کی شاعری سے میں بے حد متاثر ہوں ان تمام شعرا نے بچوں کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی پیاری نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں الفاظ آسان ہیں۔ نظموں میں سادگی ہے اور بحر چھوٹی ہوتی ہے۔

"آنکھ مچولی" میں بچوں کی نظمیں آپ کے پاس اصلاح کے لئے دی جاتی ہیں۔ آپ کو یہ نظمیں کیسی لگتی ہیں؟"

"ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شاعری کی صلاحیت بخشی ہے۔ صرف مناسب رہنمائی کی ضرورت ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔"

"نئے شاعروں کو آپ کیا مشورہ دینا پسند کریں گے؟"

"میرا مشورہ یہی ہے کہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی اس قدرتی صلاحیت کو پروان چڑھاتے رہیں۔ شاعری کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا کام لیں۔ مایوسی کو اپنی شاعری سے بالکل خارج کر دیں۔ چھوٹی بحر میں اشعار لکھیں"

"سنا ہے شاعروں کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اچھا اور بُرا۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ شاعری اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی۔ قرآن مجید کی سورۃ شعرا میں اللہ تعالیٰ نے شاعروں کے بارے میں فرمایا۔

(ترجمہ) وہ (شاعر) لوگ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں۔ اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ ہاں مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کیے اور انہوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا۔"

"سنا ہے بعض اوقات نظم کا اسکیچ اچھا ہو تو کمزور نظم بھی خوب صورت لگنے لگتی ہے۔ آپ کیا کہیں گے؟"

"اسے سو فی صد درست تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ کسی نظم میں خامیاں ہوں لیکن اسکیچ عمدہ ہو تو کافی حد تک اچھا اسکیچ ان خامیوں کی پردہ پوشی کر لیتا ہے"

سوالات تو اور بھی بہت سے تھے لیکن عبدالقادر صاحب تھک گئے تھے۔ ویسے بھی بہت کم بولتے ہیں۔ اس لئے ہم نے اتنی ہی گفتگو کو کافی جانا۔

رونی کی نیکی

سیدہ صدف عرفان

"ہاں بیٹا تم نے اچھا کیا۔ لیکن کوئی نیکی کر کے اس کا اظہار نہیں کیا کرتے۔ سارا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔"

"رونی، رونی بیٹے۔ کہاں ہو تم۔" امی نے رونی کو آواز دی۔ امی کی آواز سن کر رونی نے جلدی جلدی فقیر کو پیسے دیئے اور بھاگ کر اندر آیا۔

"جی امی۔ میں دراصل فقیر کو پیسے دے رہا تھا۔ میری پاکٹ منی میں سے بیس روپے بچے تھے آدھے میں نے فقیر کو دے دیئے میں نے اچھا کیا نا امی؟" رونی نے سوالیہ نظروں سے امی کی طرف دیکھا۔

"ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔" رونی کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر بھول بھال کر اپنے کام میں لگ گیا۔

شام کو وہ اپنے دوست وکی کے ساتھ بازار گیا۔ وکی کو کچھ کتابیں خریدنی تھیں۔

کتابیں خرید کر وہ باہر نکلے تو ایک فقیر سامنے ہی کھڑا بھیک مانگ رہا تھا۔ رونی کو اپنا صبح کا کارنامہ یاد آگیا جسے اس نے من و عن، وکی کو کہہ سنایا۔

رات کو کھانے کی میز پر سامعہ آپی اور نہال بھیا موجود تھے امی، ابو، کی کسی دوست کے گھر دعوت تھی وہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ رونی نے بچی کھچی پاکٹ منی کا قصہ انہیں بھی سنا دیا۔

رونی ایک بہت ہی اچھا، نیک اور سعادت مند بچہ تھا۔ بڑوں کی عزت کرتا۔ چھوٹوں سے پیار سے پیش آتا۔ والدین کا کہنا مانتا۔ روزانہ سبق یاد کر کے اسکول جاتا۔ اساتذہ بھی اس سے بہت خوش تھے۔ ہر بڑا چھوٹا اس کی تعریف کرتا تھا۔ بس اس میں ایک برائی تھی جب وہ کئی اچھا کام کرتا تو اپنی نیکی

فرداً فرداً سب کو بتاتا تھا اور پھر اپنی تعریف سن کر پھولے نہ سماتا۔ آٹھویں جماعت میں وہ اوّل آیا تو ابّو نے اسے کتابوں کا سیٹ، عمدہ اور خوبصورت تحفہ دیا۔ ان میں احادیث اور آیات قرآنی پر مشتمل کتابیں بھی تھیں اور مزیدار سی کہانیاں بھی۔

امتحانوں کے بعد بہار کی چھٹیاں تھیں اور رونی ان ہی کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک روز اس کی نگاہ سے یہ حدیث گزری "نیکی یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے" وہ کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر سامعہ آپی کے پاس جا کر ان سے اس حدیث کا مطلب پوچھنے لگا سامعہ آپی مسکرائیں اور بولیں۔

اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کوئی نیکی کرو، کوئی اچھا کام کرو، کسی کی مدد کرو تو اس طرح کرو کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

بعض اوقات لوگ کسی غریب کی مدد کرتے ہیں اور پھر اس کا چرچا کرتے ہیں اور خوب داد سمیٹتے ہیں حالانکہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے اس طرح اس غریب کی عزت نفس بھی مجروح ہوتی ہے اور مدد کرنے والے کی نیت بھی خالص نہیں رہتی۔ وہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ دنیاوی تعریف اور جھوٹی داد حاصل کرنے کے لئے اس غریب کی مدد کرتا ہے۔ اور بعد میں ہر ایک سے اس کا ذکر کرتا پھرتا ہے تاکہ لوگ اسے تعریف کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس حدیث میں کسی کی مدد کرنے، کسی کو کچھ دینے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی کی مدد کرو تو اتنی خاموشی سے کرو کہ کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو۔ اور بدلے کی امید لوگوں سے نہیں بلکہ خدا سے رکھو۔ یہ بھی درست ہے کہ اچھے کاموں کی ترغیب عمداً اسی وقت ہوتی ہے جب انسان کسی دوسرے شخص کو اچھا کام کرتے دیکھے۔ خالص اور نیک نیتی سے کی جانے والی مدد کے بارے میں لوگوں کو بتایا جا سکتا ہے لیکن اس کی پس پشت تعریف سمیٹنے کا جذبہ نہیں بلکہ لوگوں کو اس کی جانب مائل کرنے کا جذبہ ہونا چاہئے۔

سامعہ آپی نے حدیث کی وضاحت کرنے کے بعد رونی کی طرف دیکھا "اب سمجھ گئے۔"

جی آپی میں سمجھ گیا ہوں، بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ مجھ میں یہ خامی تھی کہ میں کوئی اچھا کام کرنے کے بعد ہر کسی کو اس کام کے بارے میں بتایا کرتا تھا میں چاہتا تھا کہ لوگ میری تعریف کریں لیکن اب میں اس بری عادت سے نجات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔" رونی کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

مجھے امید ہے رونی کہ تم اپنی اس کوشش میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ کیونکہ جو لوگ مسلسل کوشش کرتے ہیں کامیابی ایک نہ ایک دن ان کے قدم ضرور چومتی ہے۔ سامعہ آپی نے رونی کو جو حوصلہ دیا تو رونی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

- دیدہ زیب شادی کارڈز
- بزنس وزیٹنگ کارڈز
- کیلنڈرز
- عید کارڈز
- پروفیشنل پرنٹنگ

کے لیے

ہر قسم کی اعلیٰ اور معیاری پرنٹنگ

شاداب پرنٹرز

دھرم داس بلڈنگ (نزد ایس ایم لاء کالج) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ کراچی فون نمبر: ۲۱۳۸۴۱

شانیہ فرحین

آئی ایم سوری

تازہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہی مس صبا کلاس میں داخل ہوئیں اور اپنی مخصوص مسکراہٹ سے طالبات کی جانب دیکھا۔

"ہاں تو یہ ہے میری نئی کلاس!" انہوں نے ایک طائرانہ نگاہ کلاس پر ڈالی اور دائیں سے بائیں ٹہلتے ہوئے ہر لڑکی کا بغور مشاہدہ کرنے لگیں جب کہ لڑکیوں کی پوری توجہ ان کے سراپے پر تھی۔ آسمانی رنگ کی نفیس سی ساڑھی پہنے ہلکے سے میک اپ اور نازک سی جیولری میں ان کی شخصیت بڑی دلکش لگ رہی تھی۔

"میں کلاس میں نظم وضبط کو پسند کرتی ہوں۔" انہوں نے پچھلی ڈیسک پر بیٹھی دو طالبات کو سر جوڑے باتیں کرتے دیکھ کر کہا اور پھر حاضری کا رجسٹر میز پر رکھ کر طالبات کے نام پکارنے لگیں۔

"تانیہ احمد؟" مس صبا نے آخری نام

پکارا تو دوسری صف میں بیٹھی ہوئی شوخ سی لڑکی نے یس مس کہتے ہوئے اپنے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور پھر اپنے ناخنوں پر لگی کیوٹکس کھرچنے لگی۔

مس صبا نے تانیہ کا بغور جائزہ لیا وہ کہیں سے بھی اور لڑکیوں کی طرح سیدھے سادے حلیے میں نہ تھی بالوں میں بڑا سا شوخ رنگ کا کلپ، کلائی میں رنگ برنگے کڑے، انگلیوں میں چھلّے اور پھر پٹی شوز سے جھانکتے ہوئے آتشی گلابی موزے اور اسی کی ہم رنگ ڈوریاں۔

"طالب علموں کو سادہ رہنا چاہئے اور اپنی تمام تر توجہ تعلیم پر دینا چاہئے۔" مس صبا نے تانیہ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا مگر تانیہ کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا گویا اس پر کچھ اثر ہی نہ ہوا تھا اسی لئے وہ ان سے بے پروا ہو کر کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے میں محو ہو گئی۔

اور پھر کچھ دیر بعد مس صبا نے ریاضی کی مشقیں شروع کروادیں اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تانیہ بلا کی ذہین تھی وہ ہر سوال بڑی آسانی سے یوں حل کر رہی تھی جیسے یہ سب کچھ اس کے لئے کچھ مشکل نہیں جب کہ دیگر لڑکیاں اِدھر اُدھر جھانک کر اور کچھ دماغ لڑا کر مشق حل کرنے میں مشغول تھیں۔

مس صبا تانیہ کی ذہانت کی قائل ہو گئیں لیکن اس کے نت نئے فیشن انہیں ایک آنکھ نہ بھائے۔ کئی دفعہ تو انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے تنبیہہ کی لیکن جب دن گزرتے گئے اور وہ یونہی اپنی روش پر قائم رہی تو انہوں نے بھری کلاس کے سامنے اسے خوب ڈانٹ پلائی۔

"اسکول ایسی جگہ نہیں ہے جہاں فیشن کے لئے جائیں اگر آپ کی ساری توجہ اس پر رہی تو یقیناً پڑھائی میں بھی آپ اپنی سابقہ حیثیت برقرار نہ رکھ سکیں گی اور پھر طالب علم طالب علموں کے روپ میں ہی اچھے لگتے ہیں وہ اگر رنگ برنگ ہو کر اسکول آئیں تو اسکول اسکول نہیں رہتا اور پھر آپ کو تو پوری توجہ اپنی پڑھائی پر دینی چاہئے ---" مس صبا کی اتنی لمبی تقریر کو تانیہ بڑی بے پروائی سے سن رہی تھی۔

"مجھے امید ہے آپ میری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی" مس صبا کا لہجہ ناچاہتے ہوئے بھی سخت ہو گیا تھا اور لڑکیاں ان کا یہ روپ دیکھ کر سہم گئی تھیں اگلی نشست پر بیٹھی صائمہ نے تو اپنے کانوں میں پڑی ہوئی ننھی بالیاں بھی نکال کر بیگ میں چھپالیں صدف نے اپنی انگلی کا نازک سا چھلا یوں چھپایا جیسے مس صبا کی پوری توجہ اس چھلے پر ہو اور پھر کچھ ہی

دیر بعد وہ اپنے لہجے میں خفگی لئے کلاس سے چلی گئیں۔ اب لڑکیاں مس صبا کے بارے میں مختلف چہ میگوئیاں کررہی تھیں۔

"خود بھی تو اتنا بن سنور کر آتی ہیں ہم نے میک اپ کرلیا تو انہیں کھٹکنے لگا۔" تانیہ کی گہری سہیلی رفعت نے تانیہ سے کہا لیکن وہ بالکل خاموش بیٹھی چکن سینڈوچ کھانے میں مشغول تھی۔

پچھلی نشستوں کی لڑکیوں کا موضوع گفتگو بھی تانیہ ہی بنی ہوئی تھی۔ "تانیہ کو واقعی اس روپ میں نہیں آنا چاہیے۔" سعدیہ نے کہا۔ "اور کیا اسکول ایسی آتی ہے جیسے کسی پر تکلف پارٹی میں آئی ہو۔ کل تو محترمہ ہلکی سی لپ اسٹک بھی لگا کر آئی تھیں" فرزانہ نے حنا کے کان میں کہا اور اس طرح پوری کلاس تانیہ کے بارے میں باتیں کرنے میں مشغول تھی۔

کچھ دیر بعد انگریزی کے پیریڈ میں مس صالحہ آئیں تو یہ گفتگو ختم ہوئی اور پھر سب کو تانیہ کا موضوع چھیڑنے کا موقع ہی نہ ملا۔

اگلے روز سب کو مکمل یقین تھا کہ تانیہ کا حلیہ بدلا ہوا ہوگا اور وہ بھی ان سب کی طرح نظر آئے گی مگر یہ دیکھ کر سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تانیہ اور دنوں سے رنگ برنگی نظر آرہی تھی گویا ڈھٹائی کا مظاہرہ تھا۔

پہلا پیریڈ مس صبا ہی کا تھا وہ آئیں اور ان کی نظریں نا چاہتے ہوئے بھی دوسری لائن میں بیٹھی ہوئی تانیہ پر پڑی جو بالوں میں فرنچ ناٹ کے ساتھ گہرے ہرے رنگ کا بڑا سا کلپ لگائے ہمیشہ سے زیادہ سجی ہوئی لگ رہی تھی کیونکہ کلپ کے ہم رنگ بندے بھی کانوں میں جھول رہے تھے۔

مس صبا نے ناگواری سے اس کی جانب دیکھا اور پھر حاضری کے بعد پڑھائی شروع کروادی۔ اِس وقت پیریڈ ختم ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے اور مس صبا کی نظریں مسلسل تانیہ ہی کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"تانیہ کیا آپ کو میری کل کی وارننگ کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔" مس صبا کے لہجے میں غصہ نمایاں تھا۔

"آپ شروع میں کلاس کی ذہین ترین لڑکی تھیں مگر اب آپ کا گراف گرتا جارہا ہے، کیا آپ بتا سکتی ہیں آپ میرے منع کرنے کے باوجود اس حلیے میں کیوں آئیں ہیں شاید نافرمانی آپ کا پرانا شعار ہے ----" مس صبا نے خفگی سے کہا۔

"مجھے میرے سوال کا جواب چاہیئے؟" اسے

خاموش کھڑا دیکھ کر مس صبا نے سختی سے کہا۔

"آپ بھی تو ایسے ہی حلیے میں آتی ہیں۔"

تانیہ نے بڑے اعتماد سے مس صبا سے کہا اور تمام لڑکیاں اس کی اس قدر بے باکی پر کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔یہ حقیقت تھی کہ مس صبا ہمیشہ کی طرح آج بھی خوش رنگ کپڑے پہنے ہلکے سے میک اپ میں تھیں مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ تانیہ ان سے یوں مقابلہ کرتی۔

"تانیہ آپ ابھی کمسن ہیں۔علم کی طالب ہیں اور طالب علموں کو کبھی یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ان حلیوں میں درسگاہوں کا رخ کریں کیونکہ ایسی صورت میں توجہ تعلیم سے ہٹ جاتی ہے آپ بھی جب میرے جتنی ہو کر عملی زندگی میں داخل ہوں تو یقیناً" یہ سب کچھ آپ پر اچھا لگے گا بہرحال اب میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

مس صبا یہ کہتے ہوئے پینسل ہیل کی ٹھک ٹھک کے ساتھ ہی کلاس سے نکل گئیں۔

"ہونہہ بڑی آئیں۔" ان کے جاتے ہی تانیہ نے برا سا منہ بنایا اور اپنی سہیلی رفعت کی طرف رخ کر کے بولی،

"یہ تو میرے پیچھے پڑ گئی ہیں میری مرضی ہے جیسے بھی حلیے میں آؤں۔مجھے تو لگتا ہے یہ میری سج دھج سے جلتی ہیں۔ٹھیک ہے میری مرضی ہے کہ میں فرسٹ آؤں یا نہیں' ان کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے ---" تانیہ بڑبڑاتی جا رہی تھی اور رفعت اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

"لگتا ہے ڈیڈی سے ان کی شکایت کرنی ہی پڑے گی۔" تانیہ نے منہ پھلاتے ہوئے کہا اور لڑکیوں کو اپنے بارے میں گفتگو کرتا دیکھ کر باہر نکل گئی۔

اگلا دن سب کے لئے بڑا حیران کن تھا کیونکہ مس صبا جب کلاس میں داخل ہوئیں تو سفید رنگ کے سادے سوٹ میں بغیر میک اپ اور بغیر جیولری کہ وہ یوں لگ رہی تھیں جیسے وہ مس نہیں بلکہ چھوٹی سی لڑکی ہوں۔تمام لڑکیاں انہیں دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں اور انہیں مس کا یہ روپ ذرا نہ اچھا لگ رہا تھا۔

اور پھر جب وہ حاضری لینے کے لئے سامنے کی نشست پر بیٹھی حنا سے قلم لینے کے لئے آئیں تو سب کو تعجب سا ہوا کہ آج ان کی کلائی میں وہ گولڈن نازک سی گھڑی بھی نہ تھی جو ان پر خوب سجتی تھی لڑکیاں ان سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھیں لیکن ہر کوئی تانیہ جیسا بے باک نہ تھا اور ان سب کے دل میں مس کے

لئے حد درجہ عزت و احترام تھا۔ مس صبا کافی دیر سے ایک دفعہ پھر تانیہ کو دیکھ رہی تھیں جو کلاس پر توجہ دیئے بغیر سپاٹ سا چہرہ لئے دیوار کو گھور رہی تھی اور پھر یکایک ہی کیا ہوا کہ اس کا ہاتھ اپنے سر پر موجود بڑے سے کلپ پر گیا اور پھر بے ساختہ ہی اس نے ہیڈ ڈاؤن کر لیا۔

کچھ دیر تک مس صبا اس کی نشست کے آگے کھڑی رہیں اور پھر اس سے مشق کرنے کو کہا۔ تانیہ نے جو سر اٹھایا تو مس صبا نے دیکھا اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو جھلملا رہے تھے اور وہ یوں سر جھکائے کھڑی تھی جیسے اپنے اس حلیے پر اور مس تانیہ کے بدلے ہوئے روپ پر وہ بہت نادم ہو اور پھر اس نے اپنی غلطی کی تلافی کرنے میں دیر نہ کی اور دھیرے سے بولی

"آئی ایم سوری" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا اپنا کلپ بیگ میں ڈالا اور ڈیسک پر گرے ہوئے اپنے آنسوؤں کو ہاتھ سے یوں صاف کرنے لگی جیسے وہ مس صبا کے دل کا میل صاف کر رہی ہو۔

کیچپ توصرف
AHMED'S
Tomato
Ketchup
AHMED
Tomato Ketchup
احمد
ٹماٹو کیچپ

میری سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی

ملاقات: سلیم خالق

"وہ آیا اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا"۔ یہ بات وسیم اکرم پر پوری طرح صادق آتی ہے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب عمران خان اَن فٹ ہو کر کرکٹ کے میدانوں سے دور تھے۔ پاکستانی ٹیم فاسٹ بولرز کے معاملے میں شدید قحط کا شکار تھی۔ کرکٹ بورڈ نے نئے عمران کی تلاش میں سمر کیمپ لگایا۔ وسیم اکرم اس کیمپ میں گئے اور بولنگ کی۔ ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اس وقت کے چیف سلیکٹر حسیب احسن کی جوہر شناس نگاہوں نے بھانپ لیا۔ یہیں سے وسیم اکرم کی دریافت ہوئی۔ پھر وسیم اکرم نیوزی لینڈ کے دورے پر گئے۔ نیوزی لینڈ کے دورے ہی سے وسیم اکرم کی کامیابیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے اس وقت وسیم اکرم کا شمار دنیا کے بہترین فاسٹ بولر کے طور پر ہوتا ہے۔ ان کے کریڈٹ پر پاکستان کی کئی بڑی کامیابیاں ہیں۔ ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کے فائنل میں بھی وسیم اکرم نے شاندار آل راؤنڈ کھیل کا مظاہرہ کر کے مین آف دی میچ کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ وسیم اکرم آج ایک سپر اسٹار ہیں لیکن اب تک وہ بالکل نہیں بدلے ہیں۔ اور بہت خوش اخلاق ہیں، وسیم اکرم بچوں کو خاصا پسند کرتے ہیں وہ آنکھ مچولی کے سلسلے "آمنے سامنے" کے مہمان بھی بن چکے ہیں۔ ان سے تفصیلی انٹرویو کرنے کے لئے ہم نے وسیم اکرم کے دوست ہر دلعزیز انسان ساجد خان سے رابطہ کیا جنہوں نے وسیم اکرم کے ساتھ ہمارے انٹرویو کے لئے بے حد تعاون کیا۔ ساجد خان نے ہمیں بتایا کہ وسیم اکرم کو جب بھی موقع ملا ہے وہ "آنکھ مچولی" کا مطالعہ ضرور کرتے ہیں۔

وسیم اکرم سے کی گئی گفتگو درج ذیل ہے۔

سوال: وسیم بھائی سب سے پہلے یہ بتائیے کہ بال اور بیٹ سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟

وسیم اکرم: کرکٹ کا شوق مجھے بچپن ہی سے تھا۔ آٹھ سال کی عمر سے میں نے باقاعدہ طور پر بال اور بیٹ سنبھالا اور کرکٹ کھیلنا شروع کی۔

سوال : آپ کے گھروالے آپ کے اس شوق کی حوصلہ افزائی کرتے تھے یا نہیں؟

وسیم اکرم : گھروالے میرے کرکٹ کھیلنے کے بہت خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پڑھو کرکٹ کھیلنے سے کیا ملے گا' مگر جب سمر کیمپ میں ' میں سلیکٹ ہوا تو پہلی بار میرے گھروالوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور میرے والد نے مجھے کراچی جانے کے لئے پی' آئی' اے کا ٹکٹ بنوا کر دیا۔

سوال : فاسٹ بولنگ کی طرف آپ کا رجحان کیسے ہوا؟

وسیم اکرم : بچپن ہی میں لیگ بریک بولنگ کراتا تھا مگر پھر لڑکوں نے میری بولنگ پر چھکے لگانے شروع کئے تو مجھے تشویش ہوئی اور میں نے ان کے توڑ کے لئے فاسٹ بولنگ شروع کردی۔

سوال : آپ نے ابتدائی تعلیم کس اسکول سے حاصل کی؟

وسیم اکرم : میں نے ابتدائی تعلیم لاہور کے کیتھیڈرل اسکول سے حاصل کی ہے۔

سوال : اسکول کے زمانے کا کوئی یادگار واقعہ تو سنایئے؟

وسیم اکرم : کوئی ایسا خاص واقعہ تو یاد نہیں ہے' مگر میری اسکول لائف کے دوران ایک خواہش تھی۔ جو کرکٹ کھیلنے کے بعد پوری ہوئی۔ دراصل ہمارے اسکول میں ایک بورڈ تھا جس پر اسکول کے ایسے طلبا کا نام درج ہوتا تھا جنھوں نے کوئی خاص کامیابیاں حاصل کی ہوں۔ ان میں عمران خان کا نام بھی تھا (عمران نے بھی کیتھڈرل اسکول میں ایک سال تک تعلیم حاصل کی تھی) یہ بورڈ اسکول کے مرکزی حصہ میں نصب تھا۔ اس پر دوسروں کے نام دیکھ کر میں سوچا کرتا تھا کہ کاش اس بورڈ پر میرا نام بھی آجائے اور میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ چند سال قبل میں اپنے اسکول گیا تو میں نے وہاں اس بورڈ پر اپنا نام بھی دیکھا جس سے مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔

سوال : آپ کا بچپن کیسا گزرا شرارتوں میں ڈوبا ہوا یا بالکل سنجیدہ؟

وسیم اکرم : بچپن میں' میں بہت شرارتی تھا ہمارا سات آٹھ دوستوں کا گروپ تھا جس نے اسکول سر پر اٹھا رکھا تھا۔ سارے اسکول کے ٹیچرز ہم سے تنگ تھے۔

سوال : ٹیسٹ کرکٹ میں آپ کی آمد حیرت انگیز طور پر ہوئی ذرا اس بارے میں کچھ بتایئے؟

وسیم اکرم : جی ہاں' واقعی میں ٹیسٹ کرکٹ میں حادثاتی طور پر آیا تھا' دراصل عمران کے ان فٹ ہونے کے باعث ایک سمر کیمپ لگا تھا۔ میں اس میں گیا ادھر حسیب احسن صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے مجھے وہاں سے ہٹا دیا اور انڈر ۱۹

کی ٹیم میں شامل کرادیا، پھر نیوزی لینڈ کی ٹیم کے خلاف سہ روزہ میچ کھیلنے کا موقع ملا جس میں، میں نے مجموعی طور پر ۹ وکٹیں لیں۔ جس کے باعث مجھے ون ڈے میچ کھلایا گیا۔ اس کے بعد نیوزی لینڈ کا جوابی دورہ تھا جس میں سلیکٹرز مجھے نہیں لے جانا چاہتے تھے مگر جاوید بھائی (جاوید میانداد) نے ٹیم میں میری شمولیت پر اپنی شرکت مشروط کردی۔ جس کی وجہ سے میں ٹیم میں شامل ہوا اور ٹیسٹ کیپ حاصل کی۔

سوال : شارجہ میں آپ کا ریکارڈ ہمیشہ شاندار رہا ہے۔ آپ نے وہاں دو دفعہ ہیٹ ٹرک بھی کی ہے۔ جب آپ نے دوسری دفعہ ہیٹ ٹرک کر کے ورلڈ ریکارڈ قائم کیا تب آپ کے کیا تاثرات تھے؟

وسیم اکرم : اس وقت مجھے بالکل بھی ہوش نہیں تھا جب میں نے تیسری وکٹ لی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پورا اسٹیڈیم خالی ہوگیا ہے بس میں اکیلا ہی حیران کھڑا ہوں۔ پھر قریب کھڑے میرے ساتھی اعجاز نے مجھے جھنجھوڑا تب مجھے ہوش آیا۔

سوال : ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کی تاریخی فتح میں آپ کا بھی کافی اہم کردار رہا۔ اس ورلڈ کپ کے بارے میں کچھ بتایئے؟

وسیم اکرم : اس ورلڈ کپ کے ابتدائی میچوں میں ہماری پرفارمنس بہت خراب تھی ہم لوگ بہت دل برداشتہ تھے۔ مگر پھر ہم لوگوں نے Comeback کیا اور پھر کپ جیت کر وطن واپس آئے۔ میرے خیال میں اس فتح میں زیادہ تر حصہ قوم کی دعاؤں کا تھا۔ جس کی وجہ سے ہاری ہوئی ٹیم ورلڈ چیمپئن بنی۔

سوال : آپ کو ون ڈے کرکٹ میں سب سے زیادہ وکٹیں لینے والے بولر کا اعزاز حاصل ہے۔ جب آپ نے یہ ریکارڈ قائم کیا تب آپ کے کیا تاثرات تھے؟

وسیم اکرم : لازمی بات ہے کہ بہت خوش تھا۔ زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ پاکستان کا نام روشن ہوا ہے۔

سوال : آج کل بال ٹیمپرنگ کا تنازعہ چل رہا ہے۔ گورے پاکستانی فاسٹ بولرز کی تمام تر کامیابیوں کو بال ٹیمپرنگ کے مرہونِ منت قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وسیم اکرم : بال ٹیمپرنگ کا ایشو گوروں نے ۱۹۹۲ء میں ہمارے دورہ انگلینڈ کے وقت شروع کیا تھا۔ دراصل ہم لوگ ورلڈ کپ بھی جیتے پھر انگلینڈ کو ان کے ملک میں بھی ہرایا۔ اس سے یہ لوگ بوکھلا گئے اور الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ بال ٹیمپرنگ وغیرہ سب بکواس ہے گیند کو

سوئینگ کرانے کی ہماری تکنیک قانوناً" غلط نہیں ہے۔ ہم گیند پرانی ہونے کا انتظار کرتے ہیں' اور ایک طرف سے گیند کی چمک محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا طریقہ ہے' اس میں ٹیمپرنگ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پاکستان میں وکٹیں اس طرح کی ہیں کہ ہمارے بولرز نے یہ تکنیک سیکھی ہے۔

سوال : آپ کو اچانک قومی کرکٹ ٹیم کا کپتان بنایا گیا پھر اپنے ہی ساتھیوں کی بغاوت کی وجہ سے آپ کو قیادت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اس بغاوت کی وجہ کیا تھی؟

وسیم اکرم : اس بارے میں مجھ سے زیادہ وہ باغی کھلاڑی ہی بتا سکتے ہیں میرے ساتھ ایسا تھا کہ میں لڑکوں کو میرٹ پر کھلاتا تھا' کسی کی سفارش نہیں مانتا تھا۔ اور ڈسپلن کی سختی سے پابندی کراتا تھا' دن میں دو دفعہ پریکٹس ہوتی تھی۔ اس سے لڑکے میرے خلاف ہوگئے کہ میں بہت سخت کپتان ہوں۔

سوال : آج کل قومی کرکٹ ٹیم سخت بحران کی زد میں ہے۔ موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا آپ کو امید ہے کہ ہم ورلڈ کپ کا دفاع کرلیں گے؟

وسیم اکرم : جی ہاں' کیوں نہیں کرسکتے۔ بس اس کے لئے ہمیں ابھی سے پلاننگ کرنی پڑے گی۔ ابھی سے ایک اسکواڈ بنانا ہوگا۔ اور کھلاڑیوں کو گروم کرنا ہوگا۔ ان کو تجربہ حاصل ہوگا ورلڈ کپ میں اچھی کارکردگی دکھائیں گے۔

سوال : آپ میں ایک بات میں نے نوٹ کی ہے کہ اتنے بڑے کرکٹر ہونے کے باوجود آپ کا رویہ اپنے پرستاروں اور دیگر افراد کے ساتھ کتنا اچھا ہے؟

وسیم اکرم : کھلاڑی کو خواہ کتنا بڑا ہو اپنا رویہ تبدیل نہیں کرنا چاہئے۔ کرکٹ ساری عمر نہیں کھیلنا ہے۔ ریٹائر بھی ہونا ہے' اس لئے اپنا رویہ ایسا رکھنا چاہئے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی لوگ آپ کی عزت کریں۔

سوال : وسیم بھائی کیا بات ہے آج کل بیٹنگ میں پہلے والی بات نہیں رہی ہے۔ چھکے بھی نہیں لگ رہے ہیں؟

وسیم اکرم : دراصل بولنگ کی وجہ سے بیٹنگ پر توجہ کم دے رہا تھا۔ اب پریکٹس شروع کی ہے۔ انشاء اللہ بیٹنگ بھی اچھی ہوگی۔

سوال : ون ڈے کرکٹ میں سب سے زیادہ وکٹیں لینے والے بولر کا اعزاز تو آپ حاصل کرچکے اب آئندہ کے کیا ارادے ہیں؟

وسیم اکرم : کوئی ایسا خاص پروگرام نہیں ہے۔ میں ریکارڈز کے لئے نہیں بلکہ اپنے ملک کے لئے کھیلتا ہوں' اگر اس دوران کوئی ریکارڈ ٹوٹ گیا تو اچھی بات ہے۔

سوال : ٹیسٹ کرکٹ میں کپیل دیو کا سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے والے بولر کا ریکارڈ کب تک توڑنے کا ارادہ ہے۔

وسیم اکرم : پھر وہی بات آجاتی ہے کہ میں ریکارڈز کے لئے نہیں کھیلتا ہوں۔ ویسے بھی ابھی میری کپیل دیو سے بہت کم وکٹیں ہیں، ابھی سے میں کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہتا اگر خدانخواستہ پورا نہ ہوا تو شرمندگی ہوگی۔

سلیم خالق : اچھا وسیم بھائی آنکھ مچولی کے قارئین کے لئے کوئی پیغام دیں گے؟

وسیم اکرم : کیوں نہیں۔ میرا پیغام یہ ہے کہ علم حاصل کریں، ساتھ ساتھ آپ کا جو شوق ہے وہ بھی پورا کریں۔

خورشید احمد منظوری

اُڑتا اُڑتا مِلا چراغ
جس میں بتی، تیل نہ آگ
شعلہ ہے چنگاری ہے وہ
چنگاری بھی پیاری ہے وہ
ظاہر ہے گمنام نہیں ہے
بجھنا اس کا کام نہیں ہے
دن کو غائب ہو جاتا ہے

روشنیوں میں کھو جاتا ہے
نازک نازک جان ہے اس کی
جلنا ہی پہچان ہے اس کی
بچوں کو خوش کرنے والا
جینے والا، مرنے والا
کاریگر کے ہم قربان!
ڈبیّے میں جس نے ڈالی جان

میرا دوست ولید

عابد سلطان

ولید بہت دلچسپ لڑکا ہے ــــ وہ میرا گہرا دوست ہے لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ وہ بہت چالاک، چنچل اور شرارتی ہے۔ وہ بہت ذہین ہے اور بے شمار کتابیں پڑھتا رہتا ہے۔ ہم اسے کتابی کیڑا کہتے ہیں۔ خاص کر اردو اور انگریزی مہماتی، جاسوسی اور پراسرار کہانیاں وہ بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔ میں کل تک اسے ایک عام سا دلچسپ لڑکا سمجھتا رہا لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک عام لڑکا نہیں ہے۔ وہ بہت بڑا اور بہت گہرا لڑکا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دن پی ٹی کے پیریڈ میں میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور میں پی ٹی آئی کی اجازت سے گراؤنڈ سے اپنے کلاس روم میں چلا آیا۔ سارے لڑکے گراؤنڈ میں پی ٹی کر رہے تھے اور کلاس خالی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں کلاس میں داخل ہوا میں نے ولید کو سلیم کے اسکول بیگ کی تلاشی لیتے ہوئے پایا۔ ''کیا ولید سلیم کے بیگ سے کچھ چُرا رہا ہے؟ ولید اور چوری؟ اور وہ بھی بیچارے سلیم کے بیگ سے جس کا باپ ایک مِل میں مزدور ہے اور بمشکل اس کے اسکول کے اخراجات برداشت کرتا ہے؟'' یہ سوچ کر مجھے ولید سے

بہت نفرت محسوس ہوئی لیکن میں فوراً ہی دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ ولید کو پتہ چل جائے کہ میں نے اسے چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ ذرا دیر بعد ولید کلاس سے باہر نکلا اور گراؤنڈ کی طرف چلا گیا۔

میں سارا وقت اس واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔ "ولید شرارتی ضرور ہے لیکن کیا وہ چوری بھی کر سکتا ہے!" مجھے ولید پر بہت غصہ آ رہا تھا لیکن بہر حال وہ میرا دوست تھا اور میں نے کلاس ٹیچر یا کسی اور کو اس واقعے کے بارے میں نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ولید ہمارے اسکول میں چور بدنام ہو اور سب اس پر ہنسیں۔

گھر جا کر میں نے سوچا کہ "اپنے دوست کا راز راز رکھنا اور اس کی غلطیوں پر پردہ ڈالنا اچھی بات نہیں۔ لیکن آخر سلیم بھی تو ہمارا کلاس فیلو ہے۔ وہ بیچارا غریب بھی بہت ہے۔ میں اپنے دوست کی ایک بُری حرکت پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کا نقصان کیوں ہونے دوں؟ کیا یہ شرافت ہے؟"

میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل اسکول جاتے ہی میں سلیم سے باتوں باتوں میں یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ اس کی کوئی چیز تو گم یا چوری نہیں ہوئی ہے اور واقعی ایسا ہے تو پھر مجھے ولید سے بات کرنا پڑے گی۔ میں ٹیچر یا کسی اور کو بتا کر ولید کو بے عزت نہیں کروں گا البتہ اکیلے میں اسے ضرور سمجھاؤں گا۔

اگلے دن میں صبح سویرے ہی اسکول پہنچ گیا۔

اسکول کھلنے میں ابھی بہت دیر تھی اور بہت کم لڑکے اسکول پہنچے تھے۔ میں کلاس میں بیگ رکھ کر سلیم سے ملنے گراؤنڈ کے سرے پر کھڑے سرو کے ایک پرانے درخت کی طرف چلا۔ یہ سلیم کی مخصوص جگہ تھی۔ سلیم اسکول آتا تو باقی لڑکوں کی طرح پلے گراؤنڈ میں کھیلنے کودنے یا پھر کینٹین سے کچھ خرید کر کھانے کی بجائے گراؤنڈ کے دوسرے سرے پر کھڑے اس سرو کے درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہو جاتا اور خاموشی سے اسکول کے لڑکوں اور لڑکیوں کو کھیلتے، ہنستے اور کھاتے دیکھا کرتا۔ میں جب بھی اسے پلے گراؤنڈ یا کینٹین چلنے کو کہتا تو وہ مسکرا کر ٹال دیتا۔ مجھے اس کے اس رویئے پر حیرت ہوتی۔ پھر مجھے اس کا سبب معلوم ہو گیا۔ ولید ہی نے مجھے سلیم کے اس عجیب رویئے کا سبب بتایا۔ ایک دن جب میں نے ولید سے پوچھا کہ "آخر سلیم اس درخت کے نیچے اکیلا اور خاموش کھڑا ہو کر باقی لڑکوں اور لڑکیوں کو کیوں دیکھتا رہتا ہے؟ وہ ہماری طرح کھیلتا کودتا اور ہنستا کیوں نہیں؟ آخر وہ پلے گراؤنڈ اور کینٹین جانے سے اس قدر کتراتا کیوں ہے؟" تو ولید نے میری طرف غور سے دیکھا، پھر سلیم کی طرف دیکھا، جو اس وقت بھی حسب معمول سرو کے درخت کے نیچے اکیلا کھڑا گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر ولید نے رازدارانہ لہجے میں جواب دیا، "بات یوں ہے عابد...... کہ سلیم ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا باپ کپڑے کی ایک مل میں معمولی اجرت پر مزدوری کرتا

ہے۔ جس میں بمشکل ان کے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ وہ سلیم کو کینٹین میں سموسے پیسٹریاں اور کریم رول خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے دے؟ کھیلنے کے لئے اسے بیٹ، بال اور جوگرز کہاں سے خرید کر دے۔ وہ بیچارا تو اس کی فیس بھی بڑی مشکل سے ادا کرتا ہے۔ سلیم بیچارے کے پاس پیسے نہیں ہوتے اس لئے وہ کینٹین جانے سے کتراتا ہے اور چونکہ اس کی یونیفارم پھٹی پرانی اور خراب ہوتی ہے اور اس کے پاس جوگرز بھی نہیں ہیں اس لئے وہ باقی لڑکوں کے ساتھ پلے گراؤنڈ میں کھیلنے سے شرماتا ہے کہ وہ اس کے یونیفارم اور جوتوں پر ہنسیں گے۔ اب سمجھ میں آئی بات؟ بڑے سراغرساں بنے پھرتے ہو۔ اپنے کلاس فیلو تک کے گھر کا حال تو معلوم نہیں۔" ولید نے اپنی سنجیدہ بات کو آخر میں مزاح کا رنگ دینا چاہا لیکن ہم دونوں ہی بہت اداس سے ہو گئے تھے۔

میں گراؤنڈ پار کرتے ہوئے یہ ساری باتیں سوچتا رہا اور رہ رہ کر مجھے ولید پر غصہ آرہا تھا کہ آج وہی ولید سلیم کے بیگ سے چوری کر رہا ہے جو کل مجھے بہت دکھی انداز میں اس کا حال بتا رہا تھا۔

سرو کے درخت کے پاس آکر میں نے دیکھا کہ خلاف معمول آج سلیم وہاں نہیں تھا "شاید وہ آج اسکول نہ آیا ہو۔ کسی بیماری کی وجہ سے یا شاید ...." میں سوچتے ہوئے واپس مڑا اور کلاس کی طرف جانے لگا۔ اچانک میں نے ولید کی پرجوش آواز سنی "کیچ اٹ سلیم۔" اور پھر سلیم کی جوش سے لبریز چیخ سنائی دی "ہاؤاز دیٹ؟"

میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ ہمارے کلاس فیلو کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ولید کی بال پر ساجد نے زور کا شاٹ مارا تھا لیکن باؤنڈری لائن کے قریب ہی سلیم نے ایک مشکل کیچ لے کر ساجد کو آؤٹ کر دیا تھا اور اپنی ٹیم کو جتوا دیا تھا۔ سارے لڑکے ولید اور سلیم کے گرد جمع ہو کر انہیں اچھی باؤلنگ اور اچھی فیلڈنگ کی داد دے رہے تھے۔ اور وہ دونوں پُرجوش انداز میں مسکرا رہے تھے۔ "سلیم اور کرکٹ؟" میں حیران رہ گیا۔ "یہ کیا ماجرا ہے؟" اتنے میں گھنٹی بجی اور سارے لڑکے اسمبلی کے لئے بھاگے۔ میں ان کے پاس بھی گیا لیکن دور ہی سے دیکھ لیا کہ سلیم نے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح نئی یونیفارم اور نئے جاگرز پہنے ہوئے ہیں۔ "یہ کیا معمہ ہے؟" میں سوچتے ہوئے اسمبلی کی طرف چلا۔

کلاس میں، میں کبھی ولید کی طرف دیکھتا جسے میں نے کل اپنی آنکھوں سے چوری چھپے سلیم کے بیگ کی تلاشی لیتے ہوئے دیکھا تھا اور کبھی سلیم کی طرف دیکھتا جس نے آج خلاف معمول نئی یونیفارم اور نئے جوگرز پہن رکھے تھے اور بہت خوش اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

ریس کے دوران میں نے سلیم سے علیحدگی میں پوچھا "یار سلیم، کل تمہاری کوئی چیز تو گم یا

ملکہ کی خواہش

انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم نے اپنے ملکہ کی خواہش کے مطابق اس کا طوطا کیمیائی طریقے سے محفوظ کر دیا تھا جو آج تین سو سال گزرنے کے باوجود بھی لندن کے ویسٹ منسٹر میوزیم میں موجود ہے۔

مرسلہ...... شان محمد بٹ۔ وزیر آباد۔

چوری نہیں ہوئی؟ میرا مطلب ہے تمہارے بیگ سے کوئی چیز تو غائب نہیں ہوئی؟"

سلیم نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور کہا، "ہاں، ہاں، میری ڈائری گم ہو گئی تھی، کیوں؟"

میرے بولنے سے پہلے ہی ولید بول پڑا، "یار وہ میرے پاس ہے۔ آج صبح میں کلاس میں آیا تو ادھر ہی ٹیچر کی میز کے نیچے پڑی تھی۔ شاید تم رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ میں ابھی لا کر دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ولید اپنی ڈیسک کی طرف چلا گیا۔

"ڈائری کے علاوہ تو کچھ گم نہیں ہوا؟" میں نے پھر سلیم سے پوچھا۔

"نہیں، نہیں تو، کیوں؟" وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"یہ لیں اپنی ڈائری، یہی ہے نا؟ جناب اسے سنبھال کر رکھئے، کتنے خوبصورت پھولوں کے پتے جمع کر رکھے ہیں آپ نے ان میں، اگر گم ہو جاتی تو؟ اچھا ہوا کہ مجھے مل گئی؟" ولید نے ڈائری سلیم کو تھماتے ہوئے کہا۔

"کیا کچھ ہے اس ڈائری میں؟" میں نے سلیم سے سوال کیا۔

"یہ کیا سوال ہوا بھئی؟ ڈائری میں کیا کچھ ہوتا ہے؟ یعنی روزنامچہ لکھا ہوا ہے، چند دوستوں اور والد صاحب کے مل کا ایڈریس ہے اور کچھ معلومات عامہ کے......"

"اچھا جناب میں تو چلا پلے گراؤنڈ............ سلیم، آپ اس دیسی شرلاک ہومز کے بے سروپا سوالات کے جوابات دیتے رہئے۔" یہ کہہ کر ولید کلاس روم سے باہر چلا گیا۔

نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ جب سلیم بتا رہا تھا کہ اس ڈائری میں اس کے والد صاحب کے مل کا ایڈریس ہے تو ولید کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اور جب میں نے ولید کے اس ردعمل پر سوچا تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھ پر ولید کی کل والی "چوری" کی حقیقت منکشف ہو گئی ہے۔

ولید کا گھر ہمارے گھر کے قریب ہی ہے۔ شام کو میں اس کے ہاں گیا۔ اس کی امی نے بتایا کہ وہ اس وقت اپنے کمرے میں یوگا کی ورزش کر رہا ہو گا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے ولید کی آواز آئی۔ "کیا ہے۔ کم اِن۔"

میں نے دروازہ کھولا تو ولید کمرے کے درمیان میں قالین پر سر کے بل کھڑا تھا۔

یہ ہفتہ کیسا رہے گا

سیما صدیقی

سیاہ رنگ منحوس ثابت ہو گا...... یہ جملہ میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ میرا دھیان اسی قسم کی پیش گوئیوں میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک میرا پاؤں کیسی پلپلی چیز پر پڑا اور میں اچھل پڑا یہ ایک سیاہ کتے کی سیاہ دُم تھی۔ کتا اپنی سیاہ دُم کی نحوست سے بے خبر سو رہا تھا مگر میرا پاؤں پڑتے ہی گویا اسے کرنٹ لگ گیا وہ بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرے پیچھے لگ گیا۔ وہ میرے ہی محلے کا کتا تھا مگر اس سے قبل میں نے اس کی نحوست پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ میں اس کے بھیانک اثر سے دور نکلنا چاہتا تھا مگر جلد ہی اس نے مجھے جا لیا۔ اب میری پینٹ کا ایک پائنچہ اس کے منہ میں تھا۔ پہلے اس نے دانتوں سے میری پتلون کا ایک چیتھڑا الگ کیا اور پھر ناخنوں سے ہلکا سا کھرونچہ مار کر مطمئن انداز میں سرہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔

ٹانگ بچی سو لاکھوں پائے کہ مصداق میں نے پتلون پھٹنے کا غم نہ کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا قریب ہی واقع قصائی کی دکان کی جانب مڑ گیا۔ کیونکہ میں

گوشت لینے ہی گھر سے نکلا تھا۔
"بھائی ذرا جلدی سے دو کلو قیمہ اور ایک عدد پھیپھڑا تول دو!" مجھے اپنی پنڈلی میں ہلکی سی جلن محسوس ہونے لگی تھی، میری کوشش تھی کہ قصائی کی نظر میری نچی ہوئی پتلون پر نہ پڑے۔ قصائی نے ایک پھیپھڑا اٹھایا اور ترازو میں رکھ دیا۔
"بھائی میاں! یہ کلو سے زیادہ، دے دوں؟" میں نے چونک کر پھیپھڑے پہ نظر ڈالی تو دھک سے رہ گیا۔ اس کے کناروں سے سفید جھاگ رستا ہوا محسوس ہوا۔
"یہ ...... یہ کیا ...... یہ جھاگ کیسا ہے! یہ پھیپھڑا تو سڑ چکا ہے ...... دیکھو تو سہی جھاگ نکل رہا ہے ...... زہریلا!"
قصائی نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا اور بولا.
"ارے نیئں صاب! یہ تو ڈیٹرجنٹ پاؤڈر کا جھاگ ہے ...... میں نے ابھی ابھی کلیجی پھیپھڑے دھوئے ہیں!"
"ہائیں تم کہیں پاگل تو نہیں ہوگئے ...... تم نے پھیپھڑے ڈیٹرجنٹ سے دھوئے ہیں؟"
"کیوں صاحب! کیا صفائی نصف ایمان نہیں!"
"وہ تو ہے ...... مگر ......!"
"مگر کیا ...... خون جمنے سے گوشت ذرا کالا پڑ جائے تو گاہگ لوگ نخرا کرتا ہے۔ اب تو دیکھو دھل دھلا کر کیا گلابی گلابی نکل آیا ہے ...... اور یہ تم کہاں ٹپک پڑے ...... صبح صبح منگ ماری کرنے!"
قصائی کی جھک جھک سے طبیعت مزید مکدر ہوگئی اور میں کچھ کہے بغیر پلٹ گیا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ہفتہ واری پیش گوئی کے مطابق آج کا دن بھی بہت منحوس ہے۔ گوشت لئے بغیر گھر پہنچنے پر امی کے غصے کی صورت نحوست کا گراف مزید اوپر جانے کی توقع تھی۔ گھر پہنچا تو امی نے پوچھا۔
"ارے! یہ کیا خالی تھیلا جھلاتے ہوئے چلے آرہے ہو ...... گوشت کہاں ہے؟" پھر اچانک ان کی نظر میرے پھٹے ہوئے پائنچے اور کھرونچے لگی پنڈلی پہ پڑی تو وہ حیران رہ گئیں۔
"ارے ...... یہ کیا ...... بیٹا، میں نے تمہیں گوشت "لینے" بھیجا تھا یا "دینے" یہ کس سے ٹانگ ادھڑوا آئے ہو۔"
امی کو پورا واقعہ سنا کر میں نے اپنے کمرے میں جا کر کنڈی چڑھالی ...... اور فیصلہ کر لیا کہ آج سارا دن کمرے میں بند ہو کر گزاروں گا۔ امی کی ساری ہدایات کمرے کے باہر رہ گئی تھیں۔
ابھی میں کپڑے بدلنے کے بعد "زخم" دھو کر ڈیٹول لگا ہی رہا تھا کہ کال بیل چیخ اٹھی اور میرا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا ...... کہیں کوئی منحوس خبر، کوئی منحوس تار تو نہیں آگیا ...... میں دم سادھے بیٹھا رہا ...... زخم پہ ڈیٹول لگتے ہی پنڈلی میں محسوس ہونے والی جلن میں اضافہ ہوگیا اسی اثنا میں میرے دروازے پہ دستک ہوئی، میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ وہاں میرا دوست شاہد کھڑا

مسکرا رہا تھا۔ ہفتہ واری پیش گوئی کا ایک اور جملہ میرے ذہن کی دیواروں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

"دوست نما دشمن سے ہوشیار رہیں!" میں اس وقت سے ذہن پر زور دے رہا تھا کہ آخر ایسا دوست کون ہو سکتا ہے مگر آج کے منحوس دن صبح صبح شاہد کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ یہی وہ دوست نما دشمن ہے مگر اس سے ہوشیار رہنا ازخود دشوار تھا کیونکہ یہ تو ہفتہ میں دو تین مرتبہ آدھمکتا تھا۔ آخر میں، کب تک ہوشیار رہتا۔ وہ میرے کمرے میں گھس آیا۔ اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا میں بستر پر بیٹھا تو اس نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر بشاشت سے پوچھا۔

"کیوں بھئی کیا حال ہیں؟"

مگر میں تو گم صم بیٹھا اس کے "وار" کا انتظار کر رہا تھا۔ امی نے میری غیر معمولی خاموشی سے گھبرا کر کہا۔

"بیٹا شاہد! تم بیٹھو میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

شاہد نے فوراً کہا۔

"ارے نہیں آنٹی ...... میں ذرا جلدی میں ہوں، آج چھٹی ہے نا! سوچا کیوں نے ہم دونوں ساحل سمندر کا ایک چکر لگا آئیں!"

اس وقت مجھے شاہد کی آنکھوں میں دشمنی کی چمک واضح طور پر محسوس ہوئی اور میں نے دل میں سوچا میں خوب سمجھ رہا ہوں میرے دوست نما دشمن کہ پروگرام سیر کا ہے یا مجھے ڈبونے کا! زیادہ چالاکی دکھانے کی ضرورت نہیں ـــــ شاہد نے مجھے ایک زور دار ٹھوکا دیا۔

"ارے یار اٹھتے ہو یا نہیں!"

"نہیں بھائی! میری طبیعت ٹھیک نہیں ـــ تم چلے جاؤ ـــ میں نے بیزاری اور بے مروتی کا مظاہرہ کیا۔ مگر وہ بھی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا۔ کچھ اثر نہ لیا اور بولا۔

"اچھا چلو تو پھر فٹافٹ چابی نکالو...... میں کسی اور کے ساتھ چلا جاؤں گا۔"

شاہد اکثر و بیشتر میری موٹر سائیکل استعمال کرتا رہتا تھا اور میں نے کبھی انکار نہیں کیا تھا، مجبوراً میں نے تکیے کے نیچے سے چابی نکالی اور اسے تھما دی۔

ابھی اسے گئے بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ پھر گھنٹی بجی۔ امی مصروف تھیں لہٰذا مجھے دروازہ کھولنا پڑا۔ دروازہ کھولتے ہی میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میری موٹر سائیکل سامنے کھڑی تھی مگر میں اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے تھے اور ہینڈل ٹیڑھا ہو کر پچک گیا تھا۔ سائیکل کے ساتھ ہی وہ دوست نما دشمن کھڑا تھا۔ بظاہر بڑا نادم اور حواس باختہ دکھائی دے رہا تھا مگر ظاہر ہے اندر ہی اندر تو بہت خوش ہو گا، کہ میں نہ سہی میری موٹر سائیکل ہی سہی کہنے لگا۔ "ارے یار! بالکل سیدھا جا رہا تھا...... رفتار بھی کم تھی ...... پتہ نہیں کیا ہوا ...... اچانک موٹر سائیکل لہرائی اور کھمبے سے ٹکرا گئی...... مجھے خود بھی

حیرت ہو رہی ہے کہ آخر ہوا کیا...... نہ جانے صبح صبح کس منحوس کا منہ دیکھ لیا تھا۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے!" میں دل ہی دل میں تلملایا۔ "حیران تو جب ہوتے جب کھمبا پھدک کر سڑک پر آ جاتا اور لہرا کر موٹر سائیکل سے ٹکرا جاتا۔ میں خاموش تھا مگر میرے دماغ کا میٹر تیزی سے گھوم رہا تھا اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دشمن مجھ پر اس طرح وار کرے گا اور ڈھٹائی تو دیکھو کہ مجھے ہی منحوس قرار دے رہا تھا کیونکہ صبح صبح موٹر سائیکل مانگنے کے لئے میرا ہی منہ تو دیکھا تھا، مجھے مسلسل خاموش دیکھ کر دوست نما دشمن سٹپٹا گیا اور موٹر سائیکل دروازے پر چھوڑ کر الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

شام کو ابو آئے تو مجھ سے پہلے ہی امی نے سارا قصہ ان کے گوش گزار کر دیا۔ ابو نے کہا"یہ تو بہت اچھا ہوا کہ موٹر سائیکل خود ہی جواب دے گئی۔ اب کم از کم یہ لڑکا گھر میں ٹک کر تو بیٹھے گا جب سے موٹر سائیکل دلائی تھی، موصوف ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ ذرا کتابیں لے کر ادھر تو آنا، امتحان سر پہ ہیں، دیکھوں تو سہی تم نے ٹیوٹر صاحب کے ساتھ مل کر کیا تیر مارا ہے؟" ابو کا پارہ چڑھا دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں مزید پھول گئے۔ ابو کو سال میں ایک آدھ بار ہی میری پڑھائی کا حال معلوم کرنے کا خیال آتا تھا اور وہ دم علم نجوم کی پیش گوئی کے بغیر ہی منحوس ثابت ہوتا تھا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا......

"ابو آج کا دن میرے لئے بڑا منحوس ہے ...... آپ کل میرا ٹیسٹ لے لیجئے گا۔"

"کیا!! دن منحوس ہے! بیٹا اگر پڑھائی سے غفلت کا یہی عالم رہا تو رزلٹ کا دن اس سے بھی زیادہ منحوس ثابت ہو گا، نکالو ...... کتابیں ...... فوراً!"

میری آنکھوں میں بھر آنے والے آنسو بھی ابو کا دل موم نہ کر سکے۔ رات گئے تک جاری پے در پے آزمائشوں کا حتمی نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ دنیا کی کوئی طاقت میرا حساب کا پرچہ کلیئر (Clear) نہیں کرا سکی، کیونکہ میری حساب کی تیاری زیرو اعشاریہ صفر صفر تھی۔ ابو کی ڈانٹ پھٹکار کا ڈوز پیتے ہوئے اچانک مجھے ایک خیال سوجھا۔ میرے ستاروں کے ہفتہ واری پروگرام میں لکھا تھا کہ اس ہفتے سفر میرے لئے کامیابی کی نوید لے کر آئے گا۔ چنانچہ میں نے ابو سے کہا۔

"ابو! آپ کے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا...... سر کا بھی حساب سمجھانے کا طریقہ کچھ ایسا ہے جیسے وہ مجھے نہیں "آئن اسٹائن" کو پڑھا رہے ہوں۔ کیوں نہ میں ماموں کے پاس حیدر آباد چلا جاؤں۔ ہفتہ دس روز میں میری حساب کی تیاری کرا دیں گے۔" اسکول کی چھٹیاں تھیں اور امی کی سفارش بھی، لہٰذا ابو نے جانے کی اجازت دیدی۔ خوشگوار اور مبارک سفر کے خیال سے ہی مجھ پر سرشاری طاری ہونے لگی۔

مگر حیدر آباد جاتے ہوئے کوچ میں میری جیب کٹ گئی۔ جیب کترے کا تعلق شاید "جدی" اسٹار سے رہا ہو۔ کیونکہ اسی ستارے کے متعلق میں نے پڑھا تھا کہ ان کی آمدنی میں "غیر معمولی" اضافے کا امکان ہے۔ میں لٹا پٹا حیدر آباد پہنچا تو مزید ایک جھٹکا لگا۔ ممانی نے بتایا کہ ماموں ایک ہفتے کے لئے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ممانی کے ایک کزن البتہ ان دنوں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ممانی نے کہا "اچھا ہوا تم آ گئے، فضل بھائی اکیلے بور ہو رہے تھے۔ تم ان کو ذرا کمپنی دے دینا۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں...... شاعر بھی ہیں...... دو چار نظمیں سن لو گے تو خوش ہو جائیں گے!"

اسی اثنا میں فضل انکل آ گئے۔ رسمی تعارف اور سلام دعا کے بعد بولے۔

"کیوں بھئی شعر و شاعری سے کچھ دلچسپی ہے؟" دل میں آیا کہ اپنے کان کی جانب اشارہ کر کے کہہ دوں کہ "جی نہیں بہرہ ہوں!" مگر ممانی کا حکم ذہن میں تھا لہٰذا چپ رہا۔ اور انہوں نے میری خاموشی کو نیم رضا مندی سمجھتے ہوئے کہا۔

"میں آج کل بالکل نئی طرز کی آزاد نظمیں لکھ رہا ہوں۔ کہو تو سناؤں۔"

میں نے اثبات میں سرہلا دیا، مگر بعد میں بہت پچھتایا...... کیونکہ ان کی نظمیں آزاد ہی نہیں بے لگام بھی تھیں۔ نہ کوئی سر نہ پیر! ویسے بھی مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ تین دن تک اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے، سوتے جاگتے انہوں نے مجھے مسلسل تختہ مشق بنائے رکھا۔ انکل کا خیال تھا کہ وہ عہد حاضر کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ جو کچھ وہ مجھے سناتے رہے تھے وہ یقیناً ایک ابھرتے ہوئے شاعر کی ڈوبتی ہوئی شاعری ہی معلوم ہوتی تھی۔ میرا اور انکل کا بستر مہمان خانے میں لگایا گیا تھا۔ رات کو میں بستر پہ چادر تان کے لیٹا ہی تھا کہ انکل بولے، ہاں بھئی آج ایک نظم اور جواب نظم سنو!

"اوہ انکل! یہ آپ اپنی نظموں کا جواب لکھتے ہیں۔" میں درد سے کراہا۔

"برخوردار! یہی تو ہے میرا منفرد انداز...... میرا مجموعہ سوال و جواب شائع ہو گا تو ادبی دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا اور ہاں اسے ابھی سے کراچی جا کر "لیک آؤٹ" نہ کر دینا۔"

"نہیں انکل! کراچی میں پہلے ہی کیا کم دہشت ہے، جو میں آپ کی شاعری بھی لیک آؤٹ کر دوں۔" میں زیر لب بڑبڑایا مگر انکل نظم سنانے میں مگن ہو چکے تھے۔

"ہیں مجھ میں بند
کتنے غم
جانے تو کوئی کیسے
میری نظم
پڑھتا ہی نہیں کوئی
آخر
تم سب

شاعری سے اس قدر
الرجک ہو کیوں!
خطا کیا ہے شاعری
کی
یہ تو بتا دو
شاعر کا غم
کس طرح ہو کم!"
لو بھئی اب اس کا مختصر مگر پر اثر جواب سنو!
"اگر
تمہارے اندر
گر رہا تھا
غم، قطرہ قطرہ
تو
تم نے
کیوں نہیں کئے
نل بند!!"

میں دل میں پچھتا رہا تھا کہ ابو کی ڈانٹ پھٹکار سے بچنے کے لئے راہ فرار کیوں اختیار کی۔ اس شاعری کو سننے سے بہتر تھا کہ میں ابا کے جوتے کھا لیتا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"انکل! تھوڑی بہت شاعری تو میں بھی کر لیتا ہوں۔ سناؤں ایک نظم...... آپ کو تو بہت دلچسپی ہے نا شعر و شاعری سے۔"

انکل کا منہ بن گیا۔ لیکن میں بھی جان چکا تھا، کہ خون کے بدلے خون، آنکھ کے بدلے آنکھ، اور شعر کے بدلے شعر ہی صحیح انتقام ہے۔ مجھے انکل پر ذرا رحم نہ آیا...... "ہوں تو سنیئے جناب...... نظم کا عنوان ہے "ظالم چچی!"

اچھی نہ تھی
میری
ظالم چچی
اس کے سدھرنے کا نہیں
تھا امکاں کوئی
پھر اچانک
بیماریوں نے گھیرا اسے
میرے خون کا قطرہ قطرہ
نچوڑا گیا
میرے گردے اور
کہیں اور
فٹ ہو گئے
میری آنکھوں کو کسی اور
کی معذور پیشانی پہ
ٹانک دیا گیا
ڈاکٹر!!
یہ تم نے کیا کیا
شاید
وہ چاہتا ہے
میری قربانیوں سے
چچی کا دل بنے
موم کی بتی
اف میری
دکھی چچی

اور پھر، یہی ہوا
چچی کا سارا وجود
ندامت میں گھل گیا
آہ ڈاکٹر
تمہاری سوچ
کتنی گہری ہے!!

"برخوردار! یہ کیا بکواس ہے!" انکل فضل چیخ اٹھے۔ "تم نے صاف میری زمین پر ہاتھ صاف کیا ہے اور میری اسٹائل کی نہایت بھونڈی نقل کی ہے۔ چلو نکلو میرے کمرے سے، آ گئے شعر سنانے، یہ کوئی بچوں کا کھیل ہے؟ حد ہو گئی!"

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور چپکے سے تکیہ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں کھسک لیا۔

صبح میں نے کراچی واپسی کے لئے بوریا بستر باندھ لیا۔ کیونکہ جس نحوست سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں وہاں سے بھاگا تھا وہ یہاں پہلے سے موجود تھی۔ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے کے مصداق جب میں گھر پہنچا تو امی نے خوشخبری سنائی۔

"شاہد نے تمہاری موٹر سائیکل کی مرمت کرا دی ہے، دیکھو تو سہی بالکل نئی معلوم ہو رہی ہے۔"

میں حیران رہ گیا کہ وہ دوست نما دشمن اتنا مہربان کیسے ہو گیا۔ میں نے کیلنڈر پر نظر دوڑائی تو نیا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے سینٹر ٹیبل پر پڑا ہفتہ واری میگزین اٹھایا اور تیزی سے صفحات پلٹنے لگا تاکہ دیکھ سکوں کہ یہ ہفتہ کیسا گزرے گا! مگر پھر کامیابی کی نوید لانے والے سفر کے ساتھ، جیب کترے کی مہارت اور انکل فضل کی شاعری یاد آئی، تو جھٹ رسالہ بند کر دیا اور امی سے مخاطب ہو کر کہا "امی یہ، "یہ ہفتہ کیسا رہے گا!" جاننے کا شوق بھی کیسا منحوس شوق ہے...... ہے نا!!"

تب اور اب

مصنف بتایئے...... انعام پایئے

مارچ کے شمارے میں فرسان احمد خان غوری کی ایک اصلاح طلب کہانی شائع کی گئی تھی جسے بچوں ہی کے ایک مقبول مصنف نے لکھا تھا۔ ابن آس بچوں کے رسائل میں کہانیاں لکھتے ہیں۔ آنکھ مچولی میں ان کی اب تک تین کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ "ماہنامہ ساتھی" میں آج کل ان کا ناول "شہزور" قسط وار چھپ رہا ہے...... ابن آس شو بزنس کے ایک پرچے میں ادارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں اس مقابلے میں ہمیں سینکڑوں ساتھیوں کے جوابات موصول ہوئے لیکن صحیح نام بوجھ کر انعام کے حقدار قرار پائے ہیں کراچی کے محمد کاشان خان یوسف زئی...... انعام حاصل کرنے پر آنکھ مچولی کی جانب سے کاشان کو بہت بہت مبارک باد!

واقعی سہولت تو حبیب بناسپتی کی ہے

صارفین کی سہولت کے لئے آسانی سے کھلنے اور
بند ہونے والا ڈھکنا
اور اس کے نیچے نرم فوائل
کی سیل جس کی بدولت
حبیب بناسپتی کی
اعلیٰ کوالٹی اور تازگی
آخر تک برقرار۔

بہتر تو تھا ہی اب سب سے بہترین۔

MASS

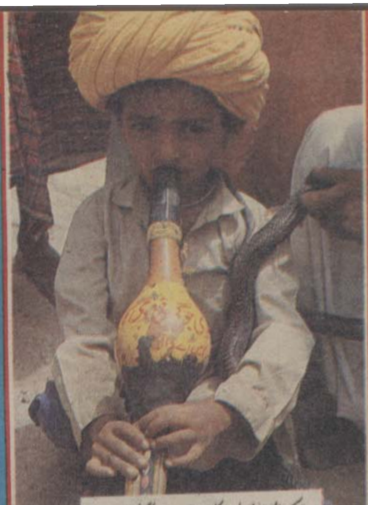

بچہ بین بجائے تب جوگی کہلائے

سانپ سانپ سنتے ہی کانپ کانپ جاتے ہیں،
کمسن جوگی ۔ بین بجانے کی تربیت کے دوران

سانپ کو ناک سے ڈال کر منہ سے نکالنے کا کرتب

بین کی دھن پر سانپ کا روایتی رقص

گلے میں سانپ، حلق میں جان، سلیم مغل،
جوگی فقیر کے ہمراہ گلے میں سانپ ڈالے

چند لمحے سانپوں اور سپیروں میں

سلیم مغل

کیا آپ کو سانپ سے ڈر لگتا ہے؟ مجھے تو نہیں لگتا۔ یقین نہ آئے تو تصویر دیکھ لیجئے جس میں ایک پیارا سا پھنکارتا ہوا سانپ میرے گلے سے اس طرح لپٹا ہوا ہے جس طرح موتیوں کی مالا کسی دوشیزہ کے گلے میں۔

بات یہ ہے کہ ہمارا پالا ایسے بہت سے سانپ صفت لوگوں سے پڑتا رہا ہے کہ اصلی سانپ کا خوف جاتا رہا۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے تو شاعر نے کہا تھا کہ

شباہتوں سے عیاں مکروفن نہیں ہوتے
ہیں سانپ ایسے بہت جن کے پھن نہیں ہوتے

ایسے ہی لوگوں کے لئے اردو کا محاورہ "آستین کے سانپ" استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ آستین میں یا تو بازو رہ سکتا ہے اور یا پھر سانپ۔ سچ پوچھئے تو سانپ ہے بڑی مزے دار چیز۔ مشتاق یوسفی نے تو سانپ کو ایک خوبصورت دُم سے تشبیہ دی ہے، سانپ جس وقت لہراتا، بل کھاتا چلتا ہے تو اس کی یہی نازک خرامی ہمارا دل موہ لیتی ہے۔ بچوں کو بین پر سانپ کا ناچنا بے حد پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سپیرے گلی گلی جاکر بچوں کو سانپ کا ناچ دکھاتے ہیں اور داد کے طور پر پیسے وصول کرتے ہیں۔ بین پر سانپ کو ناچتے دیکھ کر یونہی میرے دل میں خیال آیا اور میں نے جوگی (سپیرا) سے پوچھ لیا کہ سانپ کو بین کے بجائے ہارمونیم پر کیوں نہیں نچاتے؟ سپیرے نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگا "اڑے تم پاگل تو نہیں ہو۔ سانپ کو کیا پتہ ہارمونیم کیا ہے؟"

میرا دوسرا سوال تھا۔ اچھا اگر ہم لوگ ایسا کریں کہ بین کی آواز کیسٹ کے ذریعہ سانپ کو سنوائیں اور سانپ کے سامنے یونہی کوئی چیز بین کی طرح لہراتے رہیں تو کیا سانپ ناچے گا؟ اس کا جواب تھا "جاؤ ڑے ہمارا دماغ نہیں کھاؤ۔"

ہم نے آپ کو یہ تو بتایا نہیں کہ یہ سارے سوال جواب کب کہاں اور کس سے اور کیوں کیے۔ تو سنیئے ہوا یوں کہ ہمیں سانپوں اور سپیروں میں کچھ وقت گزارنے کی سوجھی اور ہم فوراً ہی سپیروں کی ایسی بستی میں جا پہنچے جہاں سانپ اور سپیرے پاکستان میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔

سندھ کا مشہور قصبہ اور ریگزار تھر سے ملا

ہوا تاریخی شہر عمر کوٹ، جوگیوں کا سب سے بڑا مسکن ہے۔ یہ وہی عمر کوٹ ہے جہاں مشہور مغل بادشاہ اکبر پیدا ہوا اور جہاں عمر ماروی کی مشہور رومانی داستان نے جنم لیا۔ عمر کوٹ کی شہرت کے اور بھی حوالے ہیں مگر فی الوقت ہمارا موضوع عمر کوٹ سے متصل بہت بڑے قطعۂ زمین پر آباد سانپ اور سپیرے ہیں۔

میں جوگیوں کی بستی پہنچا تو سینکڑوں ننگے اور آدھ ننگے بچوں نے روپیہ دو روپے مانگ کر میرا خیر مقدم کیا۔ ایک جوگی بچے نے نیکر پہنے ہوئے دوسرے جوگی بچے کو اپنی زبان میں "ننگو پتنگو" کہہ کر تنگ کیا تو مجھے حیرت ہوئی اس لئے کہ خود یہ سب کچھ کہنے والا بچہ تو نیکر سے بھی بے نیاز تھا۔ میں نے ان بے لباس بچوں کے درمیان جب اپنے آپ کو ملبوس پایا تو ایسا لگا جیسے میں کوئی غیر مہذب شخص ہوں جو تہذیب یافتہ ننگوں کے کے درمیان تنہا اور اجنبی ہو ۔۔ تھوڑی ہی دیر میں بہت سے ایسے بچے آگئے جن کے تن 'غریب حالوں سہی مگر لباس سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک بچے کی ہتھیلی پر پیسے رکھ کر میں نے کہا جاؤ اپنے بڑوں کو بلا لاؤ۔ چند لمحوں بعد بہت سے جوگی اپنی اپنی بینوں اور سانپوں کے ہمراہ میرے سامنے تھے۔ جوگی مصری فقیر نے تو حیران کردیا۔ سانپ کو ناک سے ڈالا اور منہ سے نکال دیا۔ میں نے کہا "اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے سانپ نے ناک کو بل سمجھا ہوگا اس لئے خوشی خوشی ناک میں چلا گیا ہوگا مگر جب ناک اور نتھنوں میں سگریٹ کی بو محسوس کی ہوگی تو جلدی سے منہ کے راستے باہر آگیا ہوگا۔" میری بات سن کر جوگی فقیر کا منہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ میرا سر پھاڑ دیتا۔

ان سپیروں سے بہت دیر تک بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ ان باتوں کو ہم کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں فی الوقت تو ہم آپ کو راز کی دو باتیں بتا رہے ہیں جو ہم نے وہاں سے حاصل کیں۔

یہ راز دراصل دو منتر ہیں۔ ایک منتر سانپ کو پکڑنے کا اور دوسرا سانپ کے کاٹے کا علاج کرنے کے لئے۔ کوئی جوگی ہمیں یہ راز دینے کو تیار ہی نہ تھا۔ وہ تو یہ کہئے کہ ہماری ذہانت کام آگئی۔ ہوا یوں کہ ہر جوگی منتر کو اتنی تیز رفتاری سے پڑھتا کہ اسے لکھنا تو درکنار اسے سننا بھی مشکل ہوجاتا۔ پھر ہم نے کیا یہ کہ جیب میں رکھے ہوئے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دبا دیا۔ اور گھر آکر سلوموشن پر سنا اور سب کچھ تحریر کرلیا۔ بعد میں ایک جاننے والے جوگی سے اس کی زِیر زَبر بھی درست کروالی۔ آپ ان دونوں منتروں کو رٹا لگالیجئے اور تیز رفتاری سے پڑھئے پھر دیکھئے کیسا

مزہ آتا ہے۔ ایک اور گزارش یہ ہے کہ منتر پڑھ کر سانپ ہرگز نہ پکڑیئے گا۔ اس لئے کہ خدانخواستہ منتر سانپ کی سمجھ میں نہ آیا تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔

منتر نمبر۱۔ سانپ کو پکڑنے سے قبل عملیات کے دوران آگ لگانے اور شعلہ بھڑکانے کے لئے۔

"اونمو، آویش گرو، لال بیگ اگوانی دودھ کا دودھ پانی کا پانی، دھولا منکا، مرغی دھار، کہاں لگائی لال بیگ اتنی بار کون کون کو ساتھ لے کے آئے۔ دکھنی کوں، سکھنی کوں، دیوکوں، بانے کوں، چھتیس قوم کی بریا، ہندو کی ارتھی، مسلمان کی گور، جاجگا سوتا مسان۔ نہیں جگائے تو تیری ماں کی سیج پر پاؤں رکھے۔"

منتر نمبر۲۔ سانپ کے کاٹے کے لئے

"ہڑومان، پہلوان، بارہ برس کا جوان، ہاتھ میں لڈو، مکھ میں ناگرپان، انجنی کا پتر، ماہ دیو کا چیلا، آگے لایا آگ، پیچھے لایا بے تال۔ ناگھڑی اس سانپ کے وہس کو ختم کر نہیں تو کال بھیرو کی اگنیاں تجھے۔"

(پلیز ہنسئے گا نہیں۔ ورنہ جوگی تو جوگی سانپ بھی برامان جائیں گے)

آنکھ مچولی

آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔
ہماری کاوش آپ تک اور آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے مُعاون

ہمارے مَددگار

صوبہ سندھ اور بلوچستان میں آنکھ مچولی کے ایجنٹ

محمد حسین برادرز — کراچی — ۷۷۳۴۱۲۶
مہران نیوز ایجنسی — حیدرآباد — ۲۰۱۲۸
سلمان برادرز — نوابشاہ — ۲۳۱۴
ایم ایم ٹریڈرز — کوئٹہ — ۷۵۰۰۲

خط و کتابت کے لیے
سرکولیشن مینیجر
ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

سب سے زیادہ مُنافع
این ڈی ایف سی کی ماہانہ آمدنی اسکیم پر

این ڈی ایف سی

MIC

ماہانہ آمدنی سرٹیفیکٹ

17% * p.a.

اپنے ڈپازٹ پر کمائیے !

متوقع ماہانہ آمدنی	رقم سرمایہ کاری
7,083/- روپے	500,000 روپے
1,417/- روپے	100,000 روپے
708/- روپے	50,000 روپے
354/- روپے	25,000 روپے
142/- روپے	10,000 روپے

این ڈی ایف سی نے سب سے پہلے ماہانہ آمدنی سرٹیفیکٹ کا آغاز کیا اور اب آپکے سرمائے پر سب سے زیادہ ممکنہ منافع بھی پیش کرتا ہے۔

- قابلِ بھروسہ، ذاتی توجہ اور پیشہ وارانہ ماحول میں فوری خدمت جو ملک بھر میں این ڈی ایف سی کی تمام شاخوں کی خصوصیت ہے۔
- ماہانہ ادائیگی رقم جمع کرنے کے ایک ماہ بعد سے ہی شروع۔
- سرمایہ کا یقینی تحفظ۔
- این ڈی ایف سی ماہانہ آمدنی سرٹیفیکٹ ہر ایک کیلئے موزوں ترین۔
- این ڈی ایف سی ماہانہ آمدنی اکاؤنٹ کم از کم ۱۰،۰۰۰ (دس ہزار) روپے سے کھولیے۔

مزید تفصیلات کیلئے این ڈی ایف سی کی کسی نزدیکی شاخ سے رابطہ قائم کیجئے۔

(ملکیت حکومت پاکستان)

نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن

NDFC

بہتر اور روشن مستقبل کے لئے کوشاں

چھٹی منزل، فنانس اینڈ ٹریڈ سینٹر، پی او بکس 5094 کراچی۔ فون: (10 Lines) 525155, 525240-49 (92-21) کیبل: TERMFUND ٹیلیکس: 20842 NDFC PK فیکس: 525353, 5683923 (92-21)

مرکزی شاخوں کے ٹیلی فون نمبرز

کراچی : (021) شاہین کمپلیکس 2632201, 2631373 ایم۔ اے جناح روڈ 7782142-3 طارق روڈ 4558725 اکرم اسکوائر 670165, 675932 سوک سینٹر 4931437, 4931448
کلفٹن 538118, 577012 شہید ملت 446008-9 کھارادر 2438822, 2436680 ایس ایم سی ایچ ایس 4552541, 4557750 ریگل چوک 7726478, 7730394 ایف ٹی سی 525337, 525240

لاہور : (041) دی مال 6301136, 6301754-5, 6304905 گلبرگ 5751363-5 فیروز پور روڈ 7588963 ڈیوس روڈ 6306410, 869336, 6363570 نیو گارڈن ٹاؤن 583377-4-6 کینٹ 6665501

اسلام آباد : (051) 811712, 813584-5 **راولپنڈی** : (051) مال 568210, 565419 مری روڈ 550051 چاندنی چوک 427849

پشاور : (0521) 276257, 278392 **کوئٹہ** : (081) 61716, 63418

* زکوٰۃ اور ود ہولڈنگ ٹیکس بمطابق قانون منہا کئے جائیں گے۔

پاکستان

* ایک جدید جمہوری مملکت، جو ایک امتیازی تاریخی و ثقافتی پہچان رکھتی ہے۔ مستقبل کیلئے عظیم امکانات اور امیدوں کی سرزمین
* وافر مادی اور افرادی وسائل سے مالامال * ترقی کے لئے شہری اور تکنیکی لوازم کی حامل۔

وزیراعظم بے نظیر بھٹو

کی جاں پرور اور بیدار مغز قیادت میں عوامی حکومت کے پرجوش، ترقیاتی عزائم سے سرشار، بیرونی سرمایہ کاروں کو وسیع تجارتی و صنعتی منصوبوں کے لئے فراخدلانہ سہولتیں مہیا کرتی ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان

اپنی ملکی و غیر ملکی شاخوں کے وسیع سلسلہ کے ذریعے عرصہ دراز سے پاکستان کی معاشی ترقی، بیرونی تجارت کے فروغ اور بارآور روابط قائم کرنے میں ممد و معاون رہا ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی۔ قومی بینک

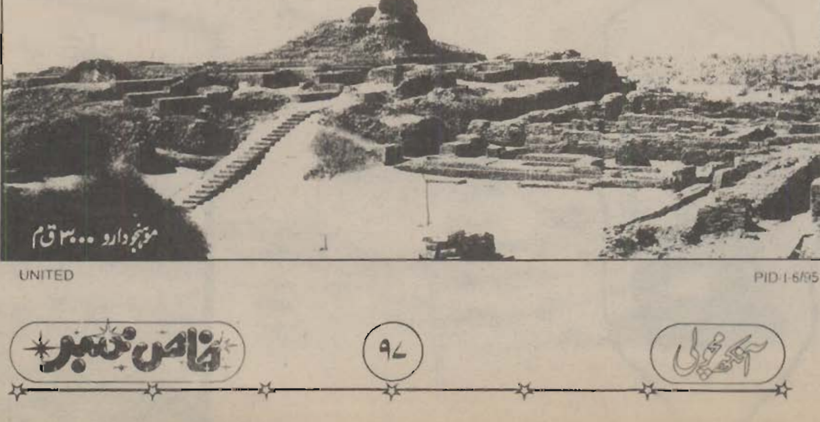

UNITED

PID-I-6/95

مٹی کا تیل

افق دہلوی

یہ مٹی کا جو تیل پاتے ہیں ہم — کئی کاموں میں اس کو لاتے ہیں ہم
اسے پہلے سے چینی تھے جانتے — وہ سارے تھے ایندھن اسے مانتے
مگر علم یہ تو کسی کو نہ تھا — کہ یہ تیل مٹی کا کیسے بنا!
بہت اس پہ تحقیق ہوتی رہی — مگر بات یہ راز میں ہی رہی
خیال اس طرح پیش اک نے کیا — کہ مٹی کا یہ تیل کیسے بنا!
زمین میں جو تھے کاربائیڈ دبے — ملے جب وہ پانی سے اور بھاپ سے
چٹانوں کا ان پر دباؤ پڑا — دباؤ سے بس تیل ابلنے لگا!
مگر بعد ازاں اینگلر نے کہا — نہیں اس طرح تیل یوں تو بنا
بہت ہی بڑے جانور جو کبھی — زمیں پر تھے آباد مدت ہوئی
سمندر میں بھی ایسے ہی جانور — کیا کرتے تھے زندگانی بسر!
زمیں میں تغیر سے وہ دب گئے — زمین میں دبے ان کو برسوں ہوئے
تپش اور دباؤ سے گلنے لگے — وہی تیل بن کر نکلنے لگے

بنا اس طرح سے افقؔ تیل یہ
انوکھا ہے قدرت کا بس کھیل یہ

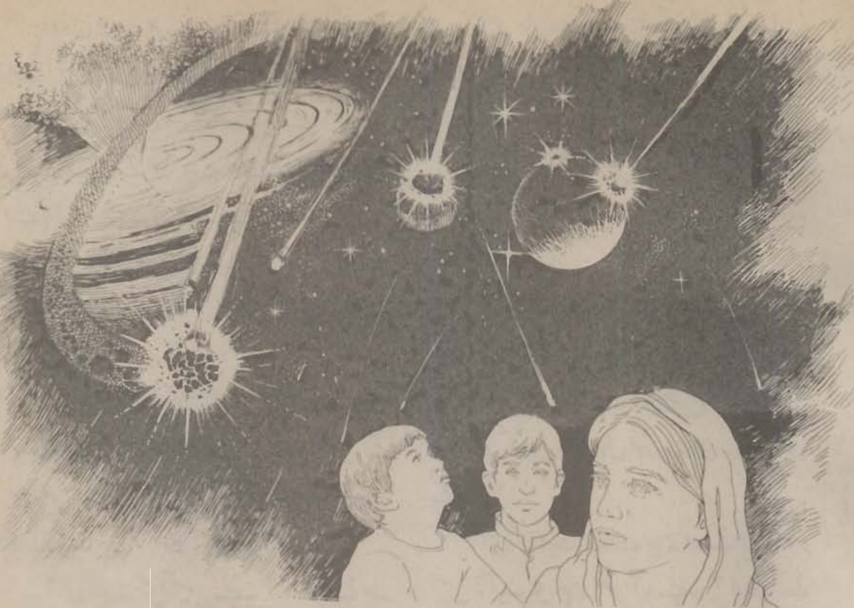

شہاب ثاقب

شیطان کا دشمن

شہناز بانو

ٹپ ٹپ ٹپ...... موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہو گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چھما چھم موسلا دار بارش شروع ہو گئی۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا اور گرمی اپنے عروج پر تھی پھر بارش شروع ہوتے ہی لائٹ بھی چلی گئی۔

"ارشد، اسعد چلو دونوں اندر آ جاؤ۔" امی نے صحن میں کھیلتے ہوئے ارشد اور اسعد کو آواز دی۔

"آ رہے ہیں ناں امی جان سچ اتنی تو گرمی ہو رہی ہے، اب بارش ہوئی ہے تو تھوڑا سا نہانے دیں ناں پلیز......" دونوں نے التجا کی۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے، نہالو، مگر دیکھو اس کے بعد فوراً صاف پانی سے نہا کر کپڑے تبدیل کر لینا میں تمہارے لئے دوسرے کپڑے نکال دیتی ہوں۔" امی نے دونوں کو نہانے کی اجازت دے دی۔

دونوں بڑے مزے سے نہاتے رہے کچھ دیر بعد بارش رک گئی تو دونوں اندر آ گئے۔ بارش سے بھیگے ہوئے جسم کو دوبارہ صاف پانی سے دھویا اور کپڑے تبدیل کئے اور بڑے مزے سے بیٹھ کر امی کے ہاتھ کی مزے دار چائے پینے لگے۔

"امی جان! آپ کو یاد ہے ناں کہ آج تو ہمارا کہانی سننے کا دن ہے۔" اسعد نے امی کو ان کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بھئی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ہم سب چھت پر چلیں گے اور وہیں پر تمہاری کہانی والی فرمائش بھی پوری کر دی جائے گی۔ نیچے تو بہت گرمی اور حبس ہے۔"

"اور لائٹ بھی نہیں ہے۔" اسعد نے منہ بنایا۔

"ایک تو یہ بجلی والے پتا نہیں کیا کرتے رہتے ہیں ذرا سی بارش ہوئی اور لائٹ چلی گئی۔" ارشد شدید گرمی اور پسینے سے بلبلا اٹھا۔

"بہت بری بات ہے ارشد! کسی کو برا نہیں کہتے، آخر بجلی بنانے والے بھی تو انسان ہیں اور انسانوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں تو خرابی ہو ہی جاتی ہے۔"

رات کا کھانا کھانے کے بعد اسعد ارشد امی جان کے ساتھ چھت پر پہنچ گئے۔

چھت پر پہنچ کر امی نے اندر کمرے سے ایک پلنگ نکالا اور صحن میں بچھا دیا۔ بارش ہونے کے بعد ہوا بالکل بند ہو گئی تھی۔ اور چونکہ ہر طرف اندھیرا تھا، اس لئے آسمان پر ہر طرف جگمگ جگمگ کرتے ڈھیر سارے تارے نظر آ رہے تھے۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ اکّا دُکا ٹکڑے البتہ تیرتے نظر آ رہے تھے۔

"امی جان! دیکھیں تو آسمان کس قدر خوبصورت نظر آ رہا ہے۔" اسعد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا! اللہ تعالیٰ نے جس طرح زمین کو مختلف درختوں، پھولوں، پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں سے سجایا ہے۔ اسی طرح آسمان کو بھی ان گنت تاروں، سیاروں اور چاندوں سے سجا دیا ہے۔"

"امی کیا بہت سارے چاند ہوتے ہیں؟ مگر ہمیں تو ایک ہی چاند نظر آتا ہے۔" ارشد نے حیران ہو کر پوچھا "ہاں بھئی! اس دنیا میں بہت سارے سیارے اور ستارے ہیں۔ ہماری زمین بھی ایک سیارہ ہے اور اس کا ایک چاند ہے۔ اسی طرح سیارے مشتری کے بارہ چاند ہیں اور اسی طرح مختلف سیاروں کے مختلف چاند ہیں۔ یہ ایک پورا نظام شمسی ہے۔ جس کے بارے میں تمہیں پھر کبھی بتائیں گے۔"

ارشد اسعد دونوں اپنی امی جان کے دائیں اور بائیں لیٹے آسمان کی طرف منہ کئے ستاروں اور سیاروں کی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے دیکھا کہ ایک روشن اور چمکدار شے اوپر سے تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آنے لگی..... اور پھر فضا میں غائب ہو گئی۔

"ارے امی! یہ کیا تھا؟" دونوں ایک ساتھ چیخے۔

"یہ شہابِ ثاقب تھا۔" امی نے جواب دیا۔

"شہابِ ثاقب کیا ہوتے ہیں امی؟ آج آپ ہمیں ان کے بارے میں بتائیں۔" ارشد کے چہرے پر بے پناہ تجسس تھا۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے میں تمہیں شہابِ ثاقب کے بارے میں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ مگر پھر کہانی سننے کی فرمائش نہیں ہوگی۔ امی نے وارننگ دی۔

"ہمیں منظور ہے۔" دونوں ایک ساتھ بولے۔

تب امی جان یوں گویا ہوئیں۔

"اللہ تعالیٰ نے تین طرح کی مخلوقات بنائی ہیں۔ نوری یعنی فرشتے جو نور سے بنے، ناری یعنی جن جو آگ سے بنے اور خاکی یعنی انسان جو مٹی سے بنے۔" امی ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بولیں۔

"اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنات کو اس لئے دنیا میں بھیجا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمابرداری کریں مگر جس طرح انسانوں میں سے کچھ لوگ اللہ کے نافرمان بندے ہیں اسی طرح جنّات میں بھی بہت سے بُرے جن ہیں جو ابلیس کے ساتھی کہلاتے ہیں اور جن کا کام انسانوں کو بھلائی اور خیر کی راہ سے ہٹا کر برائی کی راہوں پر لگانا ہے۔ شیاطین جب اوپر آسمانوں تک پہنچتے ہیں تو فرشتوں کی ان پر نگاہ پڑتی ہے اور وہ ایک شہاب ثاقب ان کو کھینچ کر مارتے ہیں جو تیز شعلے کی شکل میں زمین تک ان کا پیچھا کر کے ان کو بھگا دیتے ہیں۔ شیطان کو روکنے کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے شہابِ ثاقب سے آسمان کو ڈھانک رکھا ہے۔

پھر جب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے شیاطین کی آمد کو قطعی روک دیا اور شہابِ ثاقب کو ان کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ جو وحی اللہ تعالیٰ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک بھیجتے ہیں وہ الفاظ حضور کے قلب تک پہنچنے سے پہلے کسی شیطان کے کان میں نہ پڑ جائیں۔

اسی بات کو سورہ الصفت میں آیت ۶ تا ۱۰ اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔

"ہم نے آسمانِ دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے، اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے، یہ شیطان ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سُن سکتے، ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں، اور ان کے لئے عذاب ہے۔ تاہم اگر ان میں سے کوئی کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ ان کا پیچھا کرتا ہے۔"

اس کے علاوہ سورہ الجن کی آیت ۸ اور ۹ میں اس بات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

"ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہرے

داروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے اور یہ کہ پہلے ہم سن گن لیتے تھے آسمانوں میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے۔ مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے لئے گھات میں ایک شہابِ ثاقب کو لگا ہوا پاتا ہے۔"

امی جان ہمیں سورہ الجن کی اس آیت کو ذرا تفصیل سے سمجھائیں۔ ارشد نے اس آیت میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"بات یہ تھی بیٹا کہ ایک مرتبہ جنوں کے ایک گروہ کا گزر نخلہ کے مقام سے ہوا تو انہوں نے حضور کو وہاں نماز میں مصروف پایا اور اس میں قرآن کی تلاوت سنی۔ وہ دلچسپی سے تلاوت القرآن پاک سننے لگے جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور القرآن کے بارے میں دریافت فرمایا۔

آپ نے ان کو القرآن کے بارے میں بتایا اور اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی۔"

"تو کیا امی جان انہوں نے حضور کی وہ دعوت قبول کر لی؟" اسعد نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! انہوں نے اسلام کی دعوت قبول کر لی۔ اور پھر اپنی قوم کے لوگوں کو بھی دعوت اسلام دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے زمین کی طرف آنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے وہی بات دہرائی جو سورہ الجن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔"

"اچھا تو امی یہ تو تھی شہابِ ثاقب کے بارے میں القرآنی معلومات اب ہمیں اس کی سائنسی تحقیق کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔" اسعد نے امی جان کا چہرے ارشد کی جانب سے ہٹا کر اپنی جانب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! میں آپ کو یہی بتانے جا رہی ہوں۔" امی نے محبت سے اسعد کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو یہ سوال کہ ان شہابوں کی اصل حقیقت کیا ہے تو اس کے بارے میں انسان کی معلومات قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات جدید دور کے انسان کے علم میں آئے ہیں اور زمین پر گرے ہوئے شہابوں کے معائنے سے جو معلومات لی گئی ہیں، ان کی بنا پر سائنس دانوں میں سب سے مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہاب کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آ کر ادھر کا رخ اختیار کر لیتے ہیں۔ سائنس تو جو کچھ نظر آتا ہے اسے بیان کرتی ہے۔ اصل معاملے کا علم تو اللہ کو ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے شہابِ ثاقب کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہی درست ہے۔"

ابھی ارشد نے مزید کچھ پوچھنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ لائٹ آ گئی اور ارشد اسعد امی کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آئے!!۔

قابلِ اعتماد - غذائیت سے بھرپور

دیسی گندم کا آٹا

کپڑے اور کاغذ کے تھیلوں میں
ممتاز اسٹورز اور یوٹیلٹی اسٹورز
پر دستیاب ہے۔

کراچی میں

کپڑے کے
تھیلوں میں دیسی گندم
کا آٹا پیش کرنے کا سب سے
پہلا شرف ہمارے ادارے
کو حاصل ہے۔

اشرفی برانڈ
آٹا سے پکائی ہوئی روٹی نرم
اور ملائم رہتی ہے کیونکہ ہم
خودکار مشینوں پر اعلیٰ قسم
کی دیسی گندم سے آٹا تیار
کرتے ہیں جس میں میدہ اور
سوجی پوری مقدار میں شامل
ہوتے ہیں جو کہ آٹے میں
غذائیت کا جزو اعظم ہیں
اب انٹرنیشنل کاغذ کی پیکنگ
میں بھی دستیاب ہے

اشرفی
برانڈ آٹا ۲۵ سال سے
اعلیٰ معیار کی ضمانت

کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو
ہم نے تمہیں
عطا کی ہیں۔ (القرآن)

ماہانہ گھریلو خریداری میں سرفہرست

اچھی صحت، خدا کی نعمت

بکرا سوار دکھ

محمد جنید ہارون لاکھانی

بقر عید کے آنے میں چند ہی دن باقی رہ گئے تھے کہ گھر میں بکرے کی وبا پھیل گئی یعنی گھر کے ہر ذی روح کا تکیہ کلام "بکرا" بن گیا اور بکرے محترم کو اتنا یاد کیا جانے لگا کہ شاید بکرا پیڑی بھی ہچکیوں سے گونج اٹھی ہو۔ مُنّا جس نے ابھی چلنا بھی نہیں سیکھا تھا وہ بے چارہ بھی سب کی دیکھا دیکھی "بکرالاؤ" کی جگہ "بتلالاؤ، بتلالاؤ" کہنے لگا اور وہ بھی اس انداز سے ٹھہر ٹھہر کے کہتا کہ سب کے قہقہے نکل جاتے۔ اب اس بے چارے کو کیا پتہ کہ بکرا کیا بلا ہوتی ہے اور اس بلا کے کتنے نخرے اٹھانے پڑتے ہیں لیکن اس سے کبھی انکار نہیں کہ بعد میں اس بلا کو پکا کر کھاتے بھی ہم خود ہی ہیں۔ خیر بہت مذاکروں پروگراموں اور بحث و مباحثے کے بعد دادی جان نے اپنی فائنل کھلی کچہری سے خطاب کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا وہ یہ تھا کہ چونکہ تمہارے ابو ملک سے باہر ہیں اور تمہاری امی کو بکرا

خریدنے کا کوئی تجربہ نہیں اس لئے بکرا خریدنے وہ خود جائیں گی۔ قصہ مختصر دوسرے دن ایک کتھئی رنگ کا ڈرا ڈرا سا سہما ہوا بکرا دادی محترمہ کے ساتھ تشریف لایا۔ جسے خوش آمدید کہنے سارا گھر اکٹھا ہو گیا پتہ نہیں وہ ہر ہلکی سی آہٹ پر بھی اتنا چونک کیوں جاتا تھا اور جب اس کے آتے ہی باجی نے امی جان سے کہا کہ "واہ! اگر اس کے چپلی کباب بنائے جائیں تو واقعی بڑے لذیذ ہونگے۔" پھر انہوں نے چٹخارہ لیتے ہوئے "چٹ" کی آواز زبان سے نکالی تو بکرا چونک گیا اور ٹکٹکی باندھے باجی کو ایسے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو "دھوکے باز آدم خور۔ کیا مجھے اسی لئے گھر لائے تھے۔" ہمارا چھوٹا بھائی نمی جو چوتھی میں پڑھتا ہے اور جو اس واقعہ کا کرتا دھرتا بھی ہے، جانوروں سے بڑی محبت کرتا ہے لیکن جانور اس سے محبت نہیں کرتے چنانچہ بکرے کے آتے ہی وہ اس کی آؤ بھگت میں لگ گیا اور ہم سب اس فرض سے بری الذمہ ہو گئے۔ بکرے کی ہر چیز اور آرام کا خیال نمی نے اپنے ذمے لے لیا۔ اسکول سے آکر رات تک وہ اس کی خاطر داری میں لگا رہتا لیکن مجال ہے جو بکرے میاں نے نمی کی طرف دیکھا بھی ہو۔ وہ تو بار بار گھر کے صحن کی دیواروں اور فرش کو ایسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا جیسے اندر کے خزانے واقعی اسے نظر آ رہے ہوں۔ نمی میاں نے اسے باندھنے کی کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ بقول ان کے "یہ بہت ہی ڈرپوک اور کمزور بکرا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جاتا ہے بھلا یہ بھاگے گا کیا؟" وغیرہ وغیرہ۔ خیر نمی میاں ان کی خاطر داری میں لگے رہے اور ہر وہ حربہ بکرے پر آزمانے لگے جس سے بکرا...... انہیں ایک نظر دیکھ ہی لے لیکن جب ان کا ہر حربہ ناکام ہو چکا تو انہیں خیال آیا کہ کوئی ایسی چیز اپنے پاس رکھی جائے جس سے بکرا ان کی طرف متوجہ ہو لیکن ایسی کونسی چیز ہو؟ یہی سوچتے ہوئے مزید دو دن اور گزر گئے تیسرے دن امی جان نانی کے گھر چلی گئیں اور باجی کو اپنی انگوٹھی دے گئیں جو جھٹ باجی نے پہن لی یہ انگوٹھی بہت نایاب و قیمتی ہے اور امی کے دادا کی نشانی بھی اس میں قیمتی ہیرا جڑا ہوا ہے جو سکہ رائج الوقت کے مطابق تقریباً سوا لاکھ کا ہے۔ امی تو احتیاطاً باجی کو انگوٹھی دے گئیں لیکن باجی نے اس کی نمود و نمائش گھر کے ہر فرد کے سامنے شروع کر دی۔ تبھی نمی میاں کو اس انگوٹھی سے بکرے میاں کو اپنے پیار کی طرف قائل کرنے کی سوجھی۔ فوراً باجی کے پاس گئے اور اپنے پہلے ہی حربے میں کامیابی حاصل کر لی یعنی ایک پاؤ آنسو بہا کر انگوٹھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور بکرے کی طرف یہ جا وہ جا۔ حالانکہ باجی نے لاکھ سمجھایا کہ بھیا تمہاری اتنی پتلی انگلی میں اتنی موٹی تازی انگوٹھی ٹکے گی کیسے لیکن نمی پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی ابھی ان کو بکرے میاں کے پاس گئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ہم سب کو نمی کی دلخراش چیخ سنائی دی جو شاید مینار پاکستان پر بھی سنی گئی ہو۔ ہم سب بھاگتے ہوئے صحن میں

پہنچے تو نمی اپنی انگلی پکڑ کر تکلیف سے کراہ رہے تھے اور بکرے میاں غائب تھے سب کے پوچھنے پر نمی میاں نے اپنے اوپر بیتنے والی بپتا سنائی تو سب کے اوسان خطا ہو گئے جبکہ باجی بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔ نمی نے بتایا "میں انگوٹھی لے کر بکرے کے پاس گیا تو پہلے تو بکرا اتنی چمکیلی انگوٹھی دیکھ کر چونک گیا پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو اور تھوڑی ہی دیر بعد دفعتاً آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا اور میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گھاس کھانے لگا میں سمجھا کہ واقعی یہ انگوٹھی کی کرامت ہے لیکن بکرے کو گھاس کھاتے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میری انگلی جس میں، میں نے انگوٹھی پہن رکھی ہے اس میں کیلیں چبھ رہی ہیں۔غور کیا تو پتہ چلا کہ یہ بکرے صاحب کے نوکیلے دانت ہیں۔ اور جب میں نے جھٹکا دے کر انگلی چھڑانے کی کوشش کی تو انگلی تو چھوٹ گئی لیکن انگوٹھی بکرے کے منہ میں رہ گئی اور بکرے نے اسے نگل لیا پھر نگلتے ہی باہر بھاگ لیا۔" کہہ کر نمی رونے لگا بکرے کا انگوٹھی نگل کر بھاگنا اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ ہمارا بکرا کسی ڈاکو کے گھر پلا بڑھا تھا۔ ایک بات جو ہم کہنا بھول گئے کہ دادی بھی اس وقت گھر میں موجود نہیں تھیں وہ رات کو آنے کا کہہ کر اپنی کسی پاکستان سے بھی پرانی سہیلی سے ملنے گئی ہوئیں تھیں۔ تو ہم کہہ رہے تھے کہ نمی کی بات سن کر سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے باجی کی حالت تو غیر ہو گئی اور انہوں نے ایک ہی

رٹ لگانی شروع کر دی کہ "جاؤ جلدی سے بکرا ڈھونڈ کر لاؤ" یہ سنتے ہی سب بھاگم بھاگ ایک محلے سے دوسرے محلے میں اور دوسرے سے تیسرے محلے میں بکرے میاں کو ڈھونڈنے لگے لیکن بکرے میاں بھی ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دوپہر تک بکرے میاں کو ڈھونڈتے رہے لیکن نہ ملے ویسے بھی اب وہ پورے سوا لاکھ کے ہو چکے تھے۔ "اب کیا کیا جائے؟" "سب سوچنے لگے۔ آئیڈیا! ہم نے چٹکی بجائی۔" مسجد میں اعلان کروا دیتے ہیں اور انعام رکھ دیتے ہیں۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن انعام میں کیا رکھیں؟" باجی نے ہمارے خیال کی تائید کرتے ہوئے پوچھا۔ "فی الحال تو اعلان کر دیتے ہیں کہ جو بکرا لائے گا اسے ایک قیمتی گھڑی دی جائے گی۔" جب بکرا مل جائے گا تب دیکھی جائے گی کیونکہ بکرا اگر کسی کو مل چکا ہے تو وہ خالی خولی دینے کو تیار نہیں ہو گا۔" ہماری اس بات پر سب نے ہمیں شاباشی دی۔ ہم نے نمی کو فوراً مسجد میں دوڑایا کہ جا کر مسجد میں اعلان کرا دو۔ ابھی اعلان ہوئے تین منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ کال بیل چیخ اٹھی ہم دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھے کہ کہیں دادی نہ آ گئی ہوں لیکن جوں ہی دروازہ کھولا ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ باہر ہمارے پڑوسی صاحب ہمارے بکرے کا کان پکڑے اس طرح کھڑے تھے جیسے کوئی اپنے شریر بیٹے کو اسکول لے جانے کے لئے تیار کھڑا ہو۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا "یہ

آپ کا بکرا ہے؟"
ہم نے بکرے کو کلیجے سے لگایا اور کہا "یہ سوا لاکھ کا بکرا ہمارا ہی ہے لیکن یہ آپ کو کہاں سے ملا؟" "ہمارا دروازہ کھلا دیکھ کر آ گیا۔" انہوں نے بتایا پھر بولے۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ انعام گھر پہنچا دیجئے گا۔"
"کیسا انعام؟" ہم نے دل میں کہا اور جھٹ سے دروازہ بند کر کے باجی کی خدمت میں لے گئے کیوں کہ انہیں غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ بکرے کو دیکھتے ہی ان کی جان میں جان آئی۔ "کہاں سے ملا بکرا؟ کہاں بھاگ گیا تھا کم بخت یہ؟" باجی کے پے در پے سوالات سن کر بکرا بھی ڈر گیا۔ "میں...... یں یں!!" وہ خوفزدہ ہو کر چلایا۔ "شکر کریں مل گیا۔" ہم نے مختصر الفاظ میں بکرے کے ملنے کا قصہ باجی کو بتایا ابھی سکھ کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ دروازے پر دھڑ دھڑ ہونے لگی دروازہ کھولا تو لوگوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ "کیا واقعی بکرے نے ہیرے کی انگوٹھی نگلی ہے؟"
"میاں! انگوٹھی تو اصلی ہے ناں؟" "انعام میں سونے کی گھڑی دے رہے ہو کیا؟" جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ "خاموش خاموش!!" پیچھے سے باجی نے چلا کر کہا۔ "آپ لوگوں کا شکریہ! بکرا مل گیا ہے۔" یہ سنتے ہی ہجوم کا فیوز اڑ گیا اور سب مرے مرے قدموں سے واپس چلے گئے۔
امی اور دادی جان واپس آئیں اور انہیں جب یہ سارا قصہ معلوم ہوا تو سب کو ٹھوک کے حساب سے ڈانٹ پڑی سب سے زیادہ شامت باجی صاحبہ کی آئی۔ قصہ مختصر یہ کہ عید والے دن جب قصائی کو بلوایا گیا تو دادی اور امی جان نے سب کی ڈیوٹی لگا دی کہ گوشت بناتے وقت قصائی کی کڑی نگرانی کی جائے۔ (ان کا خیال تھا کہ سوا لاکھ کی انگوٹھی پر اس کی رال ٹپک سکتی ہے) ہم سب بڑی بے چینی سے بکرے کے کٹنے کے منتظر تھے۔ قصائی نے بکرے کو بڑے آرام سے چت کیا اور ذبح کر ڈالا۔ "ہائے بے چارہ بکرا۔" نمی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "تم کیوں رو رہے ہو...... بکرے نے تمہیں کونسی لفٹ کرائی تھی۔" نادیہ نے نمی کے چٹکی بھری۔ "بیگم صاحبہ مل گئی انگوٹھی!" قصائی نے بکرے کا پیٹ چاک کرنے کے بعد انگوٹھی بر آمد کر ہی لی۔ "ملتی کیسے ناں میرے دادا کی نشانی ہے!!" امی جان نے جھپٹ کر قصائی کے ہاتھ سے انگوٹھی لے لی۔ سب لوگ انگوٹھی کے ملنے پر خوش تھے۔ ہمیں خاموش اور چپ چپ دیکھ کر باجی نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" "میں! .... کک ...... کک ...... کچھ نہیں!!" میں ہڑبڑا گیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مرا ہوا ہاتھی تو سوا لاکھ کا سنا تھا لیکن آج کل مرے ہوئے بکرے بھی سوا لاکھ کے ہیں!!!

ماحولیاتی آلودگی کا خاتمہ کیجئے

PREMIER Plus

پریمیئر پلس استعمال کیجئے

واحد گیسولین جس میں سیسے کی آمیزش نہایت کم ہے۔ اب ملک بھر میں دستیاب ہے

- دھوئیں کے اخراج پر بہتر کنٹرول
- اعلیٰ کارکردگی
- بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ

PSO پاکستان اسٹیٹ آئل

آپ کی صحت ہماری اوّلین توجہ

PARAGON

نہ وقت کا زیاں نہ انتظار کی زحمت
پاکستان میں روزانہ ۱۸۲ پروازوں کی سہولت

ان میں ہماری روزانہ ۴۷ بین الاقوامی پروازیں بھی شامل کیجئے تو ہم ہی آپ کو روزانہ دوسروں سے کہیں زیادہ مقامات تک پروازیں فراہم کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے اندرونِ ملک دائرۂ پرواز کا مقابلہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔ مثلاً صرف کراچی اور لاہور کے درمیان ہم روزانہ تقریباً سات پروازیں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک میں دیگر مقامات تک رسائی کے لئے ہم آپ کی سہولت کے مطابق ہر وقت تیار ہیں۔ پروازوں کا وسیع ترین دائرۂ کار ہمارے ساتھ سفر کا ایک اور جواز۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ، لاجواب پرواز

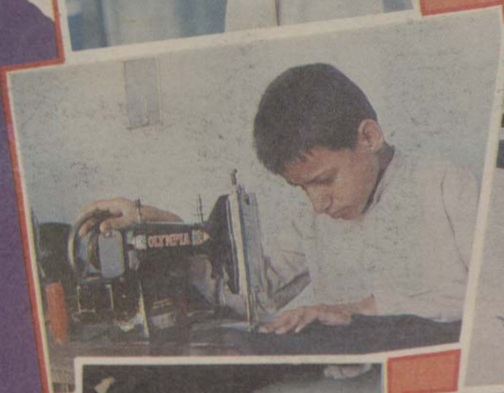
OLYMPIA

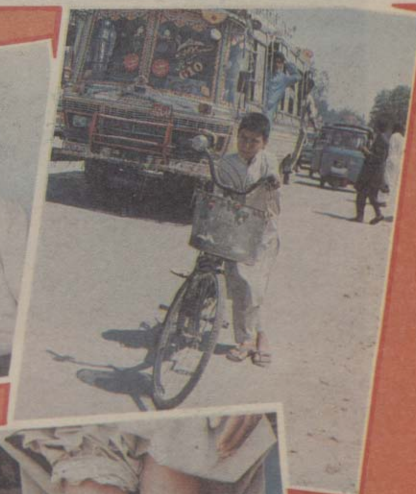

کلفٹن دیکھنے کے شوق میں ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ گھسٹتے ہوئے طے کیا

کراچی (پ ر) قصبہ موڑ، منگھوپیر روڈ پر رہنے والا ایک بارہ سالہ بچہ جس کی دونوں ٹانگیں پولیو کی وجہ سے معذور ہو گئیں ہیں کلفٹن دیکھنے کے شوق میں گھسٹتے ہوئے قصبہ سے ۱۲ گھنٹے کا سفر کر کے کلفٹن پہنچ گیا۔ ایدھی انفارمیشن بیورو کے مطابق قصبہ موڑ، منگھوپیر روڈ کے قریب رہنے والا ایک بچہ انور جس کی عمر تقریباً ۱۲ سال ہے کی دونوں ٹانگیں بچپن میں پولیو کی وجہ سے ناکارہ ہو گئیں ہیں کو کلفٹن دیکھنے کا بہت شوق تھا اور اکثر و بیشتر اپنے دوستوں سے اس کی تعریفیں سنتا رہتا تھا کل صبح وہ تقریباً ۸ بجے اپنے گھر والوں کو کچھ بتلائے بغیر کلفٹن دیکھنے کے لئے نکل گیا اس نے قصبہ موڑ سے کلفٹن تک کا راستہ جو تقریباً ۲۵ کلومیٹر بنتا ہے گھسٹتے ہوئے اور راستے میں لوگوں سے کلفٹن کا راستہ پوچھتے ہوئے طے کیا جبکہ رات کو کلفٹن کے ساحل پر گشت کرنے والے ایدھی والنٹیئرز نے اسے نیم بیہوشی کی حالت میں دیکھا تو فوری طور پر ایدھی ایمبولینس طلب کر کے ایدھی ہیڈ آفس میٹھادر کی ڈسپنسری میں لے گیا جہاں اسے فوری طبی امداد

باقی صفحہ ۹ کالم ۳

بقیہ — کلفٹن کا سفر

دینے کے علاوہ غذا بھی دی گئی اس نے ہوش میں آنے کے بعد بتایا کہ وہ قصبہ موڑ پر رہتا ہے اور وہاں اس کے باپ کی ٹیلرنگ کی دکان بھی ہے رات تقریباً ایک بجے انور کے والد رشید کو اس کی موجودگی کی اطلاع دے دی گئی اور اسے ایدھی ایمبولینس کے ذریعے اس کے گھر پہنچا دیا گیا انور کے اس کے علاوہ ۳ بھائی اور ۴ بہنیں ہیں بقول انور کے اسے لکھنے پڑھنے اور گھومنے کا بہت شوق ہے لیکن دونوں پیروں کے معذور ہونے کی وجہ سے وہ اپنا شوق پورا کرنے سے مجبور ہے انور نے مزید بتایا کہ قصبہ موڑ سے کلفٹن تک ۱۲ گھنٹے کا سفر اس نے بغیر کچھ کھائے پیئے گھسٹتے ہوئے طے کیا جبکہ راستے میں کئی لوگوں نے اس پر ترس کھا کر بھیک دینے کی کوشش کی لیکن اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ایک خبر ایک کہانی

منیر احمد راشد

یہ خبر پڑھ کر آپ کا کیا جی چاہتا ہے.... یہی ناں! کہ ہمت والے اس بچے سے ملا جائے.... ہمارا بھی یہ جی چاہا تھا۔ اور یہ سوچ کر کہ اپنے قارئین کو اس بچے سے ملوایا جائے ہم اخبار میں درج پتے پر پہنچ گئے۔ قصبہ موڑ پر اتر کر ہم نے اس کے چاروں طرف دور دور تک کا علاقہ چھان مارا مگر انور صاحب دستیاب نہ ہوئے۔ تب ہم نے دوسرے انور کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ انور کاظمی صاحب تھے۔ عبدالستار ایدھی صاحب کے پریس سیکریٹری۔ انہوں نے حسبِ عادت ہماری خوب مدد کی اور ہمیں اُسی ڈرائیور، اُسی لیبر اور اُسی ایمبولینس کے ساتھ انور کے گھر پہنچا دیا۔ انور بنارس چوک کے قریب رہتا ہے۔

جب ہم اس کے گھر پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ اس وقت کسی شریف آدمی کو تنگ کرنا مناسب نہیں تھا، اور ویسے بھی ہم صرف گھر دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ لہٰذا سلام دعا کے بعد واپس جانا چاہا مگر مانسہرہ کی مہمان نوازی آڑے آئی اور انور کے والد رشید صاحب کے اخلاق (اور کولڈ ڈرنکس) سے متاثر ہو کر ہم کچھ دیر وہاں رکے رہے۔ رشید صاحب کا تعلق مانسہرہ کے

گاؤں بھلڑہ سے ہے۔ گفتگو سے پتا چلا کہ انور بچپن سے بیمار ہے۔ اس کے گردے میں سوراخ ہے۔ جس کی وجہ سے اسے پیشاب کا مرض لاحق ہے۔ اب تک اس کا سات مرتبہ آپریشن ہوچکا ہے۔ مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ انور کی والدہ کا انتقال جون ۹۰ء میں ہوچکا ہے۔ رشید صاحب پر اب دوہری ذمہ داری ہے۔ وہ خاصے پریشان تھے۔ ظاہر ہے ایک غریب ٹیلر ماسٹر کے لئے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنا ہی کچھ کم مشکل نہیں ہوتا کہ اس پر دواؤں اور علاج کے بھاری اخراجات بھی برداشت کرنے پڑیں۔ پھر ایک باپ کے لئے یہ بات بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتی کہ اس کا جوان بیٹا اس کی غربت کی وجہ سے مستقل معذوری کا شکار ہوجائے۔ ان کی تمنا ہے کہ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان کے بیٹے کا علاج کرا سکے۔

باتوں کے دوران انور بھی کمرے میں آگیا۔ ایک موٹی سی لاٹھی کے سہارے دھیرے دھیرے قدم ٹیکتا' وہ کمرے میں داخل ہوا۔ ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ کے کارکن' اسلم' ڈرائیور قاسم عرف کاسو کو دیکھ کر مسکرایا۔ سب کو سلام کیا اور ہمارے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ انور صاف رنگت اور کمزور جسم کا مالک ہے۔ چہرے پر متانت اور آنکھوں سے ذہانت جھلکتی ہے۔ اس کی عمر ۱۵ برس ہے' مگر مستقل بیمار رہنے کی وجہ سے اس کے جسم کی نشوونما فطری انداز میں نہیں ہوسکی۔ اس لئے اپنی عمر سے کم دکھائی دیتا ہے۔ اس نے صرف ہوں ہاں میں ہماری باتوں کا جواب دیا۔ ہم سمجھ نہیں پائے کہ وہ سو رہا ہے یا شرما رہا ہے۔ خیر رات زیادہ ہوگئی تھی۔ اس لئے ہم نے کل آنے کا وعدہ کرکے اجازت لی اور اپنے گھر آگئے۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ خلاف معمول جلدی اٹھنا پڑا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوکر جب ہم گھر سے نکلے تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ ہمیں گیارہ بجے بنارس پہنچنا تھا اور اس سے پہلے مومن رحیم صاحب کو بھی ان کے گھر واقع بلاک A نارتھ ناظم آباد سے لینا تھا تاکہ فوٹو سیشن بھی آج ہی ہو جائے۔ مومن صاحب رات بھر خاص نمبر کے لئے اسکیچ بناتے رہے تھے۔ لہٰذا ہمارے پہنچنے سے قبل ہی نیند نے انہیں جالیا اور..... ہم ہاتھ ملتے رہ گئے۔ یوں گیارہ بجے سے پہلے ہی ہمارے منہ پر بارہ بج گئے۔ مجبوراً" ہم اکیلے ہی رشید ٹیلرنگ اینڈ سوات برقعہ ہاؤس پر پہنچ گئے۔ انور سامنے ہی ایک مشین پر بیٹھا بڑی مہارت سے برقعوں کے نقاب سی رہا تھا۔ اس وقت وہ پورا درزی لگ رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد ہم' انور اور اس کا چچا زاد بھائی فیصل منیر قریب ہی گلی میں واقع چائے کے ہوٹل میں آگئے۔ کوئٹہ ہوٹل کی مخصوص دودھ پتی پیتے ہوئے ہم نے پہلے مرحلے میں انور

سے خاصی بے تکلفی پیدا کی۔ انور ایک زندہ دل اور پر اعتماد لڑکا ہے۔ وہ اتنا کم گو بھی نہیں جتنا پہلی نظر میں لگا تھا۔ جب جھجک سے چائے اور دلوں سے جھجک دور ہو گئی تو ہم اصل موضوع کی طرف آئے اور انور سے پوچھا۔

○ "انور میاں پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟"

☆ "میں پڑھتا نہیں ہوں" انور نے گردن نیچی رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "بچپن میں کئی بار اسکول میں داخل ہوا لیکن بیماری کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ سکا۔ البتہ اپنی محنت سے میں نے کچھ لکھنا پڑھنا ضرور سیکھا ہے۔ اور اب میں اردو روانی سے لکھ اور پڑھ لیتا ہوں۔"

○ "اور قرآن شریف؟" ہم نے پوچھا۔

☆ "قرآن شریف کے بھی صرف تین پارے مدرسے میں پڑھے تھے باقی سارا خود پڑھا ہے۔"

○ "پڑھنے کے علاوہ تمہارے کیا کیا شوق ہیں؟"

○ "مجھے سیر و تفریح کا بہت شوق ہے"۔

○ "کھیل کون کون سے پسند ہیں؟"

☆ "مجھے کاروں اور موٹر سائیکلوں کی ریس بہت اچھی لگتی ہے۔" اس نے دلچسپی سے کہا۔ "ٹی وی پر میں یہ پروگرام ضرور دیکھتا ہوں۔ جب میری ٹانگیں ٹھیک تھیں تو ہم خود بھی سائیکلوں پر ریس لگاتے تھے۔"

○ "کیا مطلب..... کیا تمہاری ٹانگیں بچپن سے....؟؟؟"

☆ "جی نہیں میری ٹانگیں بچپن سے خراب نہیں ہیں۔ یہ تو دو ڈھائی سال قبل خراب ہوئی ہیں۔"

○ "کیسے؟"

☆ "دراصل میں پابندی سے نماز پڑھتا ہوں"۔ انور نے شرماتے ہوئے کہا۔ "دو ڈھائی سال پہلے میں اپنے گاؤں مانسہرہ گیا ہوا تھا۔ پیشاب کی تکلیف کی وجہ سے رات میں میرے کپڑے خراب ہو جاتے تھے اور نماز کیلئے مجھے صبح صبح ٹھنڈے پانی سے نہانا پڑتا تھا۔ وہیں ایک دن ٹانگوں کو ہوا لگ گئی۔ پہلے گھٹنوں میں درد ہوتا تھا۔ پھر ٹانگیں ٹیڑھی بھی ہو گئیں۔"

ہم نے اس کی ٹانگیں دیکھیں۔ وہ گھٹنوں کے نیچے سے باہر کی طرف نکلی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسی حالت میں گھٹنوں پر زور دے کر ٹانگوں سے معمول کے مطابق کام لینا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انور نہ تو بغیر سہارے کے کچھ دیر کھڑا رہ سکتا ہے اور نہ ہی ایک قدم چل سکتا ہے۔ ہم نے اس کا پائنچا گھٹنے سے نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

○ "یہ پولیو تو نہیں..... ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

☆ "ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گٹھیا ہے..... کچھ کہتے ہیں کیلشیم کی کمی ہے"

○ "اور علاج؟"

☆ "علاج!!" انور نے لمبی اور ٹھنڈی سانس لی۔ "علاج شاید ممکن نہیں...... میرے والدین نے ڈاکٹروں، حکیموں.... پیروں فقیروں.... مزاروں کے بہت دھکے کھائے ہیں مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا...... میری امی تو مجھے ہسپتالوں میں گھسیٹتے گھسیٹتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔" وہ مغموم سا ہو گیا تھا۔ چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ نا چاہتے ہوئے بھی ماحول سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ہم نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔

○ "خیر ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ البتہ مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اور مشکل کا مقابلہ حوصلے سے کرنا پڑتا ہے۔ تم جوان آدمی ہو.... تمہارے پاس حوصلے کی کمی بھی نہیں۔ بھلا جو آدمی شوق پورا کرنے کے لئے ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ گھسٹتے ہوئے طے کرے وہ کم حوصلہ کیسے ہو سکتا ہے......" ہم نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ "یہ کلفٹن والی کیا کہانی ہے؟" ہماری بات پر انور بھی مسکرا دیا۔ کہنے لگا "کچھ نہیں.... بس شوق تھا کلفٹن دیکھنے کا..... بچپن ہی سے شوق تھا۔" "اور اس دن ابا نے مارا تو یہ شوق کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔" ہم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "گھر سے بھاگ کر گئے تھے ناں؟"

ہماری بات پر وہ خوش دلی سے ہنسا "آپ ٹھیک کہتے ہیں.... دراصل مجھے غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔ اس روز ابا جان نے ڈانٹا تو مجھے بہت ہی غصہ آیا۔ اور میں گھر سے نکل گیا۔"

○ "اچھا تھوڑی تفصیل تو بتاؤ کہ تم کہاں کہاں سے اور کیسے کلفٹن پہنچے۔" ہم نے پوچھا۔

☆ "میں معمول کے مطابق صبح کو دکان پر گیا تھا...... یہ ڈانٹ والے دن سے اگلے دن کی بات ہے۔ تقریباً آٹھ بجے میں نے اپنی سائیکل اٹھائی اور بنارس کی طرف نکل گیا۔ یہ لوگ سمجھے کہ میں گھر جا رہا ہوں۔ میں دن میں اکثر دکان سے گھر جاتا رہتا ہوں۔ اس لئے کسی کو شک نہیں ہوا۔ بنارس تک پیدل آنے کے بعد فٹ پاتھ کے سہارے میں سائیکل پر سوار ہوا اور عبداللہ کالج، پاپوش، پٹرول پمپ، لالوکھیت، گرومندر، صدر، جناح ہسپتال کے رستے کینٹ تک پہنچا۔"

○ "کیا تم "ون ڈی" میں کنڈیکٹری کرتے رہے ہو؟" روٹ کی تفصیل سننے کے بعد ہم نے پوچھا، وہ ہنس دیا۔ کہنے لگا۔

☆ "نہیں..... دراصل پہلے میں بس میں اس رستے کلفٹن گیا تھا۔ اور مجھے یہی یاد تھا۔"

○ "رستے میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔"

☆ "مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ بنارس سے

ہی میری ٹانگوں میں درد شروع ہو گیا تھا۔ پھر سائیکل بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اگلے ٹائر میں ہوا کم تھی۔ ٹائر کی خراب حالت کی وجہ سے ہوا بھی نہ بھروائی۔ بریکیں خراب تھیں۔ ہوا مخالف تھی۔ پھر ٹریفک کا رش اور لوگوں کی بے حسی۔"

○ "اچھا کوئی مزے دار بات بھی تو ہوئی ہو گی؟"

☆ "مزے دار بات۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں مزیدار بات یہ ہوئی تھی کہ پاپوش کے پاس ایک کار والے نے پیچھے سے مجھے ٹکر ماری اور پھر مجھے ہی ڈانٹنے لگا۔ میں خاموش اس لئے رہا کہ اس معمولی سے ٹکر سے میں وہ چڑھائی چڑھنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو بہت زور لگانے کے باوجود میں چڑھ نہیں پا رہا تھا۔ لالوکھیت دس نمبر پر ایک ٹیکسی کی ڈگی میں سات آٹھ بکرے کے بچے ٹھنسے ہوئے تھے جیسے اسکول وین میں اسکول کے بچے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آئی تھی۔"

○ "تم سائیکل پر سفر کرتے رہے۔ پھر بھی بارہ گھنٹے میں کلفٹن پہنچے"؟

☆ "سائیکل تو صرف میرا سہارا ہے۔ اس سے میری رفتار میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ سائیکل پر تو میں وہاں بیٹھتا ہوں جہاں ڈھلان ہو۔ ورنہ تو میں اس کے سہارے پیدل چلتا ہوں۔ اور دوسری بات یہ کہ میں کلفٹن تک نہیں جاسکا تھا۔ تین تلوار کی چورنگی تک پہنچتے پہنچتے ہی میری ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ اور رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ میں کوشش کے باوجود کھڑا تک نہیں ہو سکتا تھا۔"

○ "تم رستے سے ہی واپس کیوں نہیں آگئے؟"

☆ "میں نے کئی بار سوچا تھا کہ واپس چلوں.....پھر سوچا کہ نہیں کلفٹن دیکھ کر جاؤں گا۔ دراصل میرا خیال تھا کہ میں دوپہر تک کلفٹن پہنچ جاؤں گا۔ دوپہر کے وقت میں صرف گرومندر تک پہنچ سکا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا۔ کہ صدر کے فوراً بعد کلفٹن آجائے گا۔ اس لئے اتنا آگے آنے کے بعد واپس جانا ٹھیک نہیں۔"

○ "تمہیں لوگوں نے رستے میں بھیک دینے کی بھی کوشش کی تھی؟"

☆ "؟نہیں ایسا نہیں ہوا۔ میرے پاس پچاس روپے موجود تھے۔ میں نے صدر میں لسی بھی پی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ صاف کپڑے پہنے سائیکل والے فقیر کو کوئی بھیک نہیں دیتا۔"

○ "رات آٹھ بجے سے بارہ بجے تک تم وہاں بیٹھے رہے۔ تمہیں گھر یاد نہیں آیا۔ ڈر نہیں لگا؟"

☆ "ڈر تو خیر مجھے بالکل نہیں لگا۔ رات دس بجے کے قریب پولیس والے بھی آئے تھے۔ میں

نے انہیں ٹرخا دیا۔ البتہ امی بہت یاد آئی تھیں۔ میں دیر تک انہیں یاد کر کے روتا رہا کہ اگر وہ زندہ ہوتیں تو مجھے گھر سے نہ بھاگنا پڑتا۔" ماحول پھر غم زدہ ہو رہا تھا اس لئے جلدی سے موضوع بدلا۔

○ "گھر تک واپس کیسے آئے؟"

☆ "ایدھی والوں نے مجھے رات بارہ بجے وہاں سے اٹھایا۔ میں نے ان کو سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا تھا۔ پہلے وہ مجھے اپنے سینٹر لے گئے پھر گھر چھوڑا۔"

○ "ایدھی والوں کا رویّہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟"

☆ "ایدھی والوں کا رویّہ...... ایسا تھا کہ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ آئندہ اگر میں گھر سے بھاگا تو ایدھی والوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔

○ "کیا مطلب!؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔ انور ہماری حیرت سے خوب محظوظ ہوا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

☆ "جب میں ایدھی سینٹر پہنچا تو میری حالت بہت بُری تھی۔ ٹانگیں بے جان تھیں۔ کپکپا رہی تھیں۔ بھوک سے برا حال تھا۔ اپنی بے بسی اور حماقت پر غصہ آ رہا تھا۔ میں آرام کرنا چاہتا تھا مگر وہاں جو بھی آتا مجھ سے ایک ہی جیسے سوال کرتا۔ بیسیوں مرتبہ اپنی کہانی دہراتے ہوئے مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ تب میں نے یہ سوچا۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ ان کا سلوک میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ انہوں نے مجھے چائے بسکٹ دیئے۔ چادر دی۔ بڑے آرام سے لٹایا۔ اور جب پتا کنفرم ہو گیا تو مجھے میرے گھر تک پہنچایا۔ بلاشبہ یہ ان کا احسان ہے۔"

○ "اچھا یہ بتاؤ مستقبل میں کیا ارادے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

☆ "گھر سے بھاگنے کے؟" انور نے الٹا ہم سے سوال کر ڈالا۔

○ "نہیں بھئی.... بڑے ہو کر کیا بنو گے؟"

☆ "مجھے تجارت پسند ہے۔ میں کریانہ اسٹور کھولوں گا۔"

○ "تم ٹیلرنگ کا کام تو اچھا بھلا کر لیتے ہو گے؟"

☆ "جی ہاں میں ہر طرح کی سلائی کر لیتا ہوں۔ لیکن میں تاجر بننا چاہتا ہوں۔"

انور نے کہا۔ اس وقت انور کے والد صاحب بھی آگئے۔ جمعہ کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے اسے دعا دی کہ اللہ اسے اس کے مقاصد میں کامیاب کرے۔ آئندہ کے لئے گھر سے نہ بھاگنے کی نصیحت کی۔ اور رشید صاحب کے ساتھ ہوٹل سے نکل آئے۔ رشید صاحب نے دوبارہ اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ "تو قارئین کیا آپ ایک غریب ٹیلر ماسٹر کے جوان اور ذہین بیٹے کے علاج میں کچھ مدد کریں گے؟" ■

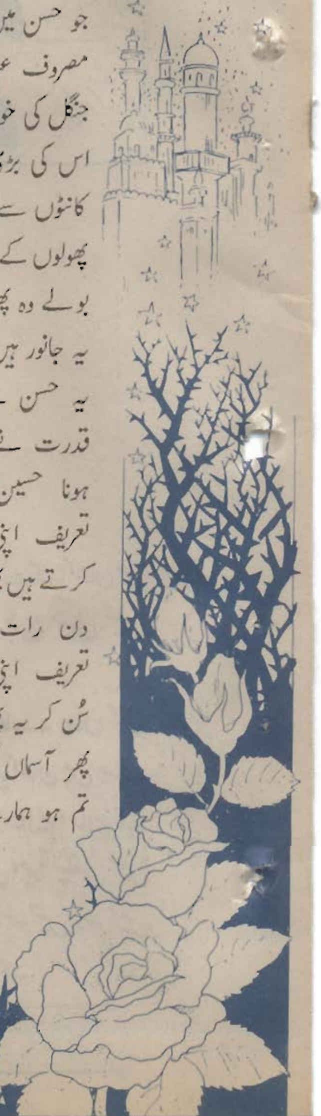

جو حسن میں تھے یکتا، تھے خوبیوں کے مالک
جنگل میں جن کا جلوہ ہر اک نظر کو بھایا

مصروف عبادت میں رہتے تھے وہ خدا کی
لیکن نہ جانے کیوں یہ ان کو خیال آیا

جنگل کی خوشبوئیں ہیں قائم ہمارے دم سے
تعریف کرنے اپنی پھر بھی نہ کوئی آیا

اس کی بڑی وجہ ہے کانٹوں کا ساتھ ہونا
پھولوں کی اہمیت کو کانٹوں نے ہے گرایا

کانٹوں سے پھر وہ بولے دیکھو تو اپنی صورت
لگتا ہے جیسے تم پر آسیب کا ہو سایا

پھولوں کے طعنے تشنے سن کر بھی تھے وہ خاموش
لیکن یہ سن کے جملہ کانٹوں کا دل بھر آیا

بولے وہ پھر یہ رو کر ہم بھی اہم ہیں سن لو
رب نے ہمیں محافظ تم سب کا ہے بنایا

یہ جانور ہیں سارے بے شک تمہارے شیدا
گر ہم نہ ہوں تمہارا کر دیں گے یہ صفایا

یہ حسن ہے تمہارا دم سے ہمارے قائم
ہر موذی جانور سے ہم نے تمہیں بچایا

قدرت نے گر تمہیں ہے حسن و جمال بخشا
ہم کو کسی سے کم تر اس نے نہیں بنایا

ہونا حسین کوئی خوبی نہیں ہے یارو
اعمال سے ہی پایا جس نے بھی نام پایا

تعریف اپنی سننا انسان کی ہے خصلت
اور اس کو بھول جانا جس نے اسے بنایا

کرتے ہیں پھر بھی خدمت بے لوث ہم تمہاری
لیکن کبھی بھی تم پر احساں نہیں جتایا

دن رات ذکر اس کا کرنا ہمارا شیوہ
اس سینہ زمین پر جس نے ہمیں اُگایا

تعریف اپنی کرنا ہم کو کہاں ہے زیبا
تعریف اس خدا کی جس نے ہمیں بنایا

سُن کر یہ پھول بولے تم ہم کو معاف کر دو
غفلت میں پڑ کے ہم نے دل آپ کا دُکھایا

پھر آسماں کی جانب وہ سر اُٹھا کے بولے
ہم سب کی غلطیوں کو تو معاف کر خدایا

تم ہو ہمارے محسن پھولوں نے یہ کہا پھر
کانٹوں کو مُسکرا کر اپنے گلے لگایا

آمنے سامنے

اسٹار کھلاڑیوں سے سوال جواب کا دلچسپ سلسلہ

سلیم خالق

آمنے سامنے کے لئے گزشتہ ماہ ہم نے ٹیبل ٹینس کے کھلاڑی عارف ناخدا اور نازو انور کو مہمان بنانے کا اعلان کیا تھا۔ نازو انور انٹرویو کے لئے دستیاب نہیں ہو سکیں اسی وجہ سے صرف عارف ناخدا سے کئے گئے سوالات کے جوابات حاضر ہیں۔

عارف ناخدا سے مل کر اندازہ ہوا کہ وہ ایک نہایت خوش اخلاق، نماز روزے کے پابند انسان ہیں۔

سوال : عارف بھائی کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں ٹیبل ٹینس، کرکٹ یا ہاکی کی طرح مقبول نہیں ہے؟ (کاشف عالم، کراچی)

عارف ناخدا : اصل میں ہمارے یہاں کوئی انڈور جمنازیم نہیں ہے۔ پورے پاکستان میں صرف ایک معیاری جمنازیم لیاقت جمنازیم اسلام آباد میں ہے۔ کراچی لاہور میں کوئی اچھا کمپلکس نہیں ہے، جب تک کھلاڑیوں کو یہ سہولتیں میسر نہیں ہوں گی یہ کھیل مقبول نہیں ہو گا۔

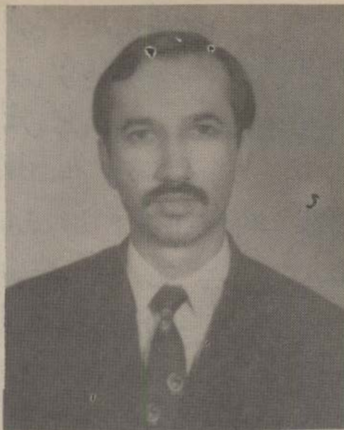

سوال : عارف بھائی آج کل جو نوجوان کھلاڑی ٹیبل ٹینس کھیل رہے ہیں ان میں سے آپ کس کھلاڑی کے کھیل سے متاثر ہوئے؟ (نوید ہاشمی' احتشام ہاشمی' حرا ہاشمی' کراچی)

عارف ناخدا : الائیڈ بینک کے کھلاڑی کاشف رزاق کے کھیل سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ ان کی عمر صرف ۱۹ سال ہے مجھے امید ہے کہ وہ مستقبل میں بہت اچھے ثابت ہوں گے۔

سوال : بچے تو زیادہ تر کرکٹ یا ہاکی کھیلنا پسند کرتے ہیں یہ آپ ٹیبل ٹینس میں کیسے آگئے؟ (مسعود احمد سومرو' گڈو)

عارف ناخدا : بچپن میں میں لٹل فاکس اسکول میں پڑھتا تھا وہاں پر ایک ٹوٹی پھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ وہیں سے ٹیبل ٹینس کھیلنا شروع کیا۔ پھر شرف آباد کلب جوائن کرلیا۔ ۷۲ - ۱۹۷۱ء میں

انعامی سوال

سوال : عارف بھائی آپ کو ٹینس کی ٹیبل زیادہ پسند ہے یا کھانے کی؟ (سیدہ نورین کاظمی' کراچی)

عارف ناخدا : اصل میں آدمی کا دھیان جس طرف زیادہ ہوتا ہے اسے وہی چیز زیادہ پسند ہوتی ہے' میرا دھیان ٹینس والی ٹیبل پر زیادہ ہے اس لئے مجھے وہی ٹیبل زیادہ پسند ہے۔ آپ کو شاید کھانے والی کیونکہ ---؟

چائنا (China) سے کوچ پاکستان آئے تھے انہوں نے سکھایا تو شوق اور زیادہ بڑھا۔

سوال : آپ نے اب تک جتنے میچ کھیلے ہیں ان میں سے سب سے زیادہ بہترین میچ کس کے ساتھ رہا؟ (پرنس افضل شاہین)' بہاولنگر)

عارف ناخدا : ۱۹۹۱ء کی قومی چیمپئن شپ میں فرجاد سیف کے ساتھ ہونے والا میچ میرا یادگار ترین میچ ہے۔ اس میچ کے پہلے دو گیم میں بُری طرح ہار گیا تھا اور پھر باقی ۳ گیم جیت کر میچ جیت گیا تھا۔ جس کی مجھے قطعی امید نہیں تھی۔

سوال : عارف ناخدا صاحب اگر میں ٹیبل ٹینس سیکھنے کے لئے آپ کے پاس آؤں تو کیا آپ مجھے سکھائیں گے؟ (فرحان محمد حسین' کراچی)

عارف ناخدا : جی ہاں ضرور اگر آپ کو ٹیبل ٹینس کھیلنے کا شوق ہے تو ضرور آئیے۔

سوال : عارف بھائی! آپ اپنے بچپن کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ سنائیے؟ (صائمہ اکرم، صادق آباد، حفیظ اللہ طارق، کمالیہ)

عارف ناخدا : بچپن میں ایک بار میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک جھیل میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے گیا، مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ اب میں ذرا سا آگے گیا تو جھیل میں گر گیا اور ڈوبنے لگا۔ میرے دوست بھی چھوٹی عمر کے تھے وہ مجھے بچانے کی کوشش کرنے لگے مگر ناکام رہے۔ اتفاق سے اس وقت ایک گھوڑے والا وہاں آیا اور پھر اس نے مجھے بچایا۔

سوال : ہر انسان کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ضرور ہوتا ہے۔ جب آپ نے ٹیبل ٹینس کھیلنا شروع کیا تو آپ کے آئیڈیل کون تھے؟ (عالم شفیع ہمدم، جھنگ)

عارف ناخدا : جب میں نے ٹیبل ٹینس کھیلنا شروع کیا تب میرے آئیڈیل سہیل حیات اور جاوید حیات تھے۔

سوال : عارف بھائی آپ کو ٹیبل ٹینس کے کھیل سے وابستہ ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟

(عبدالوحید عباس، لاڑکانہ)

عارف ناخدا : مجھے ٹیبل ٹینس کھیلتے ہوئے تقریباً ۲۵ سال ہو گئے ہیں۔

سوال : عارف صاحب! آج کل آپ ٹیبل ٹینس کھیل رہے ہیں یا دلچسپی کم ہو گئی ہے؟ (کاشف عالم، علی رضا، پشاور)

عارف ناخدا : جی ہاں ڈومیسٹک سطح پر میں اب بھی کھیلتا ہوں۔ پچھلے سال میں نے دو ٹورنامنٹ بھی جیتے ہیں۔

سوال : عارف بھائی کیا وجہ ہے کہ ہم ٹیبل ٹینس میں صرف سیف گیمز تک محدود ہیں؟ (عبدالقدیر اندھڑ، پنوں عاقل)

عارف ناخدا : ہر دوسرے سال کھیل کی تیکنیک بدلتی رہتی ہے۔ جب تک آپ اس تکنیک کو نہیں دیکھیں گے تو کیسے آگے آئیں گے۔

سوال : آپ اب تک کتنی بار قومی چیمپئن بن چکے ہیں؟ (پرنس افضل شاہین، بہاولنگر)

عارف ناخدا : میں اب تک تین بار قومی چیمپئن بن چکا ہوں ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۳ء اور ۱۹۹۱ء میں۔

سوال : عارف بھائی، کرکٹ، ہاکی، اسکواش اور اسنوکر کی طرح کیا ہم ٹیبل ٹینس کے ورلڈ چیمپئن بن سکتے ہیں؟ (ثمن علی بخاری، شہربانو بخاری، شائستہ علی بخاری، شہریار بخاری، رحیم یار خان)

عارف ناخدا : جی ہاں کیوں نہیں جیت سکتے۔ بس اس کے لئے کھلاڑیوں کو کوچنگ کے لئے بیرون ملک بھیجنا چاہیئے۔ تاکہ وہ مزید بہتر کھیل کا مظاہرہ کریں۔

آمنے سامنے کے آئندہ ماہ کے مہمان
شاہد علی خان (ہاکی کے مایہ ناز گول کیپر)

سوالات بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۰ مئی ۱۹۹۵ء
سوالات بھیجنے کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی
۱۔پی۔ آئی۔بی کالونی، کراچی

بُل اور بِل ہیں سر کے بَل

FIRST-AID BANDAGE
SANIPLAST ®
سنی پلاسٹ فوری امدادی پٹی
ہمیشہ اپنے پاس رکھیں
ہر زخم پٹی سنی پلاسٹ نہیں
دام دینے سے پہلے
نام ضرور دیکھ لیں۔
FIRST-AID BANDAGE
SANIPLAST
MINI PACK
NICHIBAN
FIRST-AID BANDAGE
SANIPLAST
چھوٹا زخم۔ فوری آرام
پیارے بچو! آپکو اسکول کے اوقات، کھیل کود اور دیگر
مشاغل میں عموماً خراش، چھالے، چھوٹے زخم لگ
جاتے ہیں۔ فوری امدادی پٹی سنی پلاسٹ استعمال
کریں.... ہمیشہ سنی پلاسٹ کو اپنے اسکول بیگ،
اسپورٹس کِٹ، کتابوں کی الماری یا جیب میں ۲ ایک
پٹیاں رکھیں تاکہ فوری ضرورت پر آپ SANIPLAST
فوری امدادی پٹی استعمال کر سکیں۔
سنی پلاسٹ کا پیغام
صاف ستھرا ماحول، صحت مند معاشرہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے
Marketed by:
uniferoz
UF/SP/MP/A/95
NATIONAL

ہنستی ہنستی

منتخب لطائف

ایک شخص نے اپنے وکیل سے پوچھا۔ "کیا مقدمے کا فیصلہ اپنے حق میں کروانے کے لئے جج کو تحفہ بھجوانا سودمند رہے گا۔"

وکیل نے اسے بتایا۔ "نہیں نہیں، یہ تو رشوت ہوگی، جج توہینِ عدالت کے جرم میں آپ کو سزا بھی دے سکتا ہے اور ممکن ہے وہ آپ کے بالکل خلاف ہو جائے۔"

چند دن بعد وہ صاحب مقدمہ جیت گئے اور انہوں نے اپنے وکیل سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے میں نے جج کو جو تحفہ بھیجا تھا، اس کا اچھا اثر ہوا ہے۔"

وکیل نے حیرت سے کہا "آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے میرے روکنے کے باوجود جج کو تحفہ بھیج دیا۔"

ان صاحب نے اطمینان سے مسکرا کر جواب دیا۔

"جی ہاں! لیکن یہ تحفہ میں نے اپنے مخالف کی طرف سے بھیجا تھا.....!"

مرسلہ : یاسر بن صغیر، کراچی۔

استانی نے کلاس سے پوچھا۔

"بچو! آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ گائے کے چمڑے کا کیا فائدہ ہے؟"

کلاس کی سب سے ذہین لڑکی نے کھڑے ہو کر کہا۔

"مس..... یہ ساری گائے کو ایک جگہ اکٹھا رکھتا ہے۔"

مرسلہ : جنید اختر، کراچی۔

کلب میں ایک صاحب نے تین آدمیوں اور ایک کتے کو ایک ساتھ تاش کھیلتے دیکھا تو وہ حیران رہ گئے اور کہنے لگے۔ "بہت ہی ہوشیار کتا معلوم ہوتا ہے۔"
کتے کا مالک بولا۔ "اتنا ہوشیار بھی نہیں ..... کم بخت کے پاس جب بھی اچھے پتے آتے ہیں دُم ہلانے سے خود کو روک نہیں سکتا۔"

مرسلہ : تہمینہ ساجد، خانیوال۔

ماں : "بیٹا، تم جلدی سے منہ ہاتھ دھولو، میں تمہیں دو بسکٹ دوں گی۔"
بیٹا : "امی آپ مجھے پورا ڈبہ لادیجئے، میں نہا ہی لیتا ہوں۔"

مرسلہ : حارث بن صغیر، کراچی۔

ایک آدمی ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "آپ گھر جاکر مریض دیکھنے کی کتنی فیس لیتے ہیں؟"
"جی دس روپے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔
اس شخص نے کہا "تو پھر جلدی کریں، میری بیوی گھبرا رہی ہوگی۔"
ڈاکٹر نے جلدی سے ضروری سامان لیا اور اس آدمی کو کار میں بیٹھا کر چل پڑا۔ ایک دروازے کے قریب جاکر اس شخص نے کار رکوالی۔ اور کہا۔ "یہ لیجئے، دس روپے"
ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آپ مریضہ کو نہیں دکھائیں گے؟"
آدمی نے جواب دیا۔ "دراصل میری بیوی بیمار نہیں تھی، بات یہ تھی کہ کوئی ٹیکسی والا تیس روپے سے کم میں مجھے یہاں لانے کو تیار نہیں تھا۔"

مرسلہ : اسد بن صغیر، کراچی۔

مشہور شاعر مجاز سخت بیمار تھے۔ ہسپتال میں دوستوں کا ایک گروہ عیادت کے لئے پہنچا۔ ایک نے کہا۔
"مجاز! زندہ باد اب تم ٹھیک ٹھاک نظر آتے ہو۔" دوسرے نے کہا۔ "تمہارے چہرے پر سرخی جھلک رہی ہے۔"
تیسرے نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے آنکھوں میں پرانی چمک عود کر آئی ہے۔ اب تم بالکل صحت مند دکھائی دیتے ہو۔"
مجاز نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "خوشی کا مقام ہے کہ میں تندرستی کی حالت میں

مر رہا ہوں۔"

مرسلہ : محمد آصف، کراچی۔

ایک صاحب نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ نے واقعی اپنا وعدہ پورا کر دکھایا آپ نے کہا تھا کہ آپ کے علاج کی بدولت دو مہینے کے اندر اندر، میں اپنے پیروں سے چلنے کے قابل ہو جاؤں گا۔"

ڈاکٹر : "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔"

مریض : ہونا بھی چاہیے۔ کیونکہ مجھے اپنی کار بیچ کر آپ کا بل ادا کرنا پڑا ہے۔"

مرسلہ : ندیم شاہد، لاہور۔

حامد : "تم جو چھتری کل مجھ سے مانگ کر لے گئے تھے، لائے ہو؟"

محمود : "نہیں! ایک دوست مانگ کر لے گیا ہے۔ کل واپس دے گا۔"

حامد : "یہ بہت برا ہوا جس شخص نے وہ چھتری میرے دوست عمران کو مستعار دی تھی، وہ عمران سے کہہ رہا تھا کہ چھتری کا اصل مالک تقاضا کر رہا ہے۔"

مرسلہ : وسیم احمد، رحیم یار خان۔

"کیا میں جہاز میں بیٹھ کر خدا کے پاس پہنچ سکتا ہوں؟"

"ہاں! بشرطیکہ تم اڑتے ہوئے جہاز سے چھلانگ لگا دو۔" مرسلہ : فہد فہیم خان، سوات۔

سرکس کے منیجر نے اعلان کیا کہ آج سرکس میں داخلہ مفت ہے۔

جب پروگرام ختم ہوا تو منیجر نے گیٹ بند کر دیا اور اعلان کیا۔

"خواتین و حضرات! سرکس دیکھنے کی کوئی رقم نہیں۔ البتہ باہر جانے کا ٹکٹ دس روپے ہے۔"

مرسلہ : حماد عثمانی، کراچی۔

کسی نے ہاکی کے کھلاڑی سے پوچھا۔ "کالج میں تمہارا بھائی کیسا ہے؟"

"ہاف بیک"

"میرا مطلب ہے پڑھائی میں کیسا ہے۔"

"اوہ۔" کھلاڑی نے کہا۔ "تعلیم کے میدان میں وہ فل بیک ہے۔"

مرسلہ : فرحان خالق، کراچی۔

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "دیکھو قدرت میری کس طرح مدد کرتی ہے۔ مجھے کچھ

درخت گرانے تھے کہ طوفان نے آکر مجھے اس زحمت سے بچالیا۔ پھر مجھے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر جلانا تھا کہ بجلی گری اور وہ خود بخود جل کر راکھ ہوگیا۔"

دوست نے پوچھا۔ "اچھا تو اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"اب مجھے آلو اور گاجریں زمین سے نکالنی ہیں۔" اس شخص نے بتایا۔ "اور مجھے زلزلے کا انتظار ہے۔"

مرسلہ : نوید ہاشمی، کراچی۔

ایک عورت : "بہن ایمانداری میں بڑی برکت ہے۔"

سہیلی : "وہ کیسے؟"

عورت : "کل میں بس میں سفر کر رہی تھی کہ اچانک خیال آیا کہ ایمانداری کا تقاضا ہے کہ ٹکٹ ضرور خریدوں۔ میں نے کنڈیکٹر کو بلایا اور اسے پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ ٹکٹ دو روپے کا تھا۔ کنڈیکٹر نے نوٹ دس روپے کا سمجھ کر مجھے آٹھ روپے واپس کردیئے۔

مرسلہ : وقاص احمد، راولپنڈی۔

استاد : "اور" کی انگریزی بتایئے؟

شاگرد : "اینڈ"

استاد : "شاباش۔ اب بتایئے "اوروں" کی انگریزی کیا ہوگی۔"

شاگرد : "اینڈوں۔"

مرسلہ : کاشف عالم، کراچی۔

ایک صاحب نے اپنی سالگرہ پر دوستوں کو مدعو کیا۔ دوستوں نے دیکھا کہ کیک کے بیچ میں موم بتیوں کے بجائے ایک بلب جل رہا ہے۔ دوستوں نے حیرت سے اس کی وجہ پوچھی تو جواب ملا۔

"یہ میری ساٹھویں سالگرہ ہے اور یہ بلب ساٹھ واٹ کا ہے۔

موم بتیاں بہت مہنگی تھیں۔"

مرسلہ : روبینہ ناز، مخدوم پور۔

استاد : "سورج کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہے؟"

شاگرد : "ہمیں اس کی وجہ سے تو گرمیوں کی چھٹیاں ملتی ہیں۔"

مرسلہ : شارب احمد، گجرانوالہ۔

Draperies made beautiful!
Your curtains are specially majestic. To you and to your home. They bring in beauty. But they have to look neat, clean and beautiful. Dirt, exposure to sunlight, heat and dust, cause the fabric to wear and the colours to fade.
No need to worry anymore.
Our experts will clean your draperies and restore the style and pleats. A sure, safe way to extend the life of your draperies.
The Snowhite way!
iFi
Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
Karachi–Multan–Lahore–Rawalpindi–Islamabad
Head Office: Sonowhite Centre, Abdullah Haroon Road, Karachi. Phones: 5681723-5681724-5685124-3
Lines Fax: 5683936
KARACHI
• Bahadurabad, Tel: 4933690 • Clifton, Tel: 573298 • Gurumandar, Tel: 410521 • Kharadar Tel: 204175
• Burns Road, Tel: 213336 • Defence, V Tel: 577834 • Garden Road, Tel: 7722433 • Shahrah-e-Faisal Tel: 446682
• Carpet Cleaning Div., Tel: 5681723-2 Lines • University Road Tel: 477714
MULTAN
• Khan Plaza Cant. Tel: 40538
LAHORE
• Liberty Market Tel: 5712957-8 • Defence • Garden Town
RAWALPINDI
• Mall Road, • Murree Road. • Airport Road.
ISLAMABAD
• Blue Area Tel: 812803

فرقان وہاب کی شوخ لکیریں

اب میں کیا کروں

میرے مزاج میں غصہ بہت زیادہ ہے۔ بات بات پر لڑ پڑتا ہوں۔ اور جب لڑائی چھڑ جاتی ہے تو پھر مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہتا کئی بار تو لہولہان گھر واپس آیا ہوں۔ بس کنڈیکٹروں تک سے مار پٹائی کی نوبت آچکی ہے۔ گھر میں امی یا بڑے بھائی سمجھاتے ہیں تو ان سے الجھ جاتا ہوں۔ جو کچھ منہ میں آئے گا اول فول بک دوں گا۔ صرف ابا جان سے ڈرتا ہوں کیونکہ وہ سخت سزا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی سے خوف نہیں آتا۔ کبھی کبھی مجھے خود بھی خیال آتا ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے ۔ لیکن کیا کروں۔ جب غصہ آتا ہے تو یقین جانیئے ایسا لگتا ہے جیسے مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ آپے سے باہر ہو جاتا ہوں۔ میری ان باتوں سے گھر والے بھی پریشان رہتے ہیں اور اب تو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ لیکن کیا کروں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اپنی اس عادت سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ آپ ہی کوئی حل بتائیے۔ میرے غصے ، جھنجلاہٹ اور چڑچڑے پن کا کیا علاج ہے؟

(م، س ـــــ ملتان)

گذشتہ شمارے میں ت ع کراچی نے اپنا مسئلہ پیش کیا تھا کہ ان کے والدین ان کے چھوٹے بھائی کو اہمیت دیتے ہیں اور بڑا بھائی ہونے کے باوجود ان کی اپنی کوئی حیثیت والدین کی نگاہ میں نہیں ہے۔ ت ع نے پوچھا تھا کہ کیا ساری ذمہ داریاں بڑے بھائیوں کے لئے ہوتی ہیں اور پیار و محبت کے مستحق چھوٹے بھائی ہوتے ہیں۔ قارئین نے اس کا حسب ذیل جواب دیا۔

افشاں غفار، کراچی۔ ت ع صاحب آپ تو بہت ہی حساس طبیعت کے مالک ہیں صرف گھر والوں کے رویئے کی وجہ سے اپنی زندگی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو غور کرنا چاہیئے تھا کہ والدین آپ کے چھوٹے بھائی سے کیوں پیار کرتے ہیں۔ آپ سے کیوں نہیں کرتے۔ جب آپ چھوٹے تھے تو آپ بھی اتنے ہی پیارے ہوں گے۔ آپ چھوٹے بھائی سے بڑھ کر والدین کی خدمت کریں۔ والدین آپ سے بھی پیار کریں گے اور آپ کو دعائیں بھی دیں گے۔

رملہ مظہر، فیصل آباد۔ جناب ت ع.... آپ کے امی ابو آپ کے بھائی یا بہن کو پسند کرتے ہیں تو ضرور اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ شاید وہ آپ کی کسی عادت کو ناپسند کرتے ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو آپ اس عادت کو جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کیجئے۔

خرم وڑائچ، لاہور۔ ہوسکتا ہے آپ پڑھائی میں وہ معیار پیش نہ کرسکے ہوں جو آپ کے چھوٹے بھائی نے پیش کیا ہے، اِس لئے والدین اسے زیادہ چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اپنی پڑھائی پر زیادہ توجہ دینی چاہئے۔

نادیہ شارق، عزیز آباد کراچی۔ بہت سے گھروں میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چھوٹا بھائی تو نا سمجھ ہے اور بڑا بھائی تو پھر سمجھ دار ہے۔ یعنی اگر بڑے بھائی سمجھ دار ہوتے ہیں تو آپ کو بھی سمجھ داری کا ثبوت دینا چاہئے۔ حضورؐ نے فرمایا "بڑے بھائی کا حق چھوٹے بھائی پر ایسا ہے جیسے والد کا حق اولاد پر۔"

عبدالقدیر اندھڑ، پنوں عاقل۔ ت ع کو چاہیئے کہ وہ ساری باتیں لکھ کر اپنے امی اور ابو کے کمرے میں رکھوادیں۔ پھر دیکھئے ان کا کیا جواب آتا ہے۔

تنویر حسن، کراچی۔ اگر آپ میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو آپ کے بھائی میں ہیں تو پھر آپ کے والدین واقعی زیادتی کررہے ہیں۔ میں خود بڑا بھائی ہوں اور آپ کے مسئلے کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ آپ ایسا

کریں کہ اپنے چچا یا ماموں یا کسی رشتے دار کو اعتماد میں لے کر انہیں اپنے مسئلے سے آگاہ کیجئے تاکہ وہ آپ کے والد سے بات کر کے آپ کے جذبات سے آگاہ کریں۔

بشریٰ شارق، کراچی۔ آپ کو چاہیئے کہ اپنے امی ابو اور چھوٹے بھائی سے اچھی طرح پیش آئیں اور ہر طرح سے ان کی خدمت کریں تاکہ وہ لوگ بھی آپ سے پیار کرنے لگیں۔

شبانہ حنیف، ٹنڈو آدم۔ اصل میں آپ کے والد آپ کو اپنا جانشین سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ان کی نظروں کے سامنے رہیں اسی لئے تو وہ آپ کے چھوٹے بھائی کو لاہور بھیج رہے ہیں لیکن آپ کو نہیں......وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔

مسعود احمد سومرو، جیکب آباد۔ والدین کو خوش رکھئے اور پڑھائی پر توجہ دیجئے انشاء اللہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر سید صولت علی جعفری، حیدر آباد۔ بھائی آپ کوئی ایسا کارنامہ کریں کہ آپ کے گھر والے تو کیا پورا شہر آپ کی تعریف کرے۔

شبانہ صدیقی، نارتھ ناظم آباد، کراچی والدین کے لئے ایک شعر نوٹ کر لیجئے۔ اس پر غور کیجئے گا۔ تو والدین سے شکایت دور ہو جائے گی۔

تیری ذات سے محبت، ترے حکم کی اطاعت
یہی زندگی کا مقصد، یہی اصل دین و ایماں

شفقت علی شاہین، سرگودھا۔ والدین کی تعریف کیا کریں اور پڑھائی پر توجہ دیں۔ انشاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

محمد حیات خان نیازی، راولپنڈی۔ چھوٹا بھائی بھی ایک نعمت ہے۔ جب آپ کسی پریشان اور مصیبت میں گھرے رہیں گے اور والدین کا سایہ بھی نہیں ہو گا تو یہ چھوٹا بھائی ہی آپ کے کام آئے گا۔ کیا سمجھے؟

عبید الرحمٰن، کراچی۔ آپ مجھے احساس کمتری میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس احساس سے خدارا نکل آیئے۔

انعام یافتہ حل

اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ بے غرض محبت کرنے والی اور بھلا چاہنے والی ہستی والدین کی ہوتی ہے۔ والدین اپنی اولاد کی خوشی کے لئے ناقابل بیان تکالیف اٹھاتے ہیں۔ جب بچہ اپنے والدین کا اکلوتا ہوتا ہے۔ تو ان کی ساری توجہ، محبتیں اور چاہتیں اکلوتے بچے پر نچھاور ہوتی ہیں لیکن جب اس کا ایک اور بھائی یا بہن آجاتا ہے تو والدین کی مصروفیات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کی توجہ بٹ جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ بعض اوقات اپنی اولاد سے انصاف نہیں کرپاتے اور ان کا بڑا بچہ ان سے دور ہوتا جاتا ہے۔ جس کو والدین بہن بھائیوں میں بڑا ہونے کی وجہ سے اس کی متانت اور سنجیدگی سمجھتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس چھوٹا بچہ شوخ و چنچل ہوتا ہے اور اپنی خواہشات و ضروریات کا اظہار بلا تامل کر دیتا ہے۔ اور بڑا بچہ اپنی خواہشات کا اظہار کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے اور دوسری طرف والدین چھوٹے کی نسبت بڑے کو زیادہ بااعتماد، خود انحصار اور مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ اور ان کے خیال میں وہ جتنی زیادہ مشکلات کا مقابلہ کرنا اور تکالیف سہنا سیکھے گا اتنا ہی باعمل انسان بنے گا۔ اس کے برعکس والدین کی تھوڑی بہت سختی کو بڑا بیٹا نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب اس کی گھر میں وہ حیثیت نہیں رہی۔ کچھ بچے تو اس صورتحال سے دل برداشتہ ہو کر نہایت حساس ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت چھوٹا ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے اور بڑا ہمیشہ ہی سے ذمہ دار اور سمجھدار ہوتا ہے۔ اس لئے والدین بڑے کی طرف سے فکرمند ہونے کے بجائے چھوٹے کی جانب سے پریشان ہوتے ہیں۔ کیونکہ چھوٹے کو ہمیشہ feeding Spoon کی ضرورت ہوتی ہے۔

ت۔ع صاحب آپکے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی صورتحال ہے۔ آپ کو چاہئے کہ آپ اپنے بڑوں کی باتوں کو نظرانداز کریں اور گھر کے کاموں میں دلچسپی کا اظہار کریں۔ علاوہ ازیں اپنی اہمیت اپنے کام اور اپنی باتوں کے ذریعے منوائیے۔ اور اپنی خواہش کا اظہار کم از کم اپنے والدین سے ضرور کیجئے۔ علاوہ ازیں اپنے فعل پر بھی نظرثانی کیجئے۔ کہیں آپ کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہتے ہوئے یا والدین سے الگ تھلگ تو نہیں گزرتا۔ اگر ایسا ہے تو اس شکایت کو دور کیجئے اور یہ بات اپنے ذہن سے نکال دیجئے کہ کسی کی زندگی منحوس ہوتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ زندگی ہمارے پاس خدا کی "پاکیزہ امانت" ہے خدا آپ کا مسئلہ حل فرمائے۔ (آمین)

(حنا زہرا۔ اسلام آباد)

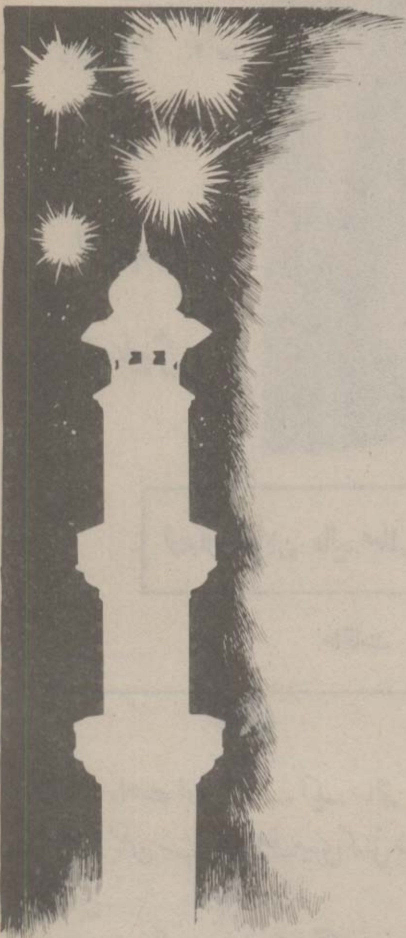

فرمانِ نبوی

زاہد الحسن زاہد

اچھے بچّو! نبیؐ کا یہ فرمان ہے
دو جہانوں کا مالک ہے بس اک خدا
جو کہ لاریب ہے وحدہٗ لاشریک
ساری دنیا ہے فانی، اسے ہے بقا

...... ○ ......

اچھے بچو! نبیؐ کا یہ فرمان ہے
اپنے ماں باپ کی خوب خدمت کرو
بات ان سے ہمیشہ ادب سے کرو
ان کی دن رات دل سے اطاعت کرو

...... ○ ......

اچھے بچو! نبیؐ کا یہ فرمان ہے
اپنے مہمان سے مُسکرا کر ملو
چونکہ مہمان رحمت ہے اللہ کی
اس لئے اپنے مہماں کی خدمت کرو

...... ○ ......

اچھے بچو! نبیؐ کا یہ فرمان ہے
حسنِ اخلاق کے تم رہو پاسباں
حسنِ اخلاق ہے روح کردار کی
حسنِ اخلاق ہے عظمتوں کا نشاں

بچے ہمارا مستقبل اور ادیب ہمارا سرمایہ ہیں

نوجوان قلم کارہ عالیہ صلاح الدین کی دلچسپ مزے دار باتیں

ملاقات : محمد عمر احمد خان

○ راحت اور میں نے ایک ساتھ قلم اُٹھایا لیکن سب سے پہلے میری کہانی شائع ہوئی۔
○ جادو لکھنے والے کے قلم میں ہونا چاہئے۔

○ جو حکومت عوام کے لئے ہی کچھ نہ کر سکے وہ ادیبوں کے لئے بھلا کیا کرے گی۔
○ کھانے مجھے اچھے لگتے ہیں اسی لئے تو اتنی موٹی نظر آرہی ہوں۔
○ ادیب قلم کے ذریعے لوگوں میں پاکستان سے محبت کا جذبہ اُبھار سکتے ہیں۔

"بچوں کے رسائل تو مطالعے میں رہتے ہی تھے۔ کہانیاں پڑھنا بھی اچھا لگتا تھا بس ایک دن میں نے بھی ہمّت کر کے ایک کہانی لکھ ہی ڈالی اور اخبار خواتین میں بچوں کے صفحات کے لئے اسے پوسٹ کر دیا۔ میری خوش قسمتی کہ یہ کہانی چھپ گئی۔ کہانی کا نام تھا۔ "ننھّی منّی کہانی" اس کہانی نے میرے لکھنے کے شوق کو تیز کر دیا اور یوں میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے لگی۔

یہ تھا عالیہ کا..... جواب جو انہوں نے ہمارے دکیلے سوال پر دیا تھا اور سوال تھا "لکھنے کا شوق کس طـــرح ہوا اور آپ کو....... یاد ہے آپ کی پہلی کہانی کہاں چھپی اور اس کا کیا نام تھا؟

عالیہ صلاح الدین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ بچوں کے لئے اچھی اچھی دلچسپ مزے دار کہانیاں لکھتی ہیں۔ آنکھ مچولی میں ان کی ایک کہانی "دوستی" شائع ہوئی تھی جسے بچوں نے بے حد پسند کیا تھا۔

ہم نے عالیہ کی چھوٹی بہن راحت صلاح الدین کا انٹرویو آنکھ مچولی میں جب شائع کیا تھا تو تب اپنے قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی قلمکارہ بہن عالیہ صلاح الدین کا انٹرویو بھی آنکھ مچولی کے صفحات پر شائع کریں گے۔ خاص نمبر میں یہ وعدہ پورا کر رہے ہیں۔

قارئین آنکھ مچولی کے علم میں یہ بات بھی ہے کہ عالیہ، راحت اور ان کی ایک بہن سعدیہ کا شمار خاص بچوں میں ہوتا ہے۔ تینوں بہنیں سُن تو سکتی ہیں لیکن بات نہیں کر سکتیں نہ ہی چل پھر سکتی ہیں۔ ان کی تمام گفتگو ہاتھ کے آہستہ آہستہ اشاروں یا پھر تحریری طور پر ہوتی ہے۔..........ان کی امی جان ان کے ہاتھ کے اشاروں کی گفتگو بخوبی سمجھتی ہیں اور اس انٹرویو میں جہاں ہم نے بہت سے سوالات عالیہ کو تحریری صورت میں دیئے تھے وہاں بہت سے سوالات عالیہ سے زبانی بھی پوچھے ہیں اور اس میں امی جان نے ہماری رہنمائی کی۔

اب آتے ہیں سوال وجواب کی طرف :

سوال : عالیہ! آپ راحت سے بڑی ہیں یہ بتایئے کہ پہلے آپ نے لکھنا شروع کیا یا راحت نے؟

عالیہ : راحت اور میں نے تقریباً ایک ساتھ ہی قلم اُٹھایا لیکن سب سے پہلے میری کہانی شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا "ربر کا سانپ" یہ نونہال میں چھپی۔ محترم حکیم محمد سعید نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ تحفے میں ایک کتاب بھی ارسال کی۔

سوال : شاباش ہے بھئی لیکن چُپکے سے یہ بھی بتا دیجئے اس کہانی کو چھپوانے کے لئے کس کی

سفارش لڑائی تھی؟
عالیہ : (زوردار قہقہہ) سفارش ہاں لڑائی تھی اور وہ تھی میری "صلاحیت"
سوال : ---واقعی صلاحیت بڑی سفارش ہوتی ہے آپ یہ بتائیے کہ اس ادبی میدان میں آپ کا اُستاد کون ہے؟
عالیہ : کتابیں اور رسالے ہی میرے اُستاد ہیں۔ مطالعے سے بھی انسان بہت کچھ سیکھتا ہے مشاہدہ بھی ضروری ہے پھر امی جان ہیں جو ہماری اُستاد بلکہ سب کچھ ہیں۔
سوال : آپ چھ سات صفحات کی کہانی عموماً کتنے وقت میں لکھ لیتی ہیں؟
عالیہ : یہ تو موڈ پر ہے ویسے تین چار روز تو لگ جاتے ہیں کیوں کہ میرے لکھنے کی رفتار بہت آہستہ ہے۔
سوال : تو آپ رفتار کو تیز کیوں نہیں کرتیں؟
عالیہ : (زور دار قہقہہ) ہاں سوچ رہی ہوں الیف سولہ بن جاؤں---بن جاؤں؟
سوال : ایسا نہ کیجئے گا اس میں بم بھی ہوتے ہیں کہیں کوئی بم نہ لگ جائے ہمیں' ویسے بھی آج کل کراچی میں بڑے دھماکے ہو رہے ہیں-- -اب آپ یہ بتائیے اچھی کہانی میں کیا خوبی ہونی چاہئے؟
عالیہ : ایک اچھی کہانی میں صرف دلچسپی ہونا ہی میرے خیال میں سب سے بڑی خوبی ہے۔
سوال : میں ایک اچھا ادیب بننا چاہتا ہوں میں ایک اچھی کہانی کس طرح لکھوں؟
عالیہ : آپ---اور اچھی کہانی---یہ کیا کہہ رہے آپ---آپ تو خود---!!
سوال : جی ہاں! ہم تو خود میرزا ادیب ہیں (میرزا ادیب سے معذرت کے ساتھ) لیکن یہ ہمارا سوال نہیں آنکھ مچولی پڑھنے والے ایک بچے نے پوچھا ہے۔
عالیہ : (ہنستے ہوئے) تو میرزا ادیب صاحب عرض یہ ہے کہ ادیب ہونے کے لئے سب سے پہلے تو نہایت ہی حسّاس دل و دماغ کا مالک ہونا ضروری ہے۔ ادیب کی سوچ عام لوگوں کی سوچ سے بُلند ہوتی ہے۔ اس کے پاس الفاظ کا بہترین ذخیرہ ہوتا ہے۔ وہ مشکل بات کو بھی آسان الفاظ میں ڈھال لیتا ہے۔ سب لوگ ادیب نہیں بن سکتے کیونکہ یہ تو ایک خداداد صلاحیت ہے بہرحال ایک اچھا ادیب بننے کے لئے تیز نظر (مشاہدہ) اور اچھی کتابوں کا مطالعہ ہونا ضروری ہے۔
سوال : اچھا کس طرح کی کہانیاں آپ کو مُتاثر کرتی ہیں؟
عالیہ : دلچسپ' عام فہم' آسان الفاظ اور حقیقی زندگی سے قریب تر انداز میں لکھی گئی

کہانیاں مُتاثر کرتی ہیں۔ نصیحتوں والی کہانیاں مجھے بالکل پسند نہیں۔

سوال : آج کل لکھنے والے بہت زیادہ ہو گئے ہیں جبکہ پڑھنے والے کم --- آپ کے خیال میں ان میں سے کون سے لوگ زیادہ ہونے چاہئیں؟

عالیہ : آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ---واقعی! آج کل پڑھنے والے کم ہیں اور لکھنے والے زیادہ ہر کوئی لکھ رہا ہے لیکن اسے خود یہ نہیں معلوم کہ کیا لکھ رہا ہے۔ کسی بڑے ادیب نے سچ ہی کہا ہے "ایک تحریر لکھنے سے .... پہلے ایک ہزار تحریریں پڑھ لیجئے۔"

سوال : ادیب بہت حسّاس ہوتا ہے کیا ادیب کو حسّاس ہونا چاہئے؟

عالیہ : چوں کہ میں چل پھر نہیں سکتی اس لئے امی کو گھر کے کام کاج کرتے دیکھ کر میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاؤں خاص طور سے جب مہمان ہمارے گھر آتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھاگ بھاگ کر ہر کام کروں --- مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتی شاید --- ادیب کو حسّاس بھی ہونا چاہئے۔

سوال : (اس سوال پر عالیہ کچھ افسردہ ہو گئی تھیں، ہم نے انہیں ڈانٹا) اب ادیب کو اتنا حسّاس بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اتنی مایوس شکل بنا لے --- آپ کو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے آپ بہنوں کو سوچنے سمجھنے سننے کی قوت دی ہے۔ ہر طرح کا آرام و آسائش فراہم کیا ہے --- پھر بہت سی صلاحیتیں جو آپ میں ہیں وہ اوروں کے پاس نہیں --- ہم سب کو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے --- ہاں اب مُسکرائیے اور یہ بتائیے کہ اگر آپ کو جادو کا ایک قلم دے دیا جائے تو آپ کیا کریں گی؟

عالیہ : (ہنستے ہوئے) یہ تو بہت اچھی بات ہوگی کیوں کہ میں لکھنے کے معاملے میں بہت کاہل ہوں --- جادو کا قلم مل جائے گا تو سچی بڑا مزا آئے گا۔ قلم کہانیاں لکھتا رہے گا اور میں --- !!۔

سوال : جی ہاں! مشہور نہیں بلکہ کاہل ہو جائیں گی آپ، اس لئے یہ قلم نہیں دے رہے آپ کو یہ ہمارے پاس ہی رہے گا --- کیوں ٹھیک ہے ناں؟

عالیہ : لیکن پھر آپ کاہل ہو جائیں گے (زوردار قہقہہ) بہرحال آپ کے اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ قلم جادو کا نہ ہو بلکہ جادو لکھنے والے کے قلم میں ہونا چاہئے۔

سوال : واہ بھئی فلاسفر صاحبہ! کیا اچھی بات کہی آپ نے۔ یہ بتائیے کہ بچوں ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کے بارے میں آپ کا کیا

خیال ہے کیا حکومت کو ان کی سرپرستی کرنی چاہئے؟

عالیہ : افوہ! بہت چالاک ہیں آپ --- ایک ہی جملے میں اتنی سارے سوال --- خیر میں تو کہوں گی کہ بچے ہمارا مستقبل اور ادیب ہمارا سرمایہ ہیں --- تعلیم پھیلانے کے ساتھ ساتھ حکومت اور بڑے اداروں کو چاہئے کہ ان کی سرپرستی کرے اس طرح ان کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں لیکن جو حکومتیں عوام کے لئے ہی کچھ نہ کر سکیں وہ ادیبوں کے لئے بھلا کیا کریں گی۔

سوال : اچھا چھوڑیئے حکومت کو ....یہ بتائیے ادیب پاکستان کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں؟

عالیہ : ادیب اپنے قلم کے ذریعے وطن کے لوگوں میں محبت، اخوت، ہمدردی اور بھائی چارے کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ بُرے بھلے کی تمیز کرا سکتے ہیں۔

سوال : عالیہ! آپ کی اس بات سے ہمیں یاد آیا کہ ہماری قوم بڑی لڑاکو بھی ہے۔ ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتی ہے سچ سچ بتائیے آپ تینوں بہنوں میں بھی کبھی لڑائی ---؟

عالیہ : (بہت زور دار قہقہہ لگا کر) لڑنا تو بہت بُری بات ہے --- لیکن آپ نے کہا ہماری قوم بڑی لڑاکو ہے تو ہم تینوں بہنوں میں بھی کبھی کبھی مختلف باتوں پر لڑائی ہو جاتی ہے جیسے ریڈیو ٹی وی چلانا ہے یا بند کرنا ہے یا پھر آواز تیز ہلکی کرنی ہے وغیرہ وغیرہ --- (ہنستے ہوئے) لیکن جلد ہی ہماری دوستی ہو جاتی ہے ہماری قوم کو بھی دوستی کے مضبوط رشتے سے مربوط رہنا چاہئے۔

سوال : جی ہاں عالیہ! یہ بہت اچھی بات کہی آپ نے --- اب یہ بتائیے کہ کیا آپ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں پُر اُمید ہیں؟

عالیہ : اس کے مستقبل کے بارے میں تو میں اتنا کہوں گی۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

سوال : بچوں کے لئے لکھنے والے ادیبوں میں ہمیں تو ہم پسند ہیں آپ کو کون کون سے ادیب اچھے لگتے ہیں؟

عالیہ : (ہنستے ہوئے) یہ تو میاں مٹھو بننے والی بات ہوئی خیر مجھے آنکھ مچولی کے ایڈیٹر محترم طاہر مسعود کی تحریریں بہت پسند ہیں حالاں کہ انہوں نے بچوں کے لئے لکھنا کم ..... دیا ہے۔ نوجوان ادیبوں میں الف خان، سید سہیل اختر ہاشمی، شازیہ فرحین، عظمیٰ تسنیم اور صاعقہ بانو کی تحریریں اچھی لگتی ہیں۔ آنکھ مچولی میں چھپنے والے ادیبوں میں مجھے عادل منہاج کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ مجھے سائنس سے تو دلچسپی نہیں حالاں کہ

عادل کی تحریروں میں سائنسی رنگ ہوتا ہے مگر ان کا انداز اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ ساری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

سوال : کس طرح کے لوگ اچھے لگتے ہیں؟

عالیہ : مخلص، محبت کرنے والے اور پڑھے لکھے لوگ۔

سوال : اچھا یہ بتائیں کھانا اچھا لگتا ہے یا کھانے؟

عالیہ : (قہقہہ لگا کر) طرح طرح کے کھانے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں جبھی تو اتنی موٹی نظر آرہی ہوں ----دال چاول میری فیورٹ ڈش ہے اگر دال چاول کے ساتھ کھٹے بینگن ہوں تو کھانے کا مزا ہی دوبالا ہو جاتا ہے۔

سوال : واہ بھئی! آپ کی باتیں سن کر تو ہمارے منہ میں بھی پانی آگیا ہے--- خیر آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ کائنات ہے خوش رنگ۔آپ کو کون سے رنگ پسند ہیں؟

عالیہ : آپ نے ٹھیک کہا کائنات رنگ برنگے پھولوں اور خوشبوؤں سے بجی ہے مجھے تو سارے ہی رنگ پسند ہیں۔

سوال : خوشیوں کے رنگ بھی تو ہوتے ہیں خوشیاں جو ہمارے اندر ہوتی ہیں دوسروں کو بانٹنے کے لئے تو جلدی سے آپ کوئی اچھا سا خوشیوں بھرا پیغام مستقبل کے معماروں میں بانٹیے۔ کیا پیغام دیں گی آپ؟

عالیہ : میرا پیغام آنکھ مچولی کے قارئین بچوں بلکہ سارے بچوں کے لئے وہ یہ کہ کھیل کود کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تعلیم پر پوری توجہ دیں، دل جمعی سے تعلیم حاصل کریں تاکہ ایک روز ملک وقوم کی خدمت کرنے والے بن سکیں!!

انعام کس نے جیتا

اپریل کے قلم دوست میں جس شخصیت کی تصویر شائع کی گئی، وہ تھے کرکٹ کی دنیا کے مشہور میڈیم فاسٹ بالر رچرڈ ہیڈلی۔ان کا تعلق کیوی کے دیس! جی ہاں! نیوزی لینڈ سے ہے۔انہوں نے نیوزی لینڈ کی ٹیم کے لئے گرانقدر خدمات انجام دیں اور سب سے زیادہ وکٹوں (۴۳۱) کا ریکارڈ قائم کیا جسے ان کے ریٹائر ہونے کے بعد بھارت کے آل راؤنڈر کپیل دیو نے توڑ دیا۔

ہمیں سینکڑوں ساتھیوں کے درست جوابات موصول ہوئے۔شکریہ! چھ خوش نصیب ساتھی جو قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام کے حقدار قرار پائے درج ذیل ہیں:

۱۔ صباحت حبیب خان ۲۔ تنویر حسین
۳۔ وقاص احسن عباسی ۴۔ فیصل احمد خان
۵۔ عدیل احمد ۶۔ فراز احمد خان

انعام یافتگان کو آنکھ مچولی کی جانب سے دلی مبارکباد۔

قدرتی موئسچرائزر
Aloe Vera کے ساتھ
ایلوویرا
کیپری کا ملائم جھاگ نرمی سے آپ کی جلد کو صاف کرتا
ہے اور اس میں موجود خصوصی ایلوویرا موئسچرائزر جلد کی
قدرتی نمی کو محفوظ رکھتا ہے۔ ریگولر کے علاوہ تین حسین رنگوں
اور منفرد خوشبوؤں Sandalwood۔ Floral۔
Gardenia۔ میں دستیاب۔ گھر کے ہر فرد کا انتخاب
capri
جلد کی حفاظت، جلد کی نفاست
PRESTIGE

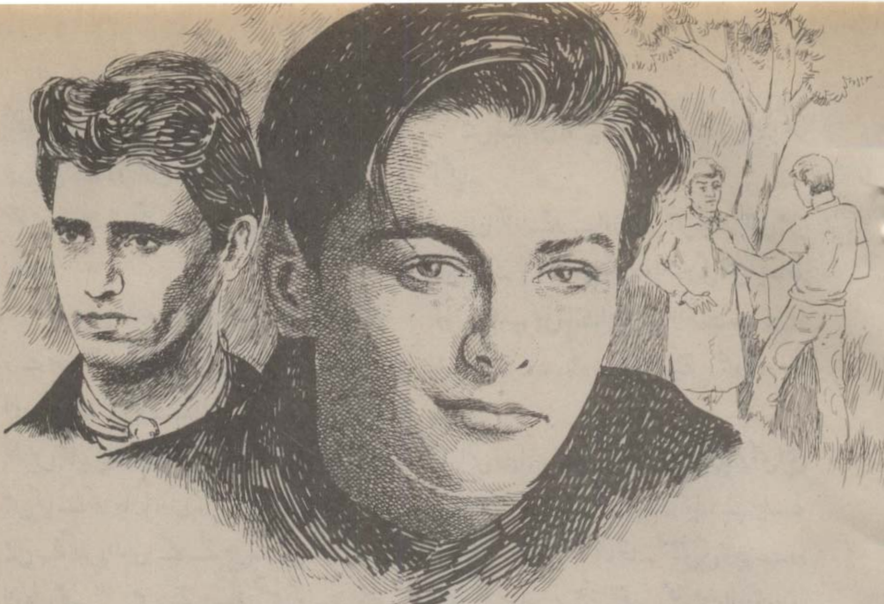

صحیح طریقہ

محمد عثمان بن سلیم

قادر بخش عمر میں مجھ سے کچھ زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ میری اور اس کی عمر میں بس معمولی فرق تھا۔ لیکن مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں اس سے خوف زدہ تھا۔

محلے میں کوئی بھی اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہ ایک بدتمیز اور بدمزاج لڑکا تھا۔ اسی کی طرح اس کے دوست بھی تھے۔ جو خواہ مخواہ ہی دوسروں پر اپنا اپنا رعب ڈالنے کی کوشش کرتے۔ کسی بڑے چھوٹے کی عزت کرنا تو جیسے انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ محلے کے کئی آدمیوں نے اس کے باپ سے اس کی شکایت کی تھی۔ لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تب محلے والوں نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ لڑائی جھگڑے سے کیا فائدہ۔

"ہر شخص کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے۔" اسی لئے میں بھی قادر بخش کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ کئی بار جی میں آئی کہ اب کہ میں اس کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔ جھگڑا ہوتا ہے تو ہو۔ لیکن میں صرف اپنے والد کے خیال سے خاموش ہو جاتا کہ انہیں یہ بات پسند نہیں تھی کہ میں کسی سے جھگڑا کروں۔ میں بس پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔

اس روز میں اور نذیر اسکول سے واپس آرہے تھے۔ راستے سے داخل ہوئے۔ تو وہاں قادر بخش اور اس کے دوستوں کو کھڑا پایا۔ میں اور نذیر نظریں جھکائے باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

"او میاں حامد صاحب کہاں منہ اٹھائے چلے جا رہے ہو۔" یہ سیب کی تھیلی تو ادھر دیتے جاؤ۔
اس نے نہایت بھونڈے انداز میں کہا۔ اس کی تیز نظریں شاید پہلے ہی اندازہ کر چکی تھیں کہ میں تھیلی میں کیا لے کر جا رہا ہوں۔ "قادر بھائی یہ سیب تو میں نے گھر والوں کے لئے ہیں۔ میں تمہیں اور لادوں گا۔" میں نے سیب کی تھیلی کو اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔

"ابے تو گھر کے لئے اور لے لینا مجھے تو یہی چاہیئے۔"
اس نے ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کیا۔ اور سیبوں کی تھیلی میرے ہاتھ سے اچک لی۔
"قادر بھائی دیکھو یہ تھیلی مجھے دے دو میں نے کہا میں تمہیں اور لادوں گا۔" "زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں چل اب یہاں سے چلتا بن۔" قادر بخش نے مجھے آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ میں غصے اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت میں نذیر کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔
"یار حامد کیا ضرورت تھی تمہیں خواہ مخواہ اس سے الجھنے کی۔"
نذیر نے میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں میرا گھر آگیا۔

دن گزرتے رہے اور قادر بخش کی حرکتوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ انسان کی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی اور جب کوئی بات اس کی برداشت سے باہر ہو جائے تو پھر وہ.... کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس دن جب قادر بخش نے حاکم چچا کو بھی اپنی شرارت کا نشانہ بنایا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ بے چارے حاکم چچا کو نظر بھی کم آتا تھا۔ ضعیفی کی وجہ سے وہ لاٹھی کے سہارے چلتے تھے۔ محلے میں ان کی بڑی عزت تھی اور سب نے انہیں بزرگ کا درجہ دے رکھا تھا۔ وہ بے چارے گلی سے گزر رہے تھے کہ قادر بخش نے ان کے راستے میں کیلے کا چھلکا ڈال دیا۔ اور نتیجہ میں وہ کمر کے بل گرے۔ مجھے جب امی جان کی زبانی قادر بخش کی اس حرکت کا پتہ چلا تو غصہ سے میرا دماغ کھول گیا۔ میری قوت برداشت بھی اب جواب دیتی جا رہی تھی۔ اور اب میں قادر بخش کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

جمعہ کے دن میں نے امی جان سے کہا کہ میں ایک دوست کے ساتھ تین چار گھنٹے کے لئے جا رہا ہوں۔ امی جان نے مجھے اجازت دے دی اور میں گھر سے باہر نکل آیا۔ گلی کے نکڑ پر ہی میری مدبھیڑ قادر بخش سے ہو گئی۔ آج وہ خلاف توقع اکیلا نظر

آ رہا تھا۔ اس کے آوارہ اور بد تمیز دوست اس کے ساتھ نہیں تھے۔ قادر بخش پر نظر پڑتے ہی اچانک میرے دل میں ایک خیال ابھرا اور میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ "بھائی قادر آج تو سیر کا پروگرام ہے چل رہے ہو؟" میں نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اس سے کہا۔

"چل بھئی دل تو میرا بھی چاہ رہا ہے۔"

وہ کیسے انکار کر سکتا تھا۔ میں نے تو اس سے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ہم دونوں تفریحی مقام پر پہنچ گئے۔ خاصی دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اسی دوران میں نے قادر بخش کو آئس کریم بھی کھلائی۔ پھر جب ہم واپسی کے لئے تفریحی پارک سے باہر آنے لگے تو میں نے کہا قادر بھائی آؤ ذرا چلنے سے پہلے پارک کا ایک راؤنڈ اور لگالیں اس نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔ آج وہ مجھ سے بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

شام آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی اور تفریح کے لئے آئے ہوئے لوگ اب اپنے اپنے گھروں کو جارہے تھے اور پارک میں بھی آہستہ آہستہ سناٹا چھاتا جارہا تھا۔ جب ہم دونوں چلتے ہوئے پارک کے نسبتاً سنسان گوشے میں پہنچے تو اچانک چلتے چلتے میرے قدم رک گئے۔ قادر بخش نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے کہا "بول بھئی قادر بخش تو آخر چاہتا کیا ہے؟" میرے لہجے میں غراہٹ اور غصے کی جھلک تھی۔ قادر بخش سے ڈرتا تو میں ویسے بھی نہیں تھا۔ اسے یہاں لانا میرے منصوبے میں شامل تھا۔

قادر بخش نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا، اور بولا کیا کہہ رہا ہے بے تو؟" میں نے اچانک اس کا گریبان پکڑ لیا۔ تیری بدمعاشی نکالنے کے لئے تجھے یہاں لایا ہوں، یہاں پر تجھے بچانے کے لئے تیرا کوئی بھی ساتھی نہیں آئے گا۔" میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ قادر بخش نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن میری گرفت اس کی توقع سے زیادہ مضبوط تھی اس لئے وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اب اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"تت ...... تت ...... تم کیا چاہتے ہو؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔" میں نے کہا نا میں تیری بدمعاشی نکالنے کے لئے تجھے یہاں لایا ہوں۔ اب اگر تو مجھ سے یہ وعدہ کرلے کہ آئندہ تو محلے میں شریفوں کی طرح رہے گا تو تیری جان بخشی ہو سکتی ہے۔ ورنہ ......" اس سے آگے میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ قادر بخش فطرتاً بزدل اور ڈرپوک تھا اس لئے فوراً میرے دباؤ میں آگیا۔" مم ...... مم ...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب محلے میں شریفوں کی طرح رہوں گا۔" اس نے کانپتی آواز میں یہ الفاظ ادا کئے۔ تو میں نے ایک جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔" اور سنو اگر تم نے کسی کو اس واقعے کے متعلق بتایا تو پھر مجھ سے اگلی ملاقات کے لئے تیار رہنا۔" میں نے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا۔" میں تجھے محلے میں ہی تیرے دوستوں کے سامنے ماروں گا۔" قادر

بخش واقعی مجھ سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور میں چاہتا بھی یہی تھا۔ میرا اس کی پٹائی لگانے کا ہرگز پروگرام نہیں تھا۔ میں نے کسی سے سنا تھا کہ اس طرح کی بدمعاشی دکھانے والے فطرتاً بزدل اور ڈرپوک ہوتے ہیں اور اپنے علاقے سے باہر ان کی ساری بدمعاشی اڑنچھو ہو جاتی ہے۔ میں اسے صرف خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

اور اب قادر بخش بھی محلے میں شریفوں کی طرح زندگی گزارنے لگا تھا۔ میری دھمکی کا بھی اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے کسی کو بھی میرے متعلق نہیں بتایا البتہ محلے والے اس کی اس تبدیلی پر حیران تھے۔ میں نے بھی اس بات کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔

○ ..... ○ ..... ○

تحریری مباحثے کے شرکاء

آنکھ مچولی کے تحریری مقابلے "لڑکیاں بہادر ہوتی ہیں" میں شرکت کے لیے جن مضمون نگاروں نے اپنے دلائل سے بھرپور مضامین ارسال کیے ان کے نام درج ذیل ہیں:

محمد رضوان مدثر، اٹک۔ نسیم احمد، میانوالی۔ ذوالقرنین، صادق آباد۔ صائمہ ارم اعوان، حافظ آباد۔ فرحان الدین خلجی، راولپنڈی۔ سعدیہ سلیم، ساہیوال۔ منیر احمد فردوس، ڈیرہ اسماعیل خان۔ امتیاز بی بی (؟)۔ رابعہ گل، ملتان۔ فرحینہ عقیل خان، کراچی۔ محمد عاطف حسن، کراچی۔ ناصرہ، کوٹری۔ امتیاز علی میمن، لاڑکانہ۔ گہرام حیات، تربت۔ محمد اجمل انصاری، کراچی عابد حسین چانڈیو، لاڑکانہ۔ عنبرین ناصر حسن صدیقی، کراچی۔ محمد عابد رشید، لاہور۔ عظمیٰ نسیم (؟)۔ محمد نسیم رفیع، سکھر عنبرین سلطانہ، ربوہ۔ سلمان احمد، اسلام آباد۔ ہما شوکت (؟)۔ عمران احمد، حیدرآباد۔ کاشف جمیل عاشر، مکران نصراللہ خان، منڈی بہاؤالدین۔ عبدالمجید انجم، جھنگ صدر۔ نسیم اختر، منڈی بہاؤالدین۔ صبا قادر، کراچی۔ محمد شاہد عبدالغفور، میرپور خاص۔ محمد ریحان، راولپنڈی۔ سیدہ کاشف نقوی، کراچی۔ افشین اسد، کراچی۔ عائشہ انیس، اویس انیس، جامپور۔ ناصر حفیظ، ملتان۔ بلال محمد، لاہور۔ سیدہ آصفہ خاتون، کراچی۔ تہمینہ حنیف، شیخوپورہ۔ ہما شریف، کراچی۔ محمد کاشان خان یوسف زئی، کراچی۔ آصفہ وحید (؟)۔ صائمہ ظفر، دوہا (قطر)۔ فرزین خان، جہلم کینٹ۔ فضل حسین فضل، لیہ۔ ماہ بانو سید، ایبٹ آباد۔ عنبرین آمنہ صدیقی، جامشورو۔ شاہد حسین، شادولی۔ سیدہ شہر بانو بخاری، شاہینہ علی، رحیم یار خان۔ مظہر سلیم، بہاولپور۔ رباب کلیم، کراچی۔ عظمیٰ اختر، کراچی۔ فیاض احمد انیس، نواب شاہ۔ سمانہ خاتون، کراچی۔ اشفاق احمد کھوکھر، حیدرآباد۔ حسیب احمد، کراچی۔ خرم طارق جگنو، گوجرانوالہ۔ سید یحییٰ حسینی، کراچی۔ نعمان عطاء اللہ لوکھر، گوجرانوالہ۔ ذیشان احمد شان، قصور۔ عنبرین اقبال شیخ، جدہ (سعودی عرب)۔ سعدیہ رضوانہ، پشاور شہر۔ سیدہ حنا، نورین کاظمی، کراچی۔ محمد عاقل احمد خان، پرانا سکھر۔ رفیق شاہد، ذیشان آغا، پاک پتن۔ عبدالقدیر انڈہڑ، پنوں عاقل۔ شمائلہ صابر، کراچی صہیب غضنفر، گوجرانوالہ۔ زیب النساء، لاہور۔ نعمت فگار، غلام جان، کوہاٹ۔ افشاں یوسف، ٹنڈو آدم۔ نیلوفر قندیل، کمالیہ۔ آرائیم راشد محمود، ساہیوال۔ زرتاشں مغل، پرانا نوالبشاہ۔ محمد احسن خالد، کراچی۔ رباب جعفری، کراچی۔ سہلہ فیاض، اسلام آباد۔

آآآ.....آہم

قرۃ العین طاہر

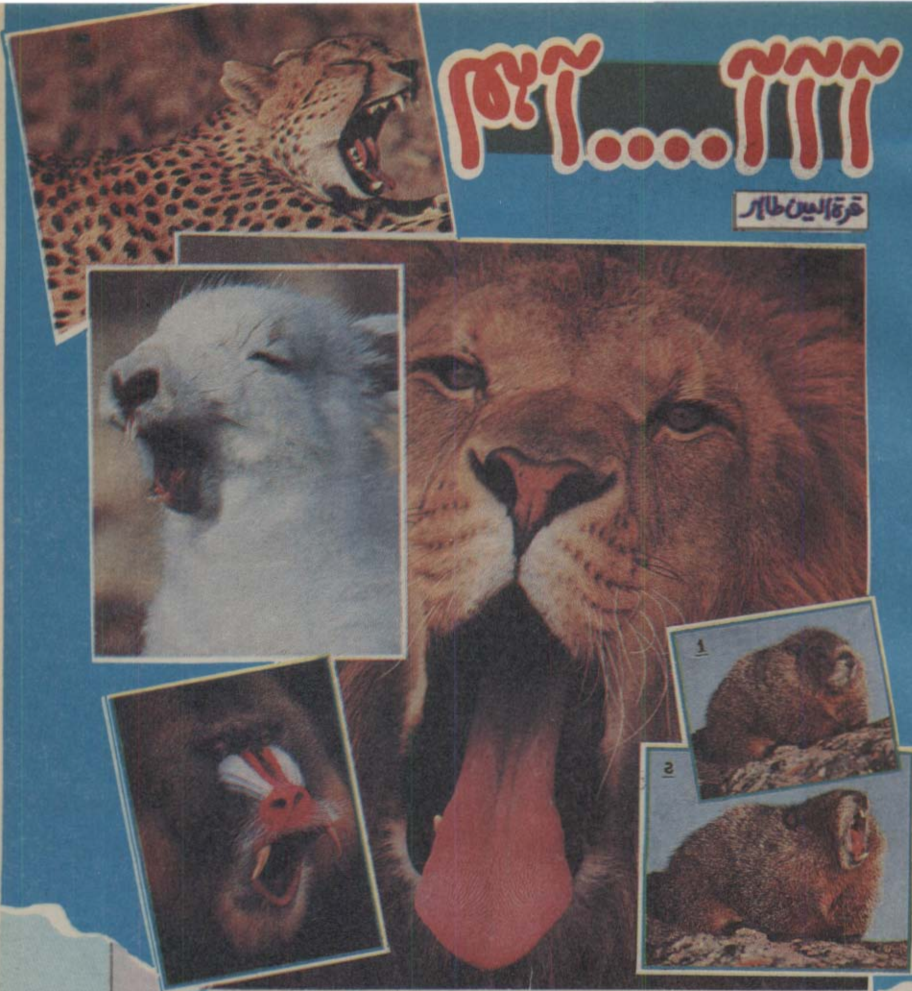

ہماری اور آپ کی طرح جانور بھی جماہیاں لیتے ہیں۔ منہ آہستہ آہستہ کھلتا ہے اور پانچ چھ سیکنڈ تک کھلا رہتا ہے اور پھر ایک دم بند ہو جاتا ہے۔ لیجیے جمائی مکمل ہوگئی۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جمائی لینے کے بعد جسم اور ذہن چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جمائی لینے کے دوران دل کی دھڑکن اور خون کا دباؤ تیز ہو جاتا ہے۔ فلاڈیلفیا کی ٹمپل یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر رونالڈ بیننگر اِن چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے جمائی لینے کے موضوع پر سنجیدگی سے تحقیق کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ چڑیا گھر کے جانوروں کو عام طور پر غذا لینے سے پہلے جماہیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کا خیال ہے شاید وہ خود کو غذا لینے کے لیے تیار کر رہے ہوتے ہیں۔ چند جانور گروہوں کی شکل میں رہتے ہیں۔ جیسے بابون (یہ ایک جانور ہوتا ہے جس کی تھوتھنی کتے کی طرح لمبی ہوتی ہے۔) بابون کا لیڈر صبح سویرے سب سے پہلے جمائی لیتا ہے اور پھر اُس کی دیکھا دیکھی دوسرے بابون کو جمائی آتی ہے پھر تیسرے کو اور یوں باری باری سب جماہیاں لیتے ہیں۔ اور یہ تجربہ تو آپ کو بھی ہوا ہوگا کہ اگر کوئی سامنے بیٹھ کر جمائی لے تو ہمارا منہ بھی خود بخود کھل جاتا ہے اور ایک زوردار جمائی آجاتی ہے۔ عام طور پر لوگ بوریت یا تھکن کی وجہ سے جمائی لیتے ہیں، جب نیند آرہی ہو اور دل بستر پر جانے کو چاہ رہا ہو — یا پھر آپ کو اُس وقت جمائی آتی ہے جب کلاس روم میں دل نہ لگ رہا ہو۔ ماسٹر صاحب ریاضی کا کوئی خشک سوال سمجھا رہے ہوں۔ تب آپ بور ہو کر ایک زور کی جمائی لیتے ہیں۔ آآآ.......... آہم!

"A I n am ← F.B. Area
bgri Jafri A letter Karachi
From
Tara

What is this Abba?
~~your~~ you was saying "I am not drink" but this is ~~the~~ kept on your 'segrate' table.

You are very lier ~~and~~ and Makkar man

From your
daughter
"TARA"

Poem

" I sent a letter to my father
all the way I dropped
...body came it pick it up
in his poket
...isen'ted you
...isen'ted you"
[illegible]
! [illegible] !
"I am in my room"

Sana Siddiqi
2701 Village Dr.
Avenel, N.J.
07001
March 16, 95

Dear Edhi International Foundation,
اسلام وعلیکم

My name is Sana Siddiqi. I am 12 years old. My mother was reading the Edhi Welfare Journal, when I saw a picture of these girls. I asked my mom to read me the article I decided to write to you people and ask you information on these girls. Out of my 2, week allowance I decided to give from my $5.00, $2 or $3 dollars to them each month. I would like you to send me info. I would like to know more about them. I would like ... like to be ... about the oldest one. I ... their friend, especially ... yellow suit. I would ... names of girls who ... please send me a pi... girls. I would really ... tell them to write ... from them. I will al... send me my inform... I will hear from ...

allowance!

P.S. I ... mind if you write in urdu

بچے کیا لکھتے ہیں؟

ادارہ

بچے بھی جو باتیں کہہ نہیں سکتے انہیں لکھ دیتے ہیں۔ کبھی دیوار پر، کبھی باجی یا بھیا کی ڈائری پر یا کبھی کسی کاغذ پر۔ بچے کیا لکھتے ہیں؟ وہ وہی کچھ لکھتے ہیں جو ان کے دل میں ہوتا ہے۔ کوئی شکایت کوئی غصہ یا پھر خوشی کی کوئی بات۔

بچے کیا لکھتے ہیں؟ یہ جاننے کے لئے ہم اس وقت دو بچیوں کی تحریریں پیش کر رہے ہیں۔ ان کی اصل تحریر آپ سامنے والے رنگین صفحے پر دیکھ سکتے ہیں۔

پہلی تحریر ایک ننھی بچی تارا کی ہے جو ہمدرد اسکول، کراچی میں چھٹی جماعت کی طالبہ ہے۔ تارا کی تحریر کا پس منظر یہ ہے :

تارا کے ابّو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ایک دن تارا نے ٹیلی وژن پر سگریٹ کے خلاف اشتہار دیکھ کر اپنے ابّو سے پوچھا :

"ابو۔۔ کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں؟"

ابو نے کہا : "نہیں بیٹا۔ سگریٹ صحت کو نقصان پہنچاتی ہے اس لئے سگریٹ نہیں پینی چاہئے۔"

تارا یہ سن کر خوش ہو گئی۔ لیکن ایک دن کیا ہوا۔ تارا کسی کام سے ابو کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا کہ ابو بستر پر گہری نیند سو رہے ہیں اور ان کی میز پر ایک سگریٹ پڑا ہوا ہے۔ تارا کو یہ دیکھ کر بے انتہا صدمہ ہوا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ابو اس سے جھوٹ بولیں گے۔ چنانچہ اس نے ابو کے نام وہیں بیٹھے بیٹھے ایک خط لکھا۔۔۔۔۔۔ یہ خط انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ یہ ہے :

"یہ کیا ہے ابا۔ آپ تو کہا کرتے تھے کہ میں سگریٹ نہیں پیتا لیکن یہ تو آپ کی میز پر رکھا ہوا ہے۔ آپ ایک جھوٹے اور مکار آدمی ہیں۔

آپ کی بیٹی تارا

خط کے نیچے ایک نظم لکھی ہوئی تھی اور آخر میں یہ فقرہ تھا کہ "اگر کوئی بات کرنی ہو میں اپنے کمرے میں ہوں۔"

یہ ٹھیک ہے کہ خط میں زبان کی غلطیاں بھی تھیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اگر بڑے کوئی غلطی کریں تو انہیں "جھوٹا" اور "مکار" وغیرہ لکھنا نہایت بُری بات ہے۔ لیکن تارا کو جس بات پر غصہ آیا تھا، اس بات پر غصّہ تو آنا ہی چاہئے۔

اب یہ بات ہے کہ ابو جب سو کر اٹھے اور انہیں یہ خط ملا تو وہ بھاگ کر تارا کے پاس گئے اور انہوں نے اس کا ماتھا چوم کر کہا :

"تارا بیٹی -- آئی ایم سوری ----- اور آئی ایم سوری کا مطلب تھا "آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" اور تارا خوش ہو گئی ---- وہ اچھی بچی جو تھی --!

بچوں کے دل ہمدردی اور محبت سے بھرے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی وہ اس کا اظہار اپنے خطوں کے ذریعے بھی کرتے ہیں۔ جیسے عبدالستار ایدھی کے ادارے کو امریکہ سے ایک پاکستانی بچی کا خط موصول ہوا۔ یہ خط ۱۶ مارچ کو لکھا گیا تھا اور لکھنے والی بچی کا نام تھا ثنا صدیقی۔ ثنا نے ایدھی سینٹر کو خط میں کیا لکھا -----؟ اس نے لکھا :

ڈیئر ایدھی انٹرنیشنل فاؤنڈیشن السلام علیکم

میرا نام ثنا صدیقی ہے۔ میری عمر بارہ سال ہے۔ (ایک روز) میری ممی ایدھی ویلفیئر جرنل پڑھ رہی تھیں کہ میں نے اس میں تین بچیوں کی تصویر دیکھی۔ میں نے ممی سے لے کر وہ مضمون پڑھا اور پھر میں نے سوچا کہ آپ لوگوں کو خط لکھ کر ان تینوں بچیوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ مجھے جیب خرچ کیلئے جو پانچ ڈالر ملتے ہیں، اس میں سے میں دو یا تین ڈالر ہر مہینے ان بچیوں کو بھیج دیا کروں گی۔ اس لئے برائے مہربانی مجھے ان بچیوں کے بارے میں معلومات فراہم کر دیجئے۔ خاص طور پر ان میں جو سب سے بڑی بچی ہے۔ میں ان لوگوں سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ خاص طور پر وہ بچی جس نے پیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ میں ان میں اپنی ہم عمر بچیوں کے نام جاننا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے ان پانچوں بچیوں کی تصویر بھیج سکتی ہیں۔ میں واقعی ان لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ برائے مہربانی جلد جواب دیجئے۔

اللہ حافظ۔ ثنا

آپ نے اس خط سے اندازہ لگایا ہو گا کہ ثنا کتنے اچھے دل کی مالک ہے۔ اس کے دل میں مظلوم بچیوں کے لئے کتنی محبت اور کتنا درد ہے۔ ایسی تصویریں تو ہم اور آپ بھی دیکھتے ہیں لیکن ایسے مظلوم بچوں اور بچیوں کے لئے فوراً" مدد کرنے کا خیال ہم میں سے کتنوں کو آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ثنا کے دل کو ہمیشہ اتنا ہی خوبصورت بنائے رکھے۔ (آمین)

یوں تو بچوں کی ایسی تحریریں جمع کی جائیں تو کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں بھی وہی کچھ ملے گا جو ان تحریروں میں ہے ----- یعنی بچوں کا خوبصورت دل ---- یہ دل ٹھیک ہو تو سب کچھ ٹھیک رہتا ہے !

یادِ وطن

(ننھی وجیہہ کے تاثرات)

سیّد انیس احمد

اپنے یہاں سے کوسوں دور   ہم گئے اک دن سنگاپور
تھامے ہوئے پاپا کا ہاتھ   اور لئے امی کو ساتھ
شہر وہ سارا آئی گھوم   خوب مچائی میں نے دھوم
گھومی، پھری اور اترائی   ناز و ادا سے اٹھلائی
سیر میں یوں تو آئے مزے   لیکن جب سب گھوم چکے
پاؤں تھکن سے چور ہوئے   سارے مزے کافور ہوئے
سیر سے پھر دل سیر ہوا   چین کا جی سے بیر ہوا
دل پہ اداسی اک چھائی   میری طبیعت گھبرائی
بھولے ہوئے تب یاد آئے   دور تھے جو، سب یاد آئے
یادِ وطن میں جب کھوئی   پھوٹ کے میں تو خوب روئی
حد سے بڑھی جب بیزاری   کام نہ آئی دل داری!
رک نہ سکا اشکوں کا تار   دیکھ کے میرا حالِ زار
مسئلہ زیرِ غور ہوا   فیصلہ تب فی الفور ہوا
سیر سپاٹا چھوڑیں، بس   لوٹ چلیں اب گھر واپس
کرکے یہ طے اس بارے میں   بیٹھ گئے ہم طیارے میں
لے کے اڑا پھر ہم کو جہاز   ملک کی جانب کی پرواز
ختم ہوا جب لمبا سفر   آیا مرے سپنوں کا نگر
دیکھ کے پیارا پاکستان   جان میں جیسے آئی جان
بچھڑے ہوئے سب لوگ ملے   دل میں خوشی کے پھول کھلے
گود میں سب نے مجھ کو لیا   خوب ہی پھر تو پیار کیا

من ہوا سب سے مل کے مگن
ہوگئی ساری دور تھکن!

حل

اشتیاق احمد

اس کہانی کو پڑھیے اور دیکھیے کہ آپ کے مقبول مصنف جناب اشتیاق احمد نے آپ کے سامنے کیسا ٹیڑھا مسئلہ رکھ دیا ہے۔ کہانی میں اس مسئلے کا جو حل تجویز کیا گیا ہے۔ وہ آخری حل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مسئلے کے اور کیا کیا حل ہو سکتے ہیں۔ کہانی کو غور سے پڑھیے اور حل تجویز کیجیے۔ بہترین حل پر جناب اشتیاق احمد اپنے آٹو گراف کے ساتھ اپنی تصنیفات کا ایک سیٹ بطور انعام دیں گے۔

"غضب خدا کا، ہر مہینے ایک کھلونا غائب، ہے کوئی تُک.... میں تو کہتی ہوں، پولیس میں رپورٹ درج کرا دیں.... یہ اتنے کم قیمت کھلونے بھی نہیں ہیں، جہاز تو آپ پورے چھ سو روپے کا لائے تھے، ریموٹ کنٹرول بھی ساڑھے چار سو روپے کا تھا، اور روبوٹ تین سو روپے کا آیا تھا.... آپ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے، کان پر جوں تک نہیں رینگتی آپ کے"۔

امی جان کی تیز آواز نے ہم سب کو صحن میں جمع ہونے پر مجبور کر دیا.... جب کہ اس سے پہلے سب لوگ بستروں میں دُبکے ہوئے تھے۔ شدید سردی کے دنوں میں چھٹی کا دن عجیب ہوتا ہے۔

بستروں کا پیچھا چھوڑنے کو کس کا دل کرتا ہے..... اور اگر ہمارا سارا گھرانہ نمازی نہ ہوتا تو کوئی بھی لحافوں سے نہ نکلتا، لیکن ابا جان ٹھہرے اس معاملے میں بہت سخت، ایک ایک کو نماز کے لئے کان سے پکڑ کر اٹھانا ان کا محبوب مشغلہ ہے.... سوائے امی جان کے.... امی جان کو وہ کان سے پکڑ کر نہیں اٹھاتے، کندھے سے پکڑ کر آہستہ سے ہلاتے ہیں.... جب تک سب کو نماز کے لئے اٹھا نہیں لیتے، انہیں چین نہیں آتا۔

اب چونکہ چھٹی کا دن تھا، لہٰذا نماز پڑھ کر جونہی گھر میں داخل ہوئے، پھر بستروں میں گھس گئے...... یہ اور بات ہے کہ امی جان کی آواز نے زیادہ دیر لحافوں کے مزے نہیں لینے دیئے۔

"لل.... لیکن امی جان.... آج کیا ہوا ہے؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"تمہارا سر۔" وہ جھلا اُٹھیں

میرا ہاتھ فوراً اپنے سر کی طرف گیا اور اسے اپنی جگہ پر پا کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

"بات کیا ہے امی جان؟"... توحید نے گھبرا کر کہا۔

"تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے"۔ انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

"کیا پھر کوئی کھلونا گم ہو گیا ہے؟"

"ہاں! کلاشن کوف غائب ہے.... پورے ساڑھے پانچ سو کی لائے تھے تمہارے ابو۔"

"ارے باپ رے! کلاشن کوف بھی گئی"۔

"ہاں بھئی کیا بات ہے؟" ابا جان غسل خانے سے نکلتے ہوئے بولے۔

"تین کھلونے تو پہلے چوری ہو چکے ہیں، چوتھا آج ہو گیا............ کوئی ہمارے کھلونوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں، اب آپ کھلونے لانا بند کر دیں... نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"آپ اپنے ان سپوتوں سے بات کریں نا، جو ہر ماہ ایک کھلونے کا مطالبہ داغ دیتے ہیں، نہ لاؤں تو منہ پھُلا لیتے ہیں اور ان کے منہ اس وقت تک نہیں پچکتے جب تک کہ میں کھلونا نہیں لاتا۔"

"آپ نے خود انہیں سر پر چڑھا رکھا ہے.... خود ہی اتاریں،..... لیکن اس سے پہلے اس چور کا کچھ کریں۔"

"بھئی اب اس کھلونا چور کے خلاف کیا کارروائی کروں.. بُرا سا لگتا ہے کہ پولیس کے پاس جاؤں اور وہ شبے میں کسی کو پکڑ لیں اور رنگائی کر دیں.... چاہے، وہ چور نہ ہو........ نہیں بھئی مجھے تو ایسا کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"اس طرح تو اس گھر میں ایک کھلونا نہیں بچے گا۔" امی بولیں۔

"ویسے یہ چور ہے عجیب، ہر ماہ کی پہلی یا دوسری

تاریخ کو کھلونا چرانے آجاتا ہے.... ہے کوئی تک، ویسے اسے پکڑنا کیا مشکل ہے بھلا .....

"اوہ ہاں واقعی.... اس چور کو تو ہم پولیس کی مدد کے بغیر بھی پکڑ سکتے ہیں...." رفعت نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن.... اس کے لئے پورے ایک ماہ تک انتظار کرنا پڑے گا.... اب پہلی سے پہلے تو وہ آنے کا نہیں۔" آصف بولا۔

"عجیب چور ہے..... ایک کھلونے سے زیادہ کبھی نہیں چراتا...." فاروق مسکرایا۔

"خیر ایک ماہ انتظار کر لیتے ہیں.... پھر اسے پکڑ ہی لیں گے۔" عثمان نے کہا۔

"بالکل ٹھیک...." فرحت بولی۔

"لیکن اس کا فائدہ کیا ہوگا!.. جب تک آپ اسے پولیس کے حوالے نہیں کریں گے، کچھ نہیں بنے گا۔" امی بولیں۔

"بھئی پہلے پکڑ تو لیں۔" ابا جان نے جھلا کر کہا۔

اور پھر ہم نے ایک ماہ تک انتظار کیا.... پہلی تاریخ کو ابا جان ایک رونے، ہنسنے والی گڑیا لائے.... ایک ہزار روپیہ کی تھی۔ ہم اسے دیکھ کر پہلے تو خوش ہوتے رہے.... پھر غمگین ہو گئے۔ یہ سمجھ کر کہ چور آئے گا اور اسے لے جائے گا.... پھر خیال آیا کہ اس بار تو ہم نے چور کو پکڑنے کا پروگرام بنا رکھا ہے....

رات کو ہم سب مشورہ کرنے بیٹھ گئے۔

"ہاں! اب کیا کرنا ہے؟" ابا جان بولے۔

"باری باری جاگ کر پہرہ دیں گے۔ کھلونوں والے کمرے کے سامنے والے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر اس کمرے میں دیکھتے رہیں گے۔ میں نے تجویز پیش کی۔

"چلو ٹھیک ہے.... لیکن میری ایک تجویز ہے۔" ابا جان بولے۔

"اور... وہ کیا ہے ابا جان!" سب نے ایک ساتھ کہا۔

"چور کو پکڑا نہ جائے.......... بلکہ اس کا تعاقب کیا جائے.......... یہ دیکھا جائے کہ وہ جاتا کہاں ہے...وہ ہے کون اور کیوں وہ ہمارے کھلونے چراتا ہے؟

"چلیے ٹھیک ہے..... ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"لیکن اس کا فائدہ کیا ہوگا؟" امی جان نے برا سا منہ بنایا۔

"بھئی ضرورت ہوئی تو اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے..... ضرورت نہ ہوئی اور معاملہ پولیس کے بغیر حل ہو گیا تو یہ زیادہ بہتر رہے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

اور پھر اس رات ہم باری باری جاگے.... تمام رات گزر گئی، لیکن چور نہ آیا.... دوسری رات پھر جاگنے کا پروگرام

بنا.... سب سو گئے' ابا جان کی باری سب سے پہلے جاگنے کی طے پائی تھی' لہٰذا وہ جاگتے رہے.....

دوسری صبح ہم بیدار ہوئے تو حیران سے رہ گئے.... کیونکہ ہمیں ابا جان نے جگایا ہی نہیں۔

"یہ کیا بات ہوئی ابا جان! کیا آپ خود ہی تمام رات جاگتے رہے" میں نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"نہیں بھئی! یہ بات نہیں.... مجھے پتا نہیں کب نیند آگئی اور اب صبح آنکھ کھلی ہے۔"

اوہ.... اور چور.... کیا وہ اپنا کام کر گیا؟"

"پتا نہیں...... پہلے نماز.... وقت نکلا جا رہا ہے۔" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

نماز کے بعد ہم کھلونوں والے کمرے میں چلے گئے.... تمام کھلونے موجود تھے' گویا چور اس مرتبہ آیا ہی نہیں تھا۔

"حیرت ہے..... وہ تو اس بار آیا ہی نہیں"۔ توحید نے کہا۔

"شاید اب اس نے اپنا پروگرام ختم کر دیا ہے۔" رفعت بولی۔

"اس کا مطلب ہے.... ہم چور کو نہیں پکڑ سکیں گے۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"دھت تیرے کی۔" آصف نے بھنّا کر کہا۔

بات آئی گئی ہو گئی...... لیکن ایک ماہ بعد پھر ایک کھلونا چوری ہو گیا' امی جان نے پھر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

"اب پولیس کو بلانا ہی ہو گا.... اس وقت تک تو وہ کھلونے چرا رہا ہے... کل زیورات پر اتر آیا تو کیا ہو گا...... گھر کی دوسری قیمتی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے لگ گیا تو کیا بنے گا۔" انہوں نے بھنّائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بیگم! ایک ماہ اور صبر کر لیں.... اس کے بعد جو آپ کہیں گی' کر لیں گے۔" ابا جان نے کہا۔

اور امی جان منہ بنا کر رہ گئیں...... ایک ماہ اور گزر گیا.... اس بار پہلی تاریخ کو پھر باری باری جاگنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ابا جان جلد سو جانے کے عادی تھے' لہٰذا ان کی باری سب سے آخر میں رکھی گئی.... ہم باری باری جاگتے رہے... رات کے بارہ بجے کے قریب میری باری آئی...... میں نے آنکھیں کھلونے والے کمرے پر جما دیں اور دعا کرنے لگا کہ چور میری باری میں آئے۔ اچانک میں نے ہلکی سی آواز سنی...... پھر ایک منٹ بعد کوئی دبے پاؤں چلتا ہوا کھلونوں والے کمرے تک آیا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا.... اسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا... کھلونا چُرا کر وہ باہر نکل گیا۔ میں ساکت بیٹھا رہ گیا...... پھر میں گہری نیند سو گیا.... دوسری صبح سب نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا بات ہوئی.. کھلونا غائب ہے اور ہماری جاگنے کی باری آئی بھی نہیں۔" رفعت بولی۔

"میری باری تک بات ختم ہوگئی تھی' اس لئے میں نے اپنے بعد کسی کو نہیں جگایا"۔

"کیامطلب...... تم نے چور کو دیکھ لیا تھا؟" ابا جان حیران ہو کر بولے۔

"ہاں ابا جان...... میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

"تو پھر پکڑا کیوں نہیں.... شور کیوں نہ مچایا..... ہمیں کیوں نہ جگایا۔"

"اس کی وجہ ہے..... میں آپ سب کو شام کے وقت بتا دوں گا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" توحید نے منہ بنایا۔

"بس شام تک سب لوگ صبر کرلیں۔"

"اچھی بات ہے.. کرلیتے ہیں۔"

اسی شام میں چور کے دروازے پر گیا... چور بھی ایک منٹ پہلے ہی گھر میں داخل ہوا تھا... وہ ابھی ابھی اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوا تھا.....

"ابو آپ آگئے...... آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا...... میرا کھلونا۔" ایک بچی کی آواز سنائی دی۔

"ہاں بیٹی...... یہ دیکھو.... ڈھول بجانے والا کتنا بڑا بندر لایا ہوں تمہارے لئے..... میں جانتا ہوں... کھلونا لے کر نہ آتا تو تمہاری آنکھوں میں آنسو آجاتے...... اور میں تمہاری آنکھوں میں بس آنسو ہی تو نہیں دیکھ سکتا.... ان آنسوؤں کو روکنے کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں..... سب کچھ....."

میں نے محسوس کیا' چور کی آنکھوں میں اس وقت آنسو آگئے ہیں.... ادھر بچی خوشی سے بندر کا بٹن دبا چکی تھی اور وہ ڈھول بجا رہا تھا..... ڈھول کی آواز میرے دل پر دستک دے رہی تھی.... میں بھاری قدموں سے واپس لوٹ گیا۔

گھر کے سب افراد میرے گرد جمع ہوگئے....

"ہاں بھئی... کون ہے ہمارا چور؟"

"میرا خیال ہے.... آپ نہ پوچھیں۔" میں بولا۔

"کیوں نہ پوچھیں.... مارے سسپنس کے ہمراہ بُرا حال ہے.... اور جناب کہہ رہے ہیں' نہ پوچھیں۔"

"ہاں! بہتر یہی ہے..... نہ پوچھیں۔"

"نہیں! ہم تو پوچھ کر رہیں گے۔"

"اچھی بات ہے.... ہمارے سامنے سیٹھ اجمل کی عالی شان کوٹھی ہے نا..."

"ہاں ہاں.... تو پھر...... کیا سیٹھ اجمل چور ہیں؟" امی نے حیران ہو کر کہا۔

"جی نہیں.... ان کی کوٹھی میں کوئی ملازم ہے؟"

"بابا صداقت... جو اکثر ہمارے گھر بھی آتا رہتا ہے... سیٹھ صاحب کے کسی کام یا ایسے بھی علیک سلیک کرنے" ابا جان فوراً بولے۔

"بس وہی چور ہے.... لیکن وہ یہ چوری اپنی بچی کے لئے کرتا ہے... بچی سیٹھ صاحب کے بچوں کو

قیمتی کھلونوں سے کھیلتے دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں.... بوڑھا باپ تڑپ جاتا ہے، وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا.... اتنی تنخواہ نہیں کہ قیمتی کھلونے خرید سکے.... لے دے کے اسے یہ حل نظر آیا۔"

"اف مالک! اب ہم کیا کریں۔" امی جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اگر ہم اسے بتاتے ہیں کہ ہم نے اس کی چوری پکڑلی ہے.... تو اس کی نظریں کبھی بھی اوپر نہیں اٹھ سکیں گی۔" ابا جان بولے۔

"اور پھر وہ اپنی بیٹی کو کھلونے بھی نہیں دے سکے گا۔"

"تب پھر کیا کیا جائے؟"

"کوئی حل نہیں سوجھ رہا۔" میں نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"ہاں واقعی..... کریں تو کیا.... پھر اگر ہر ماہ بابا صداقت کو ایک کھلونا ایسے ہی دیتے ہیں تو بھی اس کی نظریں نیچی ہوتی ہیں.... اور شاید وہ سمجھ جائے کہ ہم اس کی چوری کو بھانپ چکے ہیں۔"

"بالکل! وہ یہی خیال کرے گا۔"

"تب پھر.... آخر اس کا کیا حل ہے؟"

"حل!!! ہم سب کے ذہن میں یہ لفظ ہل چل مچانے لگا...... ہر کوئی سوچ کے سمندر میں اتر گیا... پھر ہمیں یوں لگنے لگا جیسے اس مسئلے کا کوئی حل ہمیں بجھائی نہیں دے گا اور ہم اس سمندر میں ڈوبے کے ڈوبے رہ جائیں گے.... کبھی اُبھر نہیں سکیں گے۔

آخر ابا جان کی بھرّائی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں نے حل ڈھونڈ لیا ہے۔"

"بھئی واہ... جلدی بتایئے۔" ہم سب سمندر سے نکل آئے.... چہرے چمکنے لگے۔

"حل یہی ہے کہ اب ہم لمبی تان کر سویا کریں گے..... اب ہمارے گھر میں کھلونا چوری ہونے پر آسمان سر پر نہیں اٹھایا جائے گا.... ہم بڑے بڑے منہ نہیں بنایا کریں گے بلکہ....." ابا جان کہتے کہتے رک گئے۔

"بلکہ کیا؟" سب ایک ساتھ بولے۔

"بلکہ یہ کہ کھلونا چوری ہونے پر خوش ہوا کریں گے... خوشی سے بغلیں بجایا کریں گے...."

"بہت خوب! اس مسئلے کا اس سے خوب صورت حل کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تو پھر اس ماہ کی بغلیں بجالیں۔" امی جان نے ہنس کر کہا۔

اور ہم بغلیں بجانے لگے۔

(نوٹ : کیا اس مسئلے کا بس یہی ایک حل تھا)

کپڑوں کی ڈرائی کلیننگ میں بہترین

قالین کی صفائی میں اعلیٰ ترین

TIP_TOP

DRYCLEANERS

TOPS IN DRYCLEANING

*

ہیڈ آفس

علامہ اقبال روڈ ــــ ۴۵۵۰۹۴۳

*

برانچ آفس

* حسن اپارٹمنٹس ــ ۴۹۶۵۰۶۸
* کلفٹن ــــــ ۵۳۰۳۶۹
* ویڈن برن روڈ ــ ۴۹۴۶۶۱۹
* ڈیفنس سوسائٹی ــ ۵۴۲۱۶۳
* ناظم آباد ــ ۶۲۳۸۱۳
* بلوچ کالونی ۴۳۲۹۵۹

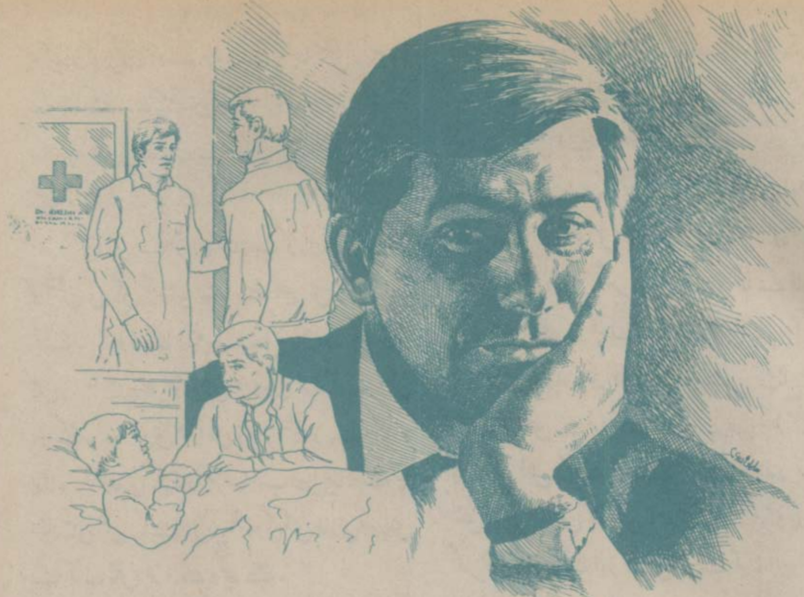

بوجھ

راحت صلاح الدین

ڈاکٹر مشہود نے نگاہ اٹھا کر دیوار پر نصب گھڑی کی جانب دیکھا۔ گھڑی کی سنہری سوئیاں گیارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک طویل سانس کھینچ کر کمر کرسی کی پشت سے لگائی اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ آج وہ اپنے آپ کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آج "طحہٰ کلینک" پر مریضوں کی لمبی لائن لگ گئی تھی اور ان تمام مریضوں کا معائنہ کرتے کرتے ڈاکٹر مشہود کو اپنے کلینک پر مزید ایک گھنٹہ لگانا پڑا۔ دوپہر میں بھی ان کو آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا جس کی بنا پر تھکاوٹ ڈاکٹر مشہود کے چہرے سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ یکدم آنکھیں کھول کر ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میز پر رکھی گاڑی کی چابی اٹھانے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اسی لمحے ایک شخص بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے چوکیدار بابا بھی بڑبڑاتے ہوئے کلینک کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ جو شاید اس آدمی کو روکنے کی کوشش کرتے کرتے خود بھی اس کے ساتھ ہی اندر چلے آئے تھے۔

"کیا بات ہے رحیم بابا؟" ڈاکٹر مشہود نے

چوکیدار کو دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا لیکن رحیم بابا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ شخص بول پڑا۔ "ڈاکٹر صاحب جلدی سے میرے ساتھ چلئے کہیں میرے بیٹے کو کچھ ہو نہ جائے۔"

"بیٹا میں نے تو ان صاحب کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر یہ کچھ سنے بغیر ہی اندر چلے آئے۔" بوڑھے رحیم بابا نے اپنی نحیف سی آواز میں..... انہیں بتایا تو وہ لمبی سی ہوں کر کے خاموش ہو گئے۔ وہ آدمی فوراً ہی ڈاکٹر مشہود سے دوبارہ بولا۔ "جلدی کیجئے ڈاکٹر صاحب میرا بیٹا بہت تیز بخار میں جل رہا ہے اس پر غنودگی بھی طاری ہو رہی ہے آپ چل کر اسے دیکھ لیجئے۔"

"رحیم بابا آپ کلینک کو بند کر دیجئے میں بس اب واپس جا رہا ہوں۔" ڈاکٹر مشہود چابی اٹھاتے ہوئے رحیم بابا سے بولے۔ "اس وقت تو میرا آپ کے ساتھ جانا ممکن نہیں لیکن آپ ایسا کریں کل اپنے بیٹے کو اپنے ہمراہ کلینک پر لے آئیں میں اسے دیکھ لوں گا۔" "اس کی حالت ایسی نہیں کہ اسے یہاں لایا جا سکے۔ آپ پلیز میرے ساتھ چل کر اسے ایک نظر دیکھ لیں اور دوا تجویز کر دیں۔" وہ تیزی سے ان کی منت کرتے ہوئے بولا تو ڈاکٹر مشہود کا دل پسیج گیا مگر وہ چاہنے کے باوجود بھی اس کے ساتھ جانے کی ہامی نہ بھر سکے۔ دوپہر بھی انہیں پوری طرح سے اپنی تھکن دور کرنے کا موقع میسر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے کلینک پر ہر روز صبح نو بجے سے ایک بجے تک اور پھر شام پانچ سے رات دس بجے تک بیٹھا کرتے اور ایک سے پانچ بجے تک کے لئے وہ "طحہٰ کلینک" میں اپنے اسسٹنٹ کو بٹھا کر گھر چلے جاتے جہاں بہت تھوڑا ہی سہی کچھ وقت آرام کے لئے بھی مل جاتا تھا مگر آج وہ اپنے معمول کے مطابق گھر پہنچ کر کھانا کھا کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ کلینک سے ایمرجنسی کال آ گئی یوں انہیں دوبارہ فوراً ہی طحہٰ کلینک پر پہنچنا پڑا۔ اس ایمرجنسی سے فراغت پانے کے بعد ڈاکٹر مشہود وزٹ پر نکل گئے جو ان کے معمول کا حصہ تھا۔ یعنی اپنے سیریس کنڈیشن اور مستقل مریضوں کو گھر جا کے دیکھنا اور انہیں ٹریٹ کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔

"وہ دیکھیں آپ کسی اور ڈاکٹر کو ڈھونڈیں جو آپ کے ساتھ جانے پر راضی ہو جائے۔ مجھے تو اب آپ گھر جانے دیں۔" وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے۔ وہ آدمی بھی بڑی تیزی سے ان کے پیچھے لپکا لیکن وہ لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے اپنی کار تک پہنچے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر کار کے اندر بیٹھ کر اسے آگے بڑھاتے چلے گئے۔

ڈاکٹر مشہود پچھلے سولہ برسوں سے ڈاکٹری کے مقدس پیشے سے وابستہ اپنے وطن کے لوگوں کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عزّت، شہرت اور دولت ہر ایک نعمت سے نوازا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دے رکھی تھی جس کا شکر وہ ہر لمحے اپنے

دل میں کیا کرتے۔ سولہ برس پہلے جب وہ اس پیشے سے منسلک ہوئے تھے تب انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ وہ اپنے پیشے سے پورا پورا انصاف کریں گے۔ اپنے اس عہد پر ڈاکٹر مشہود ان سولہ سالوں کے دوران پوری طرح کاربند رہے تھے۔ کسی بھی مریض کو انہوں نے کبھی بھی مایوس نہیں کیا تھا بلکہ ہر مریض کا چیک اپ پوری توجہ اور دیانت داری سے کرتے آئے تھے۔ ضرورت پڑنے پر مریض کے گھر جا کر بھی دیکھتے تھے۔ مگر آج انتہائی مجبوری کی حالت میں اس آدمی کے ساتھ جانے سے انکار کر بیٹھے جس کا احساس ملامت کی صورت..... ڈرائیونگ کرتے ہوئے انہیں ہو رہا تھا لیکن ذرا دیر بعد ہی وہ سر جھٹک کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے چلے گئے۔

گھر کے مین گیٹ پر کار روک کر انہوں نے ہارن بجایا۔ دو منٹ بعد ہی کوارٹر سے ایک نوجوان آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا اور گیٹ کھولنے لگا۔ اس نوجوان کو انہوں نے ابھی پچھلے ہفتے ہی گھر کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینے کے لئے اور مہمانوں وغیرہ کی آمد پر گیٹ کھولنے اور بند کرنے کی ذمہ داری پر ملازم رکھا تھا۔ اپنی نرم مزاج طبیعت اور رحمدلی کی وجہ سے ڈاکٹر مشہود ہر ایک سے برابری کا رویہ اختیار رکھتے۔ چاہے کوئی امیر ہو یا غریب ...... چھوٹا ہو یا بڑا۔ سب سے عزّت و احترام سے پیش آتے تھے۔ احمد کے لئے بھی وہ اپنے دل میں اپنے بچوں کی طرح ہی محبت کی گرمی کو محسوس کرنے لگے تھے۔ گیٹ کو مقفل کر کے احمد کوارٹر میں واپس جانے لگا تو وہ گاڑی کو لاک کرتے ہوئے اس سے مشفقانہ لہجے میں پوچھنے لگے۔ "کیسے ہو بیٹا؟" "ٹھیک ہوں صاحب جی۔" احمد نے نیند کے عالم میں اتنی آہستگی سے جواب دیا کہ ڈاکٹر مشہود سن نہ سکے۔ کار کا دروازہ چیک کرنے کے لئے انہوں نے جونہی گاڑی کی طرف دیکھا احمد نے اپنے قدم کوارٹر کی جانب بڑھا دیئے۔ احمد کو جاتا دیکھ کر وہ بھی گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

بیگم مشہود نے ان کو آتے دیکھ کر ان سے کھانے کو پوچھا۔ مگر وہ انکار کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اس لمحے ڈاکٹر مشہود آرام کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ بھوک لگنے کے باوجود بھی وہ انکار کر بیٹھے تھے۔

اپنے بیڈ روم سے ملحق بچوں کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر مشہود نے بند دروازے سے روشنی کی لکیر کو باہر آتے دیکھا تو وہ دروازہ کھول کر اندر کا جائزہ لینے لگے۔

ان کے دونوں بچے سمیع اور بشریٰ کتابیں اور کاپیاں بکھرائے پڑھنے میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ جبکہ ان کا چھوٹا بیٹا مزمّل آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔ آہٹ ہونے پر سمیع اور بشریٰ نے گردن گھما کر دروازہ کی سمت دیکھا مزمل بھی آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا۔ اپنے تینوں بچوں کو جاگتا پا کر وہ فوراً ہی بول پڑے۔ "ارے بچو! آپ لوگ ابھی تک

جاگ رہے ہو؟"

"جی بابا جان ...... " تینوں بچوں نے پہلے تو ان کو سلام کیا اس کے بعد سمیع نے ان کے سوال کا جواب دیا۔ "اصل میں دو ماہ بعد ہمارے امتحان ہونے والے ہیں بس ہم اسی کی تیاری کرنے میں مصروف ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے بیٹا لیکن آپ نے وقت دیکھا ہے۔" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ ان کے توجہ دلانے پر سمیع اور بشریٰ کی نظریں گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ زیادہ وقت ہو جانے پر دونوں بہن بھائی بری طرح سے چونک گئے۔

"اب آپ جلدی سے سونے کی تیاری کریں۔ دیکھیں آپ دونوں کی وجہ سے مومی کو بھی جاگنا پڑ رہا ہے۔ جلدی سے لائٹ آف کریں تاکہ آپ کے بھائی کو بھی آرام ملے اور یہ جلدی سے ٹھیک ہو۔" انہوں نے کہا تو وہ "بہت بہتر" کہتے ہوئے اپنی کاپیاں اور کتابیں سمیٹنے لگے۔ ڈاکٹر مشہود نے مزمل کے قریب پہنچ کر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بخار کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بلکہ انہیں تو پہلے سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ "مومی بیٹا جلدی سے بخار کو اپنے سے دور بھگائیں۔" وہ بولے تو مزمل نے اتنی معصومیت سے گردن ہلائی کہ ڈاکٹر مشہود کو بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ انہوں نے جھک کر مزمل کی جلتی ہوئی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر اسے بوسہ دے دیا۔

"اچھا بچو شب بخیر۔" وہ مزمل کو پیار کر کے واپس جاتے ہوئے بولے تو سمیع اور بشریٰ نے ایک ساتھ کہا۔ "شب بخیر بابا جان۔"

انہوں نے جونہی دروازہ بند کیا فوراً ہی اندر کی بتی گل ہو گئی۔ دروازہ بند کر کے ڈاکٹر مشہود نے اپنے قدم بیڈ روم کی طرف بڑھا دیئے جہاں پہنچ کر اپنے جوتے اور موزے اتار کر وہ بستر پر دراز ہو گئے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند کی وادی میں پہنچ گئے۔ ابھی انہیں سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بشریٰ کی پریشان آواز نے نیند سے جگا دیا۔ "بابا جان جلدی سے اٹھ کر مزمل کو دیکھیں اسے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔"

بشریٰ کے گھبرائے ہوئے لہجے کو سن کر وہ پریشان ہو کر اٹھ بیٹھے۔ چند سیکنڈوں کے بعد وہ اپنے بچوں کے کمرے میں موجود تھے۔ جہاں پر بیگم مشہود اور سمیع بہت پریشانی سے مزمل کو دیکھ رہے تھے۔ جس کے حلق سے کوؤں جیسی آواز نکل رہی تھی۔ انہوں نے مزمل کا معائنہ کیا جونہی اس کا منہ کھول کر دیکھا سانس کی نالی میں بڑی تیزی سے جھلی بنتے ہوئے دیکھی۔ جس سے مزمل کو سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کو اس انجیکشن کا خیال آیا جو ایسے مریض کو لگایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مشہور فوراً اپنے بیڈ روم میں پہنچے اور اس جگہ کو دیکھنے لگے جہاں کچھ

دوائیاں خرید کر وہ اپنے پاس بھی رکھا کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے ان دوائیوں میں وہ انجیکشن بھی تھا جس کی ضرورت اس لمحے پڑ گئی تھی۔ اس کو لے کر وہ بچوں کے کمرے میں گئے اور جاتے ہی انجیکشن مزمل کو لگایا۔

رات بھر مزمل کی بگڑی حالت کی وجہ سے انہیں جاگنا پڑا اور ایسے میں وہ اللہ سے مزمل کی صحتیابی کی دعائیں مانگتے رہے۔ اسی دوران کلینک پر رات آنے والا شخص یاد آیا جسے انہوں نے مایوس لوٹا دیا تھا۔ یہ یاد آتے ہی ڈاکٹر مشہود کر ایسا لگا جیسے یہ سب اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دینے کے لئے کیا ہو۔ اس احساس نے ان کو بے چین کر دیا۔

طلوع سحر کے وقت مزمل کی بگڑتی ہوئی حالت سنبھلی تب وہ اپنے رب ذوالجلال کا شکر کرنے لگے۔ لیکن ان کے دل پر جو بوجھ آ پڑا تھا وہ پچھتاوے کی صورت میں موجود رہا۔ اگر رات وہ اسے مایوس نہ لوٹاتے تو انہیں یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔

چار پانچ ماہ کے بعد ایک دن جب ڈاکٹر مشہود اپنے لئے ایک کتاب خریدنے کتابوں کی دکان پر گئے تو وہیں پر ان کی ملاقات اس آدمی سے ہو گئی جو اس رات ان کے کلینک پہ آیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھے تاکہ وہ اس سے معافی مانگ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے آگے بڑھ کر روک لیا۔

ڈاکٹر مشہود نے اپنا تعارف کراتے ہوئے یاد دلایا کہ چند مہینے قبل وہ "طلحہٰ کلینک" پہ آئے تھے تو یہ یاد آتے ہی وہ انہیں پہچان گیا۔ اس نے بھی آگے بڑھ کر ان سے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں اس رات اپنے ساتھ گزرنے والے واقعے کو بیان کرنے کے دوران اپنے دل پہ پڑے بوجھ کو بھی ہلکا کرنے کی خاطر کہہ سنایا۔ جسے سن کر وہ فوراً ہی بول پڑا۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب آپ ایسا ہرگز بھی مت سمجھئے کہ اس روز آپ میرے ساتھ نہیں گئے تو میں نے آپ کو بد دعا دی تھی، ہر انسان کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں میں اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں........."

"ابو میں نے اپنی پسند کی کتابیں لے لی ہیں آپ ان کی قیمت ادا کر کے گھر چلئے۔" ایک بارہ تیرہ سال کے بچے نے درمیان میں آکر کہا تو وہ اپنی بات کو ادھوری چھوڑ کر بچے سے بات کرنے لگا۔

"اچھا عباد بیٹے ابھی گھر چلتے ہیں پہلے انکل کو سلام کرو۔"

اپنے باپ کے کہنے پر بچے نے انہیں سلام کیا تو ڈاکٹر مشہود نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ بچے کے سر پر رکھ دیا۔

"اس رات اسی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے آپ کے پاس آنا پڑا تھا۔" اس نے بتایا تو ایک لمحے کے لئے ان کا ہاتھ کانپ

کر رہ گیا۔ اگر اس معصوم سے بچے کو کچھ ہو جاتا تو شائد وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتے۔ اس خیال کے آنے پر ہی ان کا دل خوف خدا سے لرز گیا تھا۔

"آپ نے مجھے مایوس تو لوٹا دیا تھا لیکن گھر واپسی کے دوران میرا پرانا دوست مل گیا تھا جو ڈاکٹری کے پیشے سے ہی منسلک تھا۔ اسی نے میرے ساتھ چل کر میری پریشانی دور کر دی تھی۔" وہ اپنے ساتھ گزرنے والے لمحات کو بتانے لگا تو بچے نے ایک مرتبہ پھر مداخلت کی۔

"ابو! چلیں ناں دیر ہو رہی ہے۔" تو وہ ڈاکٹر مشہود سے اجازت لیتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ اس بات کا اثر نہ لیں کہ اس روز آپ میرے ساتھ نہیں گئے تو آپ کو اسی وجہ سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ ایسا سوچیں بھی مت کیونکہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے اس میں کسی دوسری پریشانی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔"

وہ یہ کہہ کر اپنے بیٹے کے ساتھ بل ادا کرنے کے لئے سیلز مین کی طرف بڑھ گیا۔

ڈاکٹر مشہود کو کتابوں کی دکان سے اپنی مطلوبہ کتاب تو نہیں ملی تھی مگر اس شخص سے ملنے کے بعد وہ ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک بڑا بوجھ دل سے ہٹ گیا ہو!!

کرکٹ

آج تک جو شخص بولنگ کرتے ہوئے سب سے دور بیلز پھینک سکا ہے اس کا نام ڈاکٹر اے۔ ایف۔ مارکم ہے اس نے بولنگ کرتے ہوئے ۱/۲ ۷۰ گز دور بیل پھینکی تھی۔

شروع میں کوئی وکٹ کیپر نہیں ہوتا تھا۔ بولر ہی بھاگ کر گیند لاتا تھا سب سے پہلا وکٹ کیپر (۱۷۸۱ء) ٹام سویسٹر ہوا ہے۔

وائڈز کا اندراج ۱۸۲۷ء سے پہلے نائز میں ہوتا تھا۔ ۱۷ ستمبر ۱۸۲۷ء کو سب سے پہلے ان کا الگ اندراج ہوا۔

جہاں تک علم ہو سکا ہے عورتوں کا کرکٹ میچ سب سے پہلے ۲۶ جولائی ۱۷۴۵ء کو ہوا تھا۔

باونڈریز سب سے پہلے ۱۸۸۴ء میں ضابطے میں شامل کی گئیں۔

اکتوبر ۱۸۵۹ء میں نیو یارک کے مقام پر سردی کی شدت کی وجہ سے کھلاڑیوں نے اوور کوٹ اور دستانے پہن کر میچ کھیلا تھا۔

بولنگ کے وقت ڈاکٹر جہانگیر کی گیند کے سامنے آ کر ایک چڑیا مر گئی تھی۔ ایم۔ سی۔ سی۔ کے عجائب گھر میں یہ چڑیا اور گیند موجود ہے۔

پیڈ کا آغاز اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے شروع میں ہوا۔ اس وقت ایک ٹانگ پر ایک پتلا سا گتے کا ٹکڑا باندھ لیتے تھے۔

مرسلہ: جاوید اصغر سومرو، رحیم یار خان۔

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوں کے جواب

سمیرا قاسم، حیدر آباد کینٹ۔ خصوصی نمبر بے حد پسند آیا۔ کہانیوں میں "موتیے کے گجرے" بہت پسند آئی۔ **فرحان محمد حسین گھانچی، کراچی۔** اپریل کے محنت کش بچے نمبر کی کہانیاں اور نظمیں اچھی تھیں۔ خاص کر "وزیر اعظم کا شکریہ" اور "عالمی میلے میں" بہت اچھی لگیں۔ **عرفان محمد حسین گھانچی، کراچی۔** محنت کش بچے نمبر ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں۔ **فیصل احمد خان، کراچی۔** سلسلہ وار کہانی "وہ کیا راز تھا" کی آخری قسط پسند آئی کیا آپ اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے؟ **محمد زاہد سلیم آرائیں، کراچی۔** "وہ کیا راز تھا" کی آخری قسط اچھی تھی لیکن قسط وار ڈرامے کی چوتھی قسط میں مزا نہیں آیا۔ **محمد حسین عارف خان، کراچی۔** اپریل کے شمارے میں "میں جنت کا خواہش مند ہوں" "حمد باری تعالیٰ" "سوئیٹر کے عوض" اور "عینک والا جن" بے حد اچھی کاوشیں تھیں۔ "وہ کیا راز تھا" کا اختتام خوبصورت تھا۔ **محمد عمران بن ظہور، کراچی۔** سرورق نہایت فکر انگیز تھا اور خوبصورت بھی۔ ابن آس، محمد رافع، محمد عمر احمد خان، حفیظ الرحمٰن احسن کی تحریریں بہت زیادہ پسند آئیں۔ **محمد نوشاد عالم، کراچی۔** اپریل کے شمارے کی تمام

تحریریں لاجواب تھیں۔ اداریے میں طاہر مسعود صاحب نے بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ "کرنیں بکھیرتے یہ ننھے ننھے ہاتھ" "ستارے چمکتے رہیں گے" "سوتا جاگتا ابوالحسن" "سب سے بڑا مفکر" "عالمی میلے میں" "یہ دنیا اپنا گھر ہے" اچھی کاوشیں تھیں۔ قلم دوست کی تحریریں بھی پسند آئیں۔ **مزمل عبدالرحمٰن، کراچی۔** ٹائیٹل جاذبِ نظر اور معنی خیز تھا۔ "سنہرے حروف" ہمیں فاتحین اسلام کی فتوحات کا راز بتاتے چلے۔ "موتیوں کے گجرے" "وزیراعظم کا شکریہ" اور "سوئیٹر کے عوض" محنت کش بچوں کے حوالے سے متاثر کہانیاں تھیں۔ "عینک والا جن" میں وہی پرانی باتیں تھیں۔ "وہ کیا راز تھا" کے راز کو آخر ہم نے پا ہی لیا۔ یہ قسط وار کہانی اگرچہ حقیقت سے دور اور عام آدمی کی زندگی سے ہٹ کر تھی لیکن باوجود اس کے اس کا موضوع نیا اور مقصد اچھا تھا۔ ہر قسط سسپنس سے بھرپور تھی کسی بھی قسط میں بوریت کا احساس نہیں ہوا اور ہر دفعہ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہا۔ (اگلے ناول کا انتظار رہے گا) **جمیل بشیر احمد، حیدر آباد۔** "سب سے بڑے مفکر" "راستہ بھول کر" اور نظم "شادی کا جھگڑا بہت پسند آئی۔ **عدیل ستار، کراچی۔** خصوصی شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ **محمد حسین اعوان، لاہور۔** سرورق بہت پیارا تھا۔ "وزیراعظم کا شکریہ" "عینک والا جن" اور "سوئیٹر کے عوض" اچھی تحریریں تھیں۔ **شہزاد گل، سعیدہ احمد، لاہور۔** لطیفے پیٹ میں بل ڈالنے والے تھے۔ "وہ کیا راز تھا" کی آخری قسط بہت اچھی تھی۔ نظموں میں "آیا آیا بہار کا موسم" اور "دو دوست" پسند آئیں۔ **علی رشید، ملتان۔** اپریل کا شمارہ نہایت شاندار تھا۔ سرورق بے حد اچھا لگا۔ **فوزیہ علوی، پٹارو۔** سرورق نہایت شاندار تھا کہانیاں سب اچھی تھیں۔ قسط وار کہانی کی آخری قسط پڑھ کر بہت مزا آیا۔ لطیفے بھی اس دفعہ بہت اچھے تھے۔ **محمد بلال تاج، محمد عمر تاج، کراچی۔** یوں تو ساری ہی کہانیاں اچھی تھیں لیکن جو کہانیاں زیادہ اچھی لگیں ان میں "راستہ بھول کر" "وزیراعظم کا شکریہ" "عینک والا جن" اور سوئیٹر کے عوض سرفہرست رہیں۔ اس کے علاوہ "سونا کیسے دریافت ہوا" "سب سے بڑے مفکر" "شادی کا جھگڑا" اور "یہ دنیا اپنا گھر ہے" بھی اچھی کاوشیں تھیں۔ **عبدالرؤف روفی، ملتان چھاؤنی۔** اس شمارے کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ "وہ کیا راز تھا" کی آخری قسط بہت اچھی لگی۔ **افشاں بشیر، کراچی۔** ابن آس میرے پسندیدہ رائٹر ہیں ان کی کہانی "وزیراعظم کا شکریہ" بہت پسند آئی۔ پرچے میں عبدالقادر صاحب کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ **زبیدہ ضمیر، جامپور۔** اس ماہ کا رسالہ پسند آیا۔ کیا آپ "وہ کیا راز تھا" کو کتابی صورت شائع کریں گے؟ ○ ...... اگر آپ کا پر زور اصرار ہوا تو۔ **حاجی محمد خان، کراچی۔** شمارہ جلد ہی مل گیا۔ کہانیاں پڑھ کر لطف ہی آگیا۔ قسط وار کہانی کی آخری قسط پسند آئی۔ **مسعود احمد سومرو، گڈو کالونی۔** "عینک والا جن" اور "شادی کا جھگڑا" بہت پسند آئیں۔ **آمنہ طارق، کراچی۔** سرورق بہت خوبصورت تھا۔ قسط وار کہانی کا اختتام پڑھ کر جسم میں سنسنی دوڑ ہوگئی۔ **مظہر اقبال، ساجد عبدالحکیم، کمالیہ۔** "حمد باری تعالیٰ" "عالمی میلے میں" "شادی کا جھگڑا" "آیا آیا بہار کا موسم" اور "امتحان

آگیا" جیسی نظمیں بے حد پسند آئیں۔ **محمد اشفاق' جھڈو۔** نظمیں تمام اچھی تھیں۔ "وہ کیا راز تھا" اچھے انداز میں اختتام پذیر ہوئی۔ **محمد نعمان خان' کوہاٹ** اپریل کا شمارہ بہت پیارا تھا۔ "میں جنت کا خواہش مند ہوں" بہت پسند آئی۔ **افضال احمد خان' کراچی۔** رسالے کے صفحات آپس میں گڈمڈ تھے۔ آمنے سامنے کے سوالات پڑھ کر غصہ آیا کہ عالمی چیمپئن سے ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں کہ آپ قبرستان سے گزر رہے ہوں اور کوئی مردہ سامنے آجائے یا چڑیل نکل آئے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح جولائی ۹۴ء میں مجھے انعام کا حقدار ٹھہرایا گیا لیکن انعام ابھی تک نہیں ملا بہرحال اب رسالے کی طرف آتا ہوں۔ رسالے کا معیار مسلسل بڑھ رہا ہے۔ معلوماتی مضامین میں اضافہ خوش آئند ہے۔ قسط وار کہانی کا اختتام بھرپور تھا۔ میری جانب سے عمر احمد خان کو مبارک باد ○ ۔۔۔ اچھے بھائی افضال! تنقیدی خط بھیجنے کا شکریہ! آپ کی شکایات نوٹ کرلی گئی ہیں۔ **ذکریٰ وحید' لاہور۔** اپریل کے شمارے میں محنت کش بچوں کے لئے ایک خصوصی گوشہ رکھا گیا مجھے اس پر اعتراض یہ ہے کہ ایسے بچوں کو "بے چارہ" اور "بے کس" سمجھتے ہوئے قابل رحم انداز میں لکھا گیا۔ محنت کرنا تو عظمت کی علامت ہے۔ محنت کش بچے تو اپنے ہنر کی وجہ سے اپنے گھر والوں کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ قسط وار کہانی کا اختتام پسند نہیں آیا۔ حیرت کی بات ہے کہ طاقتور اور منظم دشمن نے نایاب خون رکھنے والے نوجوان کو جو انہیں مطلوب تھا اور جس کی وہ کافی حد تک ٹریننگ کرچکے تھے اتنی آسانی سے اسے چھوڑ دیا۔ ○ ۔۔۔ ذکریٰ بی بی! آپ نے کہانی کا شاید غور سے مطالعہ نہیں کیا۔ خضر نے اسے شیطانی طاقت زائل کرنے والا مشروب ہی اس لئے پلایا تھا کہ اس کا نایاب خون دشمن کے لئے آئندہ کارآمد ثابت نہ ہوسکے۔ **رضوان ظہیر' بینش' کراچی۔** سرورق خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں "سوئیٹر کے عوض" بے حد پسند آئی۔ **وقاص مسعود' سعد' اویس' (؟)۔** آنکھ مچولی ہمیں بے حد پسند ہے۔ ہمارا خط خاص نمبر میں ضرور شامل کریں۔ **بالاچ بلوچ' پسنی۔** تازہ شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ تمام کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ آپ لوگوں کی محنت دیکھ کر واقعی رشک آتا ہے۔ کیونکہ کراچی کے حالات بہت سنگین ہیں اور آپ لوگوں نے مہینے سے پہلے رسالے کو شائع کیا۔ **عبدالستار خان طاہر' بورے والا۔** سرورق کچھ زیادہ ہی دیدہ زیب تھا مصور نے محنت کش بچوں کے حوالے سے خوب عکاسی کی۔ "سنہرے حروف" اور "اداریہ" "میں جنت کا خواہش مند ہوں اور "ستارے چمکتے رہیں گے" اچھی تحریریں تھیں۔ عمر احمد خان کی قسط وار کہانی ختم ہوگئی لیکن کہانی کے عنوان کے مطابق "راز" راز ہی رہا۔ میرا مطلب کہانی "ہوٹل اسپائیڈر" سے ہے یعنی اس کا معمہ تو حل نہ ہوا ○ ۔۔۔ مشرقی پاکستان ہم سے الگ کردیا گیا۔ راولپنڈی میں سانحہ اوراوجڑی کیمپ واقعہ پیش آیا۔ پاکستان کے ایک صدر اور اہم ترین فوجی جرنیل ایک سازش کے تحت سی ون تھرٹی طیارے میں مار دئے گئے ان تمام واقعات پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ عوام کو آج تک ان محرکات سے آگاہ نہیں کیا گیا پھر "وہ کیا راز تھا" تو ایک عام سی کہانی ہے جس میں پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات کی ہلکی

سی منظر کشی کی گئی ہے۔ **سعدیہ شارق، عزیز آباد۔** اپریل کے شمارے میں اپنا نام دیکھا بے حد خوشی ہوئی کہانیاں اور نظمیں سبق آموز تھیں۔ **محمد عاصم، صوبہ سرحد۔** خصوصی شمارے کی تحریر ایک سے بڑھ کر ایک تھی لیکن سب سے زیادہ "سوئیٹر کے عوض" اور "اپنی دنیا آپ پیدا کر" پسند آئی۔ **عدنان عادل، حیدر آباد۔** "وزیر اعظم کا شکریہ" "سوئیٹر کے عوض" اور نظم "شادی کا جھگڑا" بہت پسند آئی۔ **افشاں غفار، کراچی۔** ٹائیٹل بہت خوبصورت تھا۔ "ماہ رواں کی پہلی بات" اچھا تھا جبکہ فرزانہ روحی کا فیچر "کرنیں بکھیرتے یہ ننھے ننھے ہاتھ" بہت خوبصورت تھا۔ اتنا اچھا فیچر لکھنے پر انہیں بہت بہت مبارک باد۔ قسط وار کہانی کا اختتام پڑھ کر بہت مزا آیا۔ **تہمینہ حنیف، شیخوپورہ** اپریل کا خصوصی شمارہ بہت پسند آیا کہانیاں اور نظمیں بہت اچھی تھیں۔ **جواد علی، کراچی۔** خصوصی شمارہ پڑھا دل باغ باغ ہوگیا۔ کہانیاں، نظمیں لطائف پسند آئے۔ اب آپ کہانی نمبر نکالیں ○ --- کہانی نمبر ہم شائع کر چکے ہیں۔ **سید تصدق حسین زیدی، عابد علی، گڈو بیراج۔** اپریل کے آنکھ مچولی میں محمد رافع کی کہانی "عینک والا جن" بہت اچھی لگی۔ **عاصم خان، کراچی۔** سرورق حسب روایت شاندار تھا۔ محنت کش بچوں کے حوالے سے شامل تحریریں متاثر کن تھیں۔ **محمد سلیم بخش، کراچی** "موتیوں کے گجرے" "وزیر اعظم کا شکریہ" "سوئیٹر کے عوض" "عینک والا جن" "سوتا جاگتا ابوالحسن" اور "وہ کیا راز تھا" کی آخری قسط بے حد پسند آئی۔ **حفیظ اللہ طارق، کمالیہ** "ماہ رواں کی پہلی بات" "آمنے سامنے" اور لطائف پسند آئے۔ **طاہر ناز انصاری، دینہ شہر۔** محنت کش بچوں کے حوالے سے تمام تحریریں قابل تعریف تھیں۔ اتنا شاندار اور خصوصی نمبر شائع کرنے پر مبارک باد۔ **شیخ علی رضا، پتوکی۔** شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ "دیا سلائی" اور "سونا کیسے دریافت ہوا" دلچسپ معلوماتی مضامین تھے۔

سب سے بہترین

اپریل کے "قلم دوست" کی سب سے بہترین کہانی سعدیہ یاسمین کی "اپنی دنیا آپ پیدا کر" اور سب سے بہترین نظم شمع انعام کی "دو دوست" رہی۔ ہمیں سینکڑوں ساتھیوں کی آرا موصول ہوئیں۔ شکریہ۔

اس مقابلے میں بذریعہ قرعہ اندازی قارئین میں سے انعام حاصل کیا ہے محمد زاہد سلیم آرائیں کراچی نے۔ انعام حاصل کرنے پر انہیں آنکھ مچولی کی جانب سے دلی مبارکباد۔

بلا عنوان کا نتیجہ

ماہ فروری میں شائع ہونے والی بلا عنوان کہانی کے سلسلے میں ہمیں سینکڑوں ساتھیوں نے دلچسپ عنوانات ارسال کئے تین ساتھی جو انعام کے حقدار قرار پائے درج ذیل ہیں:۔

۱۔ تسنیم اسلم، لاہور (گیم اوور)
۲۔ محمد نوید، کراچی (ایڈیٹر کے رشتے دار)
۳۔ عدیل ستار، کراچی (بھانجے میاں کی کہانی)

انعام یافتہ ساتھیوں کو آنکھ مچولی کی جانب سے بہت بہت مبارک باد!

چڑ جلیبی

فاروق حسن چانڈیو

حامد بہت ہی شریر تھا۔ کلاس میں استاد محترم نہیں ہوتے تو "عجیب و غریب حرکتیں کر کے ہنسی کا سامان فراہم کرتا اور سب ہم جماعتوں کو اپنی ' اپنی بتیسیوں کی نمائش کا سنہری موقع فراہم کرتا۔ ہمارے دوست کی دوسری خوبی یہ تھی کہ اچانک استاد کے آجانے پر فوراً" مسکین سی شکل بنا کر اس شور شرابے کی ذمہ داری فوراً" اپنے سر لے لیتا۔ اس کا اعتراف سن کر اور معصوم شکل دیکھ کر استاد صاحب زیادہ تر تو اسے معاف ہی کردیتے البتہ اسے ڈانٹ کا مکسچر ضرور پینا پڑتا۔

ایک روز حامد شرارتیں کررہا تھا کہ سر آگئے اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ سر نے اس کے کان پکڑے اور اتنی زور سے کھینچے کہ ایک لمحے کو سب یہی سمجھے کہ شاید سر اسے گدھا بنانا چاہتے ہیں اور اس کا آغاز اس کے کانوں سے کیا ہے اس ڈھیٹ کے کان خیر کیا لمبے ہوتے ' اس کی

شرارتیں جاری رہیں اور ایک روز تنگ آکر استاد صاحب نے کہا : " تم بالکل جلیبی کی طرح ٹیڑھے ہو۔" یہ ایسی بات تھی جو جلد ہی پورے اسکول میں پھیل گئی اور یوں حامد "جلیبی" کے نام سے مشہور ہوگیا۔

شروع میں تو وہ "جلیبی" نام سن کر مسکرانے لگتا مگر کچھ دنوں بعد چڑنے لگا ادھر لڑکوں کو بھی ایک اچھا خاصا تماشا ہاتھ لگ گیا تھا "جلیبی---- جلیبی---!!" وہ اسے چھیڑتے، چڑاتے اور کبھی کبھی تو حامد اتنا چڑ جاتا کہ لڑکوں کو مارنے دوڑ پڑتا---ایک روز وہ اتنا پریشان ہوا کہ سیدھا ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں جا پہنچا اور ان سے لڑکوں کی شکایت کردی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب پہلے تو اس کی شکایت سن کر ہنس پڑے پھر کہا "تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارے ہم جماعت تم کو میٹھی جلیبی کا نام دے رہے ہیں..... ہیڈ ماسٹر کی بات نے تو جلتی پر تیلی کا کام کیا۔کیوں کہ ہم سب قہقہے لگا کر ہنسنے لگے تھے بس پھر تو ہمارے یار کا چہرہ چمگاڈر کی طرح لٹک گیا۔اس کے لٹکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب سنجیدہ ہوگئے اور رعب دار لہجے میں ہم سب کو حکم دیا کہ آئندہ حامد کو جلیبی نہ کہا جائے۔

اس حکم سے ہم سب لڑکے مایوس ہوگئے کہ آئندہ اچھے خاصے تماشے سے محروم ہوگئے۔

آدھی چھٹی میں ہمارے ایک نہایت ہی شریر ہم جماعت نے سب کو مایوس نہ ہونے کی تلقین کرتے ہوئے کہا "مایوسی گناہ ہے اس لئے مایوس ہونے سے بہتر ہے کہ ایسی ترکیب سوچی جائے کہ استاد کے حکم کی خلاف ورزی بھی نہ ہو اور حامد کو جلیبی سے چھیڑا جاسکے۔" پھر اس نے خود ہی ترکیب بھی بتادی کہ آئندہ کچھ جلیبیاں لے کر حامد کی ڈیسک پر یا اس کے بستے میں ڈال دیا کریں گے اس طرح وہ چڑ کر ہمیں ہنسنے کا موقع فراہم کردیا کرے گا۔"

بس جی پھر تو ترکیب پر عمل ہونے لگا۔ہم شریر لڑکے اکثر تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے آدھی چھٹی میں جلیبیاں خریدتے اور حامد کے بستے میں ڈال دیتے کوشش یہی ہوتی کہ جلیبیاں کتابوں سے چپک نہ جائیں تاکہ ہمارے یار کی کتابیں میٹھی نہ ہوجائیں۔

اس ترکیب سے حامد اور زیادہ چڑنے لگا' جلیبیاں بستے میں دیکھ کر آگ بگولہ ہوجاتا۔لڑکوں کو مارنے دوڑتا کہ انہوں نے "خراب چیز" اس کے بستے میں کیوں رکھی؟ وہ خراب چیز اس لئے کہتا کہ اپنی چڑ کا نام لینا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے پوچھنے پر لڑکے بجائے جواب دینے کے قہقہے لگا کر اس کا درجۂ حرارت بلوچستان کے علاقے سبی سے بھی بڑھا دیتے تب غصے سے بے

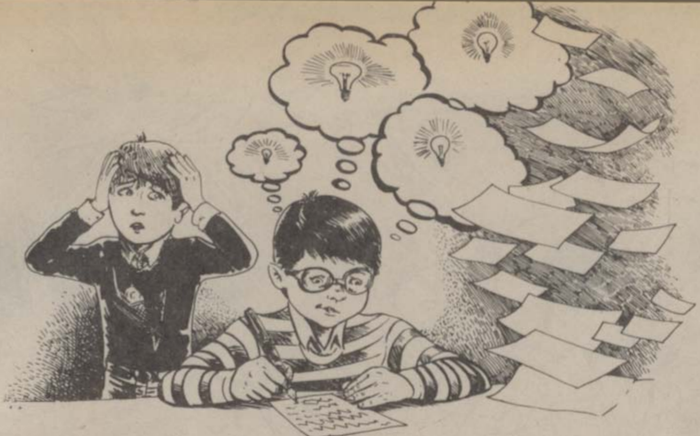

سوال آدھا جواب آدھا

مرتب: محمد بن مالک

اچھے ساتھیو! حسب وعدہ

ہم آپ کے لئے ایک نئی طرز کا کوئز مقابلہ لے کر حاضر ہیں۔ اس مقابلے میں ہر سوال کے دو حصے ہوں گے۔ پہلے حصے میں ہم آپ کو کوئی معلومات فراہم کریں گے، دوسرے حصے میں اس سے متعلقہ (Relative) سوال کا جواب آپ کو دینا ہوگا۔ اس سے آپ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور امید ہے کہ یہ سلسلہ آپ کو پسند آئے گا۔ ایک ضروری بات ذہن نشین کر لیجئے کہ کسی بھی سوال کے دوسرے حصے کا جواب وہ ہرگز نہیں ہوگا، جو پہلے حصے میں ہم آپ کے علم میں لا چکے ہوں گے۔ مقابلے میں شرکت کی شرائط وہی ہیں جو گزشتہ مقابلوں میں تھیں۔ یعنی جوابات الگ صفحے پر خوش خط لکھے ہوئے ہوں۔ اور زیادہ سے زیادہ ہر ماہ کی دس تاریخ تک ہمیں موصول ہو جائیں۔ زیادہ درست جواب موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا۔ تین ساتھیوں کو خوبصورت انعامات دیئے جائیں گے۔

تو پھر تیار ہو جایئے۔ ہمارے نئے کوئز مقابلے کے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لئے۔

مقابلہ نمبر ۱

۱ - "روح اللہ" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب بتا دیجئے؟

۲ - "میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں"۔ یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن العوامؓ کے لئے کہے تھے۔ بتایئے یہی الفاظ آپؐ نے اور کس صحابیؓ کے لئے ادا کئے؟

۳ - "نجم الدولہ" اور "دبیر الملک" مرزا غالب کے القابات ہیں، جو انہیں مغل دربار سے عطا ہوئے تھے۔ آپ یہ بتائیں کہ اسی دربار نے کس مشہور شاعر کو "دبیر الدولہ" اور "فصیح الملک" کے القابات سے نوازا تھا؟

۴ - "ابن الوقت" ڈپٹی نذیر احمد کا مشہور ناول ہے۔ "بنت الوقت" کس کا ناول ہے؟

۵ - مادام ماری کیوری وہ واحد خاتون ہیں جنہوں نے دو مرتبہ نوبل انعام (طبیعیات اور کیمیا میں) حاصل کیا۔ آپ اس واحد مرد کا نام بتا دیجئے، جنہوں نے دو ہی مرتبہ یہ اعزاز حاصل کیا؟

۶ - ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے پہلے شہید فوجی نائیک محمد شریف ہیں۔ آپ آخری شہید فوجی کا نام بتا دیجئے؟

۷ - "اپریل فول" سے تو آپ واقف ہی ہیں "اسٹرابیری فول" (Strawberry fool) سے کیا مراد ہے؟

۸ - "ابوالمظفر" آخری مغل تاجدار کی کنیت تھی۔ کیا آپ اس مغل شہنشاہ کا نام بتا سکتے ہیں جس کی کنیت بھی "ابوالمظفر" ہی تھی؟

۹ - ٹیسٹ کرکٹ کی ایک اننگ میں زیادہ سے زیادہ اسکور کا ریکارڈ انگلینڈ کا ۹۰۳ رنز ہے۔ بتایئے کم سے کم اسکور کس ٹیم کا ہے اور کتنا ہے؟

۱۰ - "شرلاک ہومز" مشہور جاسوسی ..... ناول نگار سر آرتھر کانن ڈائل کا کردار ہے۔ کیا آپ شہرۂ آفاق ناول نگار اگاتھا کرسٹی کے سراغرساں کردار کا نام بتا سکتے ہیں؟

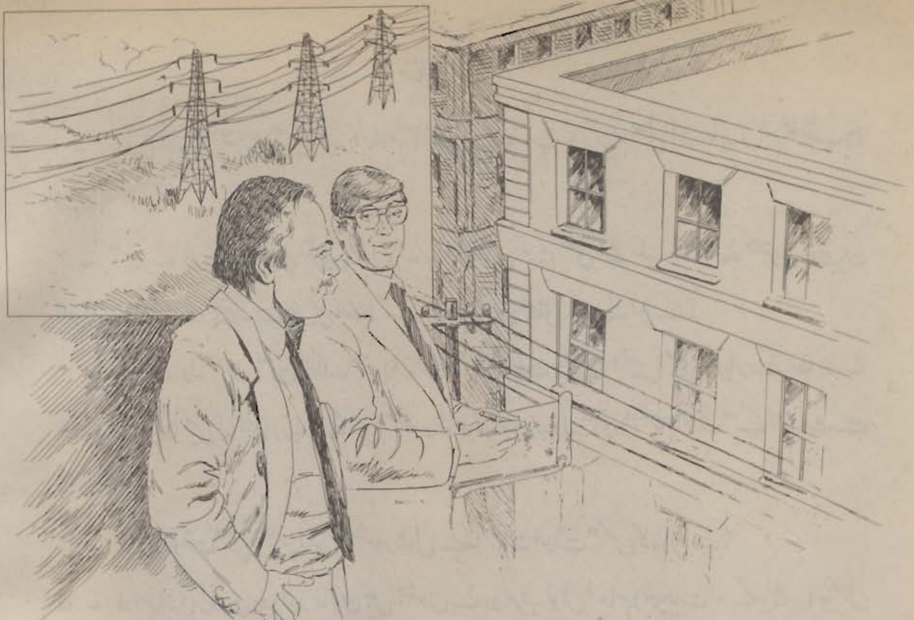

اس میں خطرہ ہے

محمد عادل منہاج

احمد بیگ انگڑائی لے کر اٹھے اور چارپائی سے نیچے اترے۔ نیچے جھک کر چپل پہنی پھر جونہی سیدھے ہوئے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ انہوں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ سر کو دو تین بار جھٹکا پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ چند سیکنڈ اسی طرح بیٹھے رہے پھر کھڑے ہو گئے اور تھکے تھکے انداز میں چلتے ہوئے بالکونی میں آ گئے۔ ان کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا اور وہ اس فلیٹ میں اکیلے رہ رہے تھے کیونکہ ان کی بیوی کا دو سال قبل انتقال ہو چکا تھا اور اکلوتا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے باہر گیا ہوا تھا۔

احمد بیگ نے بالکونی کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ جمائے اور گہری سانسیں لینے لگے۔ اسی وقت بالکونی کے سامنے سے گزرنے والی بجلی کی تاروں پر ایک کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ احمد بیگ نے ناگواری سے کوّے کو دیکھا۔ کوّے نے شاید ان کا منہ بنا ہوا دیکھ لیا اسی لئے وہ کائیں کائیں کرتا ہوا اڑ گیا۔ احمد بیگ چند لمحے وہیں کھڑے رہے پھر واپس

اندر کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑائے "آج نصیر کے پاس جانا ہی ہو گا۔"

○ .... ○ .... ○

ڈاکٹر نصیر نے اندر داخل ہونے والے کو دیکھا، پھر وہ چہک کر بولا، "اوہو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں احمد بیگ صاحب اور ہمارے کلینک میں — زہے نصیب۔"

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر کے پاس لوگ خوشی سے نہیں مجبوراً آتے ہیں۔" احمد بیگ منہ بنا کر بولے۔

"ہائیں ...... تو تم مریض بن کر آئے ہو۔ لاحول ولا قوۃ ...... میں سمجھا تھا کہ دوست کی یاد آ ہی گئی۔"

"مذاق چھوڑو یار ...... میری طبیعت کچھ دنوں سے واقعی عجیب سی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی اچانک سر چکرانے لگتا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ جاتا ہے۔"

"یہ تو زیادہ کام کرنے کا نتیجہ ہے۔ خیر ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" ڈاکٹر نصیر نے کہا اور احمد بیگ کا چیک اپ کرنے لگا۔ پھر وہ پیڈ پر لکھتا ہوا بولا، "فی الحال تو یہ دوائیں استعمال کرو لیکن بہتر ہے کہ تم اپنا مکمل چیک اپ کروالو۔"

"مکمل چیک اپ! مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"کبھی سال دو سال بعد مکمل چیک اپ کروالینا بہتر رہتا ہے۔ اس طرح کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ ہو تو وہ سامنے آ جاتا ہے۔ لہٰذا میرے مشورے پر عمل کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ تم خرچہ کروانے پر تل ہی گئے ہو تو کر لیتے ہیں۔"

"اور کیا۔ تم جیسے موٹے مرغے روز روز تھوڑا ہی پھنستے ہیں۔" ڈاکٹر نصیر مسکرا کر بولا۔

○ .... ○ .... ○

احمد بیگ نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ملانے لگے۔

"ہیلو ...... نصیر یہ تم ہو ...... ہاں میں احمد بیگ بول رہا ہوں۔ میری رپورٹ پڑھ لی تم نے۔" انہوں نے پوچھا۔ وہ چیک اپ کروانے کے بعد ساری رپورٹ دو دن پہلے ڈاکٹر نصیر کو دے آئے تھے۔

"ہاں ...... رپورٹ تو پڑھ لی ہیں۔" ڈاکٹر نصیر کی آواز آئی۔

"چلو ...... تمہاری تسلی تو ہو گئی۔"

"یار احمد! تم ذرا میرے کلینک آ جاؤ۔" ڈاکٹر نصیر نے سنجیدہ لہجے میں کہا

"کیوں ...... خیریت! کیا کوئی مسئلہ ہے؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس تم آ جاؤ ...... اطمینان سے بات کریں گے۔"

احمد بیگ نے حیرانی سے ریسیور کو گھورا اور کریڈل پر رکھ دیا۔ جلد ہی وہ ڈاکٹر نصیر کے کلینک میں موجود تھے۔

قابو ہو کر ہم لڑکوں کو مارنے کے لئے لپکتا اور ایسے وقت سب ہی میراتھن ریس کا مظاہرہ کر کے باہر دوڑ پڑتے۔ بدقسمتی سے کبھی کوئی لڑکا اس کے ایک دو گھونسوں کا شکار ہو جاتا مگر شکار ہونے والا شکاری پر جوابی حملہ اس لئے نہیں کرتا کہ اس طرح بات بڑھ جاتی اور وہ میٹھا تماشا آئندہ کے لئے رک جاتا۔

ایسے تماشے کے بعد ہم کلاس میں تب واپس گھستے جب ریس ختم ہونے کے بعد استاد صاحب کو کلاس کی طرف آتا دیکھتے۔ خوش کن بات یہ تھی کہ ہماری اس حرکت کی حامد نے کبھی استاد سے شکایت نہیں کی۔ ہم کو اس کی اس مہربانی پر خوشی بھی ہوتی تھی اور حیرت بھی کہ وہ جلیبی تماشے پر حد درجہ چڑنے کے باوجود شکایت کیوں نہیں کرتا! ایک دن میں نے وہ راز معلوم کرنے کی غرض سے اکیلے میں بڑا ہمدرد بن کر اس سے پوچھا کہ وہ استاد سے شکایت کیوں نہیں کرتا۔ تب اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "یار ڈرتا ہوں کہ کہیں دوسرا نام چغل خور نہ پڑ جائے......!"

مجھے اس کے اس جواب پر رحم کے بجائے ہنسی آنے لگی مگر ہونٹ بھینچ کر خو...... ...... خو......پر ہی اکتفا کی۔

وقت پر لگائے اڑتا رہا ہمارے سالانہ امتحان بھی ہو گئے۔ رزلٹ تک پڑھائی سے چھٹی ہو گئی تھی۔ ٹک ٹک کرتی گھڑیوں نے وقت کو گزارتے گزارتے دو مہینے لگا دیئے یہاں تک کہ دسویں جماعت کے نتائج کا اعلان ہو گیا اور اخبار نے اطلاع دی کہ ہمارے جلیبی یار نے صوبے بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے ضرور مبارک باد دینے جانا چاہئے۔

میں جب اس کے گھر پہنچا تو اور بھی بہت سے ہم جماعت اسے پاس ہونے کی مبارک باد دینے پہنچے ہوئے تھے۔ اس وقت میں نے سوچا کہ کچھ ہنسی کا دور بھی چلایا جائے۔ لہٰذا مٹھائی کی فرمائش کر دی۔ جسے ہمارے یار نے پورا کرنے کی حامی بھرلی اور مٹھائی خریدنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ تب میں نے مسکرا کر کہا۔ "بھئی مٹھائی ہماری پسند کی ہونی چاہئے۔" میری بات کا مطلب سب لڑکے سمجھ گئے تھے کہ میں جلیبی کہنے والا ہوں اس لئے میری بات پر سب ہی مسکرانے لگے۔ "تم لوگ بیٹھو میں ابھی بازار سے آیا۔" اتنا کہہ کر حامد تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہم لوگ ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پندرہ بیس منٹ بعد حامد بازار سے آگیا اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا لفافہ تھا۔

"بھئی مٹھائی تو ہماری پسند کی ہے ناں؟" لڑکے پوچھنے لگے۔ "ہاں بھئی۔ جج۔ جج ۔۔۔!!!"

"خبردار جو کوئی غلط نام لیا-----! میں تیرا منہ توڑ دوں گا-----!" میرا جملہ درمیان سے اچک کر حامد نے بڑے تیز لہجے میں کہا۔ مگر میں بھی کہاں دبنے والا تھا۔

مسکرا کر کہا۔ "اگر تم ہماری پسند کی مٹھائی نہیں کھلانا چاہتے تو کوئی بات نہیں ہم یونہی چلے جاتے ہیں"

"ایسے نہیں جانے دوں گا آج ہی تو قرضہ اتارنا ہے۔" "قرضہ---کیسا قرضہ؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ اس سے پہلے ہی لڑکوں نے مٹھائی کا لفافہ کھول لیا-----"آہا---جلیبی---ہائے میری پسندیدہ جلیبی-----آج تو جلیبی بھی---!!" لڑکے جلیبیوں پر ٹوٹ پڑے۔ حامد نے بھی ایک بڑی سی جلیبی اٹھا کر کھانا شروع کردی۔ ہم میں سے کچھ لڑکے حیرانگی سے ابھی سنبھلے بھی نہ تھے کہ اس نے جلیبی ختم کرتے ہوئے کہا!! دوستو! تم لوگ اب تک یہی سمجھتے ہو گے میں "جلیبی" کہنے سے چڑتا ہوں---نہیں بلکہ اس چڑ کے بہانے میں تم سے جلیبیاں کھاتا رہا ہوں آج سوچا کہ خوشی کے موقع پر یہ قرض اتار ہی دوں---تم لوگوں کو یاد ہو گا کہ میں غصے میں لڑکوں کو مارنے دوڑتا تھا۔ درحقیقت وہ تو میں لڑکوں کو کلاس سے بھگانے کے لئے کرتا تھا۔ لڑکوں کے بھاگنے کے بعد میں بستے میں رکھی ہوئی ساری جلیبیاں مزے لے لے کر کھا جاتا۔ آج بھی جلیبی ہی میری پسندیدہ مٹھائی ہے۔

"آپ نہیں کھا رہے جلیبی---لیجئے ناں بہت مزے کی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے شیرے میں ڈوبی ہوئی ایک جلیبی میری طرف بڑھائی تو میں شرمندہ ہو کر جلیبی کھانے لگا۔ جلیبی کھاتے کھاتے میں نے دیکھا تمام شریر لڑکوں کے چہرے کھسیانے ہو رہے تھے!!

روشن کرنیں

○ بڑا احمق وہ ہے جو دوسروں کی برائیوں کو برا سمجھے اور خود ان پر قائم رہے۔

○ جو توقع دوسروں سے کرتے ہو پہلے خود اس کی تکمیل کرو۔

○ اگر آدمیت مطلوب ہے تو بنی آدم کا احترام کرو۔

○ زندگی کی سڑک میں ٹریفک یک طرفہ ہوتی ہے۔ آپ آگے جا سکتے ہیں۔ واپس نہیں آ سکتے۔

○ عقلمندوں کو بے وقوفوں کا شکر گزار ہونا چاہئے کیوں کہ ان کی وجہ سے وہ عقلمند کہلاتے ہیں۔

○ ہر مشکل انسان کا امتحان لیتی ہے۔

○ اپنی خواہش ختم کر ڈالو ورنہ تمہارا دل اس میں ڈوب جائے گا۔

مرسلہ: سید محمد عثمان شاہ مہرانی۔ تلہ گنگ

"خیر تو ہے! تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔" احمد بیگ نے پوچھا۔

"یار...... شکر کرو۔ تم نے اپنا چیک اپ کروا لیا۔ یہاں تو بات ہی دوسری ہے۔"

"کیا مطلب! صاف بات کرو۔" احمد بیگ الجھن کے عالم میں بولے۔

"دیکھو پریشان مت ہونا۔ بات اتنی خطرناک بھی نہیں۔ تمہیں...... دراصل...... کینسر......"

"کیا!!" احمد بیگ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کینسر۔" ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"بیٹھ جاؤ احمد۔ میں نے کہا نا خطرے کی بات نہیں۔ کینسر ابھی بالکل ابتدائی اسٹیج پر ہے۔ باقاعدگی سے علاج ہو گا تو بالکل ختم ہو جائے گا، ہاں اگر تم چند ماہ اور میرے پاس نہ آتے تو یہ جڑ پکڑ لیتا اور معاملہ خطرناک ہو جاتا۔ تم شکر کرو کہ بروقت میرے پاس آ گئے۔"

"مم۔ مگر۔ یہ ہوا کیسے......؟ مجھے تو کبھی کوئی خطرناک بیماری نہیں ہوئی پھر یہ اچانک کینسر۔"

"اس کی وجوہ تو ابھی مجھے بھی پتہ نہیں ہیں ۔ مگر وجوہات کو چھوڑو۔ یہ تمہارا درد سر نہیں تم بس آج اور اسی وقت سے علاج شروع کرو بس چند ماہ میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

○ .... ○ .... ○

تین ہفتوں بعد وہ ایک دن پھر ڈاکٹر نصیر کے کلینک میں بیٹھے تھے۔

"کچھ فرق پڑا نصیر یا نہیں۔"

"ہاں...... پڑا تو ہے۔ مگر اتنا نہیں مجھے حیرت ہے کہ باقاعدگی سے علاج کے باوجود اتنا اثر کیوں نہیں ہو رہا۔ تم نے کوئی بے احتیاطی تو نہیں کی؟" ڈاکٹر نصیر نے پوچھا۔

"نہیں بھائی...... تمہاری ہر ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کیا ہے۔" وہ پریشان ہو کر بولے۔

"خیر گھبراؤ مت۔ مرض بہرحال بڑھ نہیں رہا کم ہی ہو رہا ہے اگرچہ اس کی رفتار سست ہے۔ خیر میں اس کی وجہ کا بھی پتہ چلا لوں گا۔ تم یہ چند ٹیسٹ مزید کروا لو۔ میں دوائیں بھی مزید سخت کر دیتا ہوں۔"

○ .... ○ .... ○

دروازے کی گھنٹی بجی۔ احمد بیگ کچن سے نکلے اور بیرونی دروازہ کھولا۔

"ارے نصیر تم!" وہ خوش ہو کر بولے۔

"ہاں یار! میں نے سوچا کہ میں بھی تمہارا یہ فلیٹ دیکھ ہی لوں۔ ویسے پچھلے فلیٹ کی بہ نسبت ذرا چھوٹا لگتا ہے۔" وہ اندر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"ہاں...... مجھ اکیلے کے لئے تو بہت ہے۔ خیر تم بیٹھو۔ میں نے کچن میں چائے کا پانی رکھا ہوا ہے۔ میں دو منٹ میں بنا کر لاتا ہوں۔"

"ضرور...... ضرور...... چائے کی طلب بھی ہو رہی ہے۔" ڈاکٹر نصیر مسکرایا اور احمد بیگ دوبارہ کچن میں گھس گئے۔ ڈاکٹر نصیر ٹہلتا ہوا فلیٹ کا جائزہ

گرمی

ضیغم حمیدی

دیکھو بچو! گرمی آئی   موسم نے پھر لی انگڑائی
تپتی دھوپ سے حال برا ہے   ہر کوئی سایہ ڈھونڈ رہا ہے
جون کا ہے کیا خوب مہینہ   سر سے پاؤں تک ہے پسینہ
آؤ ہم دریا تک جائیں   اچھلیں کودیں، خوب نہائیں
آیا ہے قلفی کا موسم   شربت اور لسی کا موسم
گرمی سے وہ حشر بپا ہے   پنکھے کی بھی گرم ہوا ہے
سارے پھل ٹھیلوں پر ڈالے   بیچ رہے ہیں ٹھیلے والے
جنگل میں کوئل متوالی   کوک رہی ہے ڈالی ڈالی

یہ مزدور کی ہے مجبوری
دھوپ میں کرتا ہے مزدوری

لینے لگا۔ پھر وہ بالکونی میں آیا اور نیچے سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ اسی وقت اس کی نظر بالکونی کے سامنے سے گزرنے والی بجلی کی تاروں پر پڑی۔ اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

"اوہ! میں سمجھ گیا۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا سمجھ گئے اور یہ تم بالکونی میں کیا کر رہے ہو۔ چلو چائے پیو۔" اندر سے احمد بیگ کی آواز آئی۔

"ذرا یہاں آؤ۔" ڈاکٹر نصیر نے اسے آواز دی۔

"ہاں، کیا ہوا؟" احمد بیگ بھی بالکونی میں آگئے۔

"مجھے بالآخر تمہارے کینسر کی وجہ بھی مل گئی اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ دوائیں پوری طرح اثر کیوں نہیں کر رہی تھیں؟"

"اچھا! تت ...... تو کیا وجہ ہے کینسر کی۔" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ دیکھو۔ وجہ یہ رہی۔" ڈاکٹر نصیر نے سامنے اشارہ کیا۔ احمد بیگ نے حیران ہو کر سامنے دیکھا پھر بولے۔ "کیا دیکھوں۔ یہاں تو کچھ نہیں۔"

"بے وقوف! تمہیں یہ بجلی کی تاریں نظر نہیں آرہیں۔" ڈاکٹر نصیر نے کہا۔

"ہاں۔ تو پھر؟"

"یہی تمہارے کینسر کی وجہ ہیں؟" ڈاکٹر نصیر نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب! بھلا بجلی کی تاروں سے کینسر کیسے ہو سکتا ہے؟" احمد بیگ حیران رہ گئے۔

"یہی تو مسئلہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک تو تعلیم کی کمی ہے، دوسرے ہم دوسرے ممالک میں ہونے والی تحقیق کی خبر نہیں رکھتے۔ یہ تو شاید تم جانتے ہو گے کہ جس چیز میں سے بھی بجلی گزر سکتی ہے اسے موصل یا کنڈکٹر (CONDUCTOR) کہتے ہیں۔ اور جب کسی کنڈکٹر سے بجلی گزاری جائے تو اس کے چاروں طرف ایک مقناطیسی میدان (MAGNETIC FIELD) پیدا ہو جاتا ہے۔"

"ہاں غالباً اسے برقی مقناطیسی میدان یا ای ایم ایف (ELECTROMAGNETIC FI-ELDS OR EMF) کہتے ہیں۔" احمد بیگ بولے۔

"شکر ہے تمہیں یہ تو پتہ ہے۔ اس EMF کی شدت کا تعلق تاروں کے وولٹیج سے ہوتا ہے جتنا وولٹیج زیادہ ہو گا اتنا ہی یہ مقناطیسی میدان خطرناک ہو گا اور اگر وولٹیج ہزاروں میں پہنچ جائے تو تاروں کے گرد نظر نہ آنے والا یہ میدان اتنا شدید ہوتا ہے کہ تاروں کے قریب جانے سے موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔"

"اوہ ......!" احمد بیگ کے منہ سے نکلا۔

"کم وولٹیج پر اگرچہ یہ میدان اتنا خطرناک

آج اور کل

آج کل عموماً لوگ بچوں کو یوں ڈراتے ہیں وہ آیا جن بابا، مگر کل یقیناً یوں ڈرایا کریں گے...... "وہ آیا بجلی کا بل، وہ آیا گیس کا بل، وہ آیا ٹیلی فون کا بل۔

مرسلہ: ش۔ م۔ شہزاد کراچی

نہیں ہوتا مگر سائنس دانوں نے اب جو تحقیقات کی ہیں ان کی نتائج نے ظاہر کیا ہے کہ یہ میدان صحت کے لئے خطرناک ہے اور اس سے کینسر بھی ہو سکتا ہے۔"

"اوہ۔ مگر اس طرح کی تاریں تو نجانے کتنے فلیٹوں اور مکانوں کے انتہائی قریب سے گزر رہی ہیں تو کیا ان سب کی زندگی کو خطرہ نہیں۔" احمد بیگ نے پوچھا۔

"یقیناً خطرہ ہے۔ جن لوگوں پر سائنس دانوں نے تجربات کئے ان کے مطابق کچھ پر مقناطیسی میدان کا اثر ہوا اور کچھ پر نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو چیز چند لوگوں پر اثر کرے اسے بے ضرر سمجھا جائے۔ ہر ایسی خطرناک چیز سے دور رہنا چاہئے۔"

"مگر لوگوں کو تو اس خطرے کا پتہ بھی نہیں۔" احمد بیگ بولے۔

"اگر پتہ چل بھی جائے تو کیا ہوگا؟ لوگوں کو پتہ ہے کہ سگریٹ پینا مضر صحت ہے مگر کوئی سگریٹ پینا نہیں چھوڑتا۔ سب جانتے ہیں کہ آلودگی صرف ہماری صحت کے لئے ہی نہیں بلکہ ہماری زمین کے لئے بھی خطرناک ہے مگر ہم کوئی پروا نہیں کرتے۔ اب اگر یہ بات بھی سب کو پتہ چل جائے کہ بجلی کی تاروں کے گرد پیدا ہونے والا مقناطیسی میدان صحت کے لئے خطرہ ہے تو ہم اسے بھی نظر انداز کر دیں گے یہ ہمارا قومی رویہ بن چکا ہے۔" ڈاکٹر نصیر نے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا مگر پھر بھی ہمیں لوگوں کو INFORM کرتے رہنا چاہئے۔ کچھ لوگوں پر تو اثر ہو گا نا۔ سبھی تو بے حس نہیں ہوتے۔" احمد بیگ بولے۔

"ہاں...... خیر چلو تمہاری چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

"ہاں...... میں دوبارہ گرم کرتا ہوں۔"

"رہنے دو یار۔ بس اب تم فوراً یہ فلیٹ بدل ڈالو۔ اور جب تک مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتے۔ بجلی کی چیزوں سے ذرا دور رہو۔ اب چونکہ اصل وجہ کا علم ہو گیا ہے۔ اس لئے انشاء اللہ تم جلد ہی صحت یاب ہو جاؤ گے۔"

"ہاں...... میں تو ٹھیک ہو ہی جاؤں گا مگر میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے سروں پر ماحولیاتی آلودگی اور مقناطیسی میدان کی صورت میں جو خطرات منڈلا رہے ہیں۔ ہمیں ان کا احساس کب ہو گا۔ آخر ہم سنجیدہ رویہ کب اپنائیں گے!"

ڈاکٹر نصیر کندھے اچکا کر رہ گیا وہ بھلا اس سوال کا کیا جواب دیتا۔

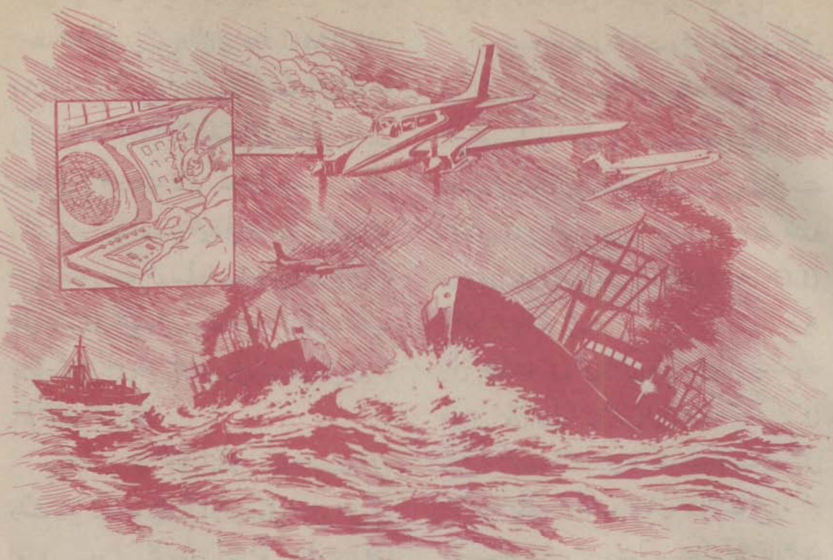

بے رحم ٹرائی اینگل

عبدالوارث

برموداٹرائی اینگل پر اس سے قبل دو مضامین آنکھ مچولی میں شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ اتنا دلچسپ موضوع ہے کہ اس پر ایک نہیں کئی اور مضامین کی گنجائش نکلتی ہے۔

"یہ وہ سمندر تو ہر گز نہیں جس پر ہم پرواز کر رہے تھے۔"

"ہمارا بچنا اب مشکل ہے یہاں کسی تیز خنجر کی مانند خطرہ ہے۔"

"کسی نا قابل فہم قوت نے ہمارے کمپاس ناکارہ کر دیئے ہیں۔"

یہ وہ آخری جملے ہیں جو پیغامات کی صورت میں مختلف طیاروں اور پانی کے جہازوں کی جانب سے اپنے ٹاورز اور اسٹیشنوں کو دیئے گئے۔ اور یہ طیارے اور جہاز برموداٹرائی اینگل نامی جزائر کے علاقے میں جاکر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تحلیل ہوگئے۔

برموداٹرائی اینگل کیا ہے؟ امریکہ کی جنوب

مشرقی ریاست فلوریڈا کے قریب شمال مشرق کی سمت بحر اوقیانوس میں واقع برمودا (BERMU-DA) نامی جزائر ہیں اور ان جزائر کے پاس مثلث (TRIANGLE) نما ایک بحری علاقہ برسوں سے اپنی پر اسراریت قائم کئے ہوا ہے۔ یہ بد نام زمانہ علاقہ اپنے اندر یہ شیطانی صفات رکھتا ہے کہ اس کے اوپر سے گزرنے والے ہوائی جہاز یا تیرتے پانی کے جہاز ٹھیک اس کے اوپر آکر یکایک غائب ہوجاتے ہیں اس طرح کہ سمندر کی تہہ میں بھی ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔

یہ علاقہ برمودا ٹرائی اینگل کے نام سے اس وقت دنیا کے سامنے آیا جب پہلی مرتبہ اس کی فضائی حدود میں محو پرواز پانچ جنگی ہوائی جہاز فضا میں اس طرح تحلیل ہوگئے جیسے واقعی انہیں آسمان نگل گیا ہو۔ گمشدگی سے قبل ایک جہاز کی جانب سے آخری پیغام میں یہ جملہ واضح اور چونکا دینے والا تھا کہ "ہم کسی دودھیا مائل جگہ میں داخل ہورہے ہیں۔" اور پھر ان الفاظ کے ساتھ ہی کنٹرول روم سے طیارے کا رابطہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگیا۔ اس واقعے کی تشہیر کے وقت ایک اخبار نے اس علاقے کو مثلث (TRIANGLE) قرار دیا۔ اور اس طرح آج تک اسے برمودا ٹرائی اینگل کے نام ہی سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں تیس (۳۰) برسوں سے اب تک تقریباً (۲) دو سو سے زائد بحری اور ہوائی جہاز اور ہزاروں بے گناہ افراد کوئی نام و نشان چھوڑے بغیر کسی پر اسرار طاقت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔

ماہرین طبیعات، بحریات و موسمیات کی تحقیق اور گمشدہ جہازوں کے آخری پیغامات کی روشنی میں اس علاقے کی فضائی یا سمندری حدود میں داخل ہوتے ہی جہازوں کے کمپاس کی سوئیاں تیزی سے گردش میں آجاتی ہیں۔ جائروز یا سمت کنندہ (GYROS) اور لوکیٹرز (LOCATORS) ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ ریڈیائی پیغامات میں بھی خلل واقع ہوجاتا ہے۔ کچھ ماہرین جہازوں کی اس طرح کی پر اسرار گمشدگی کو کسی مافوق الفطرت یا غیر مرئی طاقت کے بجائے غیر یقینی موسم یا اچانک خوفناک طوفان گردانتے ہیں۔ مگر دلچسپ اور حیران کن بات تو یہ ہے کہ تمام حادثات اس وقت رونما ہوئے جب سمندر بالکل پر سکون اور مطلع صاف تھا۔ اور کسی بھی طوفانی جھکڑ چلنے کا اندیشہ نہ تھا۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ جہازوں اور طیاروں کے حادثات میں سمندری طوفان یا خراب موسم کار فرما ہے۔ تو پھر ان حادثات کے بعد جہازوں کے باقیات کہاں گئے؟ کیونکہ حادثہ چاہے کتنا ہی خوفناک کیوں نہ ہوا ہو کچھ نہ کچھ خفیف سے آثار ضرور ملتے ہیں۔ مگر انتہائی عمیق تفتیش اور وسیع امدادی آپریشن کے باوجود گمشدہ پانی کے جہازوں اور طیاروں میں سوار نہ تو کبھی کسی شخص کی لاش ملی نہ جہازوں کے ٹکڑے اور نہ ہی جہازوں کے تیل کے آثار نظر آئے، یہاں تک کہ

کبھی خونخوار شارک مچھلیاں بھی نظر نہ آئیں جو عموماً ایسے حادثات کے بعد جوق در جوق اس علاقے کی جانب جھپٹ پڑتی ہیں۔

یہاں کچھ ماہرین اپنا دفاع کرتے ہوئے جہازوں کے باقیات کی غیر حاضری کا ذمہ دار "خلیجی دھارے (GULF STREAM)کو مانتے ہیں۔ جو فلوریڈا اور بہاماز (بحر اوقیانوس میں ایک جزیرہ) کے شمال کی طرف ۵ء۱ سے ۴ ناٹ کی رفتار سے بہتے ہیں اور جہازوں اور طیاروں کے ٹکڑے یا انسانی لاشوں کو دور شمال کی جانب بہا کر لے جاتے ہیں۔ مگر خلیجی دھارے کی رفتار اور راستہ کوئی پر اسرار تو نہیں ہے جو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے۔

ان نظریات و تجربات کے علاوہ کچھ سائنسی نظریئے بھی اس سلسلے میں مرتب کئے گئے۔ جس کے تحت "اس علاقے کی زمین میں مقناطیسی کشش کسی وجہ سے اس قدر طاقت اختیار کر گئی کہ اس کی حد میں داخل ہونے والی اشیا واپس باہر نہ آسکتی ہوں۔" یہاں کچھ موسمی سیارے اس نظریئے کو تھوڑا سا سہارا بھی دیتے ہیں۔ کیونکہ ایک ماہر طبیعات کے مطابق انکے موسمی سیارے جو تقریباً آٹھ سو میل کی بلندی سے موسمی تصاویر ارسال کرتے ہیں۔ جب وہ برمودا کی فضاؤں میں آتے ہیں تو انکے آلات یک لخت ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اور علاقے میں موجود مقناطیسی کشش تصاویر کے رول صاف کر دیتی ہے۔ مگر یہاں ایک نکتہ اس نظریئے کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ایک انتہائی طاقتور مقناطیسی علاقہ (MAGNETIC FIELD)جو آٹھ سو میل کی بلندی پر واقع موسمی سیارے کے کیمروں کی ٹیپ صاف کر سکتا ہے تو وہ کسی سیارے کے مدار میں کسی قسم کی دخل اندازی کرنے سے کیوں قاصر ہے؟ کیونکہ اتنی طاقتور مقناطیسی طاقت کسی بھی سیارے کے مدار میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی ہے۔ بلکہ اسقدر طاقتور حلقۂ عمل تو سیارے کو اسکے مدار پر الٹا بھی گھما سکتا

اچھی باتیں

○ انسان کی ہر خواہش کا پورا ہونا ناممکن ہے کیونکہ ایک ہی پھول کی کچھ پتیاں بکھر جاتی ہیں۔
○ عمل وہ ہے جس کی بنیاد علم پر ہے۔
○ زندگی موت کی امانت ہے۔
○ آدمی کی ذات پر جہالت سے بڑا دھبہ اور کوئی نہیں
○ عبادت روح کی غذا ہے۔
○ کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کرتا جب تک انسان خود کچھ نہ کرے۔
○ دنیا میں حرص نہ کرو۔ تاکہ آزادانہ زندگی بسر کر سکو۔
○ علم کی کمی خلوص سے پوری ہوتی ہے۔

مرسلہ: محمد ضیاء السلام۔ بہاولنگر۔

ہے۔ مگر پھر بھی ایسا نہیں ہو رہا۔
ایک اور بات جو اس علاقے کی پر سراریت میں اضافے کی ذمہ دار ہے وہ اس علاقے میں نظر نہ آنے والے پر سرار اور ویران جہاز ہیں جن پر کسی آدم زاد کا دور دور تک وجود نہیں ہوتا۔ برطانوی جہاز اور اسکے عرشے پر موجود تمام لوگوں نے ایک ایسا پانی کا جہاز دیکھا جو بظاہر تو نیا تھا مگر ملاحوں یا مسافروں کی شکل میں اسمیں ایک بھی متنفس موجود نہ تھا۔ یہاں پر یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ ''عین ممکن ہے کہ اسطرح کے ویران جہاز اپنی منزل کھو کر اس شیطانی علاقے میں آجاتے ہوں اور کسی وجہ سے اسکے تمام مسافر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہوں۔ '' مگر پھر اس واقعے کو علاقے میں متعین چند کوسٹ گارڈ نے دیکھا کہ ''ایک ویران جہاز سمندر کی سطح پر تیر رہا ہے جو دیکھنے میں تو نیا معلوم دیتا ہے مگر اس پر کسی بھی انسان کے وجود کے آثار نظر نہیں آتے۔ '' عملے نے جہاز سے رابطہ قائم کرنا چاہا مگر ناکامی ہوئی۔ چنانچہ جہاز کے معائنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اندر جاکر انھیں سخت حیرت ہوئی کہ سوائے انسانی وجود کے جہاز میں ہر چیز موجود ہے۔ حد یہ کہ میزوں پر کھانا بھی سجا رکھا ہے اور کمروں کی لائٹیں بھی روشن ہیں۔ پچھلے واقعات کو دیکھتے ہوئے جہاز کو دھماکے سے اڑانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر اچانک اتنا تیز اور گرد آلود طوفان آیا کہ طوفان کی دبیز تہہ چھٹی تو نامعلوم اور پر سرار جہاز وہاں سے غائب تھا۔ اپنے تمام تر حصوں کے ساتھ نام و نشان مٹا کر۔

حالانکہ ۱۹۷۰ء تک اس شیطانی مثلث کے بارے میں دنیا کی معلومات زیادہ نہ تھیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس سے بیشتر بھی اس علاقے کی پر سراریت سے واقف تھے جن میں نمایاں طور پر وہ لوگ تھے جنکا تعلق برمودا میں شمالی فلوریڈا کے مشرقی و مغربی علاقوں سے تھا۔ مگر ان لوگوں میں سے کچھ نے اپنے تجربات کے بارے میں چپ سادھ لی تھی۔ شاید انھیں ڈر تھا کہ لوگ ان کی مافوق العقل باتوں کو سنکران کا مذاق اڑائیں گے انھیں دیوانے سمجھیں گے یا پھر ان باتوں کا تذکرہ انھیں کسی عذاب یا نحوست میں گرفتار کرا دے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پر سرار علاقے سے مشہور و معروف سیاح کرسٹو فر کولمبس بھی واقف تھا۔ اسی سے متعلق وہ اپنی ایک رپورٹ میں لکھتا ہے کہ ''سمندر بالکل پر سکون اور رواں دواں تھا۔ دور دور تک کسی طوفان کے آثار تک نہ تھے کہ اچانک میرے پانی کے جہازوں میں سے تین جہازوں کو کسی غیر مرئی قوت نے تین چار مرتبہ اٹھا اٹھا کر اور گھما گھما کر پٹخا اور آخر وہ میری نظروں کے سامنے تہہ میں بیٹھتے چلے گئے''۔ بلا شبہ کولمبس اپنی جہاز رانی کی اعلیٰ ترین صفات کی بدولت اس غیر مرئی طوفان کا شکار ہونے سے محفوظ رہا اور اپنا جہاز بچا کر لے گیا۔
ان تمام واقعات کی رونمائی کے باوجود چند ملک اور ماہرین خود کو ضعیف الاعتقادی کے الزام سے

بچانے کے لئے اس علاقے کے وجود ہی سے منکر ہیں۔ ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس خاص علاقے میں جسے اب برمودا ٹرائی اینگل کہا جاتا ہے ذاتی طور پر کبھی نہیں گئے اور نہ ہی انہوں نے جائے وقوع کی تفتیش کی زحمت گوارہ کی بلکہ جان بوجھ کر اس علاقے سے ہی دور رہے۔ ان کے نظریات کے تحت "برمودا مثلث کی پر اسراریت ایک سنسنی خیز داستان ہے جو محض عوام کی بھرپور توجہ حاصل کرنے کے لئے گھڑی لی گئی ہے۔" یا یہ کہ "اگر مقناطیسی کشش کا کوئی علاقہ ہے بھی تو وہ کم از کم اتنا طاقت ور ہرگز نہیں ہو سکتا جو کسی خوفناک حادثے کا سبب بن سکے یا ممکن ہے کہ گمشدہ طیارے اور جہاز کسی سمندری طوفان کی نظر ہو گئے ہوں۔ عملے اور مسافروں میں بغاوت ہو گئی ہو یا سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اغوا کر کے رنگ و روغن کے ذریعے نیا کر کے نیا نام دے دیا گیا ہو ...... وغیرہ وغیرہ۔

گو کہ مندرجہ بالا تنقید ناقابل فہم نہیں مگر ان چند ماہرین کے مسلسل جھٹلانے کے باوجود ابھی بھی اوسطاً ہر دو ہفتے بعد ایک طیارے اور ہر ہفتے ایک یاچ (YATCH) یا پانی کا جہاز غائب ہو رہا ہے اور اب تو ان لوگوں کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ جو اس علاقے میں ہونے والے حادثوں کے عینی شاہد ہیں۔ ان لوگوں میں سے کچھ کے تحت انہوں نے بعض اوقات یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ کوئی بحری یا ہوائی جہاز ایک روشن بادل میں داخل ہوا اور پھر کبھی باہر نہ آیا۔ کچھ کے مطابق ایک ہوائی جہاز سمندر میں گرتا نظر آیا بالکل ایسے جیسے سمندر نے اسے منہ کھول کر نگل لیا ہو۔ یا انہوں نے ایک بادل کو ایک طیارے کے تعاقب میں جاتے دیکھا وغیرہ وغیرہ۔

برمودا ٹرائی اینگل کی فضائی یا سمندر حدود میں آتے ہی کمپاس کی سوئیوں کا بے قابو ہو کر گردش کرنا، ریڈیائی پیغامات میں خلل، جائروز کی ناکارگی، رڈار اور سونر (زیر آب چیزوں کا پتہ لگانے والے آلے) کا بلیک آؤٹ اور دیگر آلات کا ساکت اور جام ہو جانا، برقی توانائی کی معدومی اور موٹروں کا فیل ہو جانا۔ یہ تمام افعال صرف اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ واقعی اس آدم خور مثلث میں کوئی نہ کوئی طاقت ضرور موجود ہے جس کے زیر اثر آ کر تمام آلات مردہ ہو جاتے ہیں۔ کیا کسی طوفان کے سبب؟ یا کسی مقناطیسی کشش کے باعث جس سے تصادم کی بدولت طیارے اور جہاز منتشر ہو کر "باہر" کسی اور جہت (DIMENTION) میں روانہ ہو جاتے ہوں۔

اس راز سے نقاب کشائی کے لئے دنیا بھر کے ذہین لوگ دماغ کے ہارمونز جلا رہے ہیں مگر اس جہنم زار کا خونخوار اور بے رحم دھانہ طیاروں، جہازوں اور نفوس کو نگلنے کے لئے ابھی تک کھلا ہے۔ جس میں جانے کے تو کئی راستے ہیں مگر!! واپسی کا شاید ابھی تک کوئی راستہ نہیں!!

رکھنا یاد نصیحت میری

محمد انوار احمد

مُلّا نصر الدّین کا قصہ پیارا سا ہے ایک لطیفہ
بڑی ہوئی جب ان کی بیٹی مُلّا نے کی اس کی شادی
آیا اس کا وقتِ رخصت سوچا اس کو کروں نصیحت
تب بیٹی کے پاس وہ پہنچے جا کر اس کے کان میں بولے
بیٹی اپنے گھر کو جاؤ سُکھ دیکھو اور خوشیاں پاؤ
تم کو اپنے گھر میں جا کر سینا پرونا ہو گا اکثر
رکھو اپنے پاس ہمیشہ ایک سوئی اور اچّھا دھاگہ
جب بھی تم کچھ سینا چاہو اپنی سوئی میں دھاگہ ڈالو
سن لو غور سے پیاری بیٹی رکھنا یاد نصیحت میری
دیکھو جب تم سینا چاہو اور سوئی میں دھاگہ ڈالو
ایک سرے پر گرہ لگانا
بیٹی ہر گز بھول نہ جانا

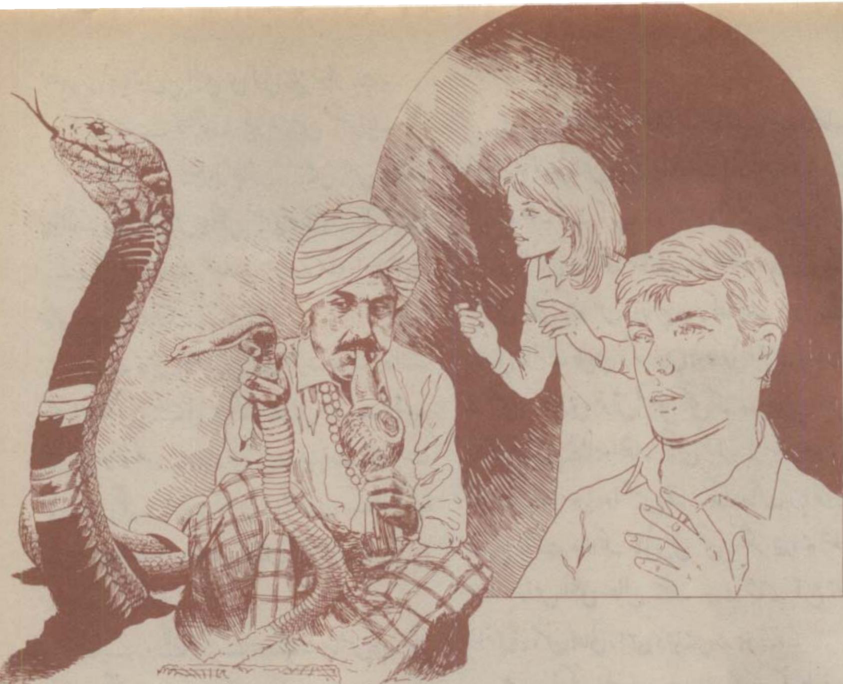

ایک دفعہ کا ذکر ہے

نعیم مشتاق نومی

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔

میں اور میری بہن شازی اپنے کمرے میں اسٹڈی کر رہے تھے کہ اچانک ہی میری نگاہیں جب اس کے چہرے پڑیں تو میں بری طرح چونک اٹھا۔

کیونکہ اس وقت وہاں پورے بارہ بج رہے تھے۔ اور بارہ کب بجتے ہیں؟ اس سے آپ سب بخوبی واقف ہونگے۔

”ارے ...... تمہیں کیا ہوا......؟ میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ ” تمہاری گھڑی تو کافی آگے جا رہی ہے۔ ......!“

اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ اور چہرہ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا اس نے کوئی بہت ہی دہشت ناک شے دیکھ لی ہے۔ یا پھر اس کے

تصور پر، خیالوں پر ایسی ہی کوئی چیز سوار ہے۔
اسکے چہرے کا رنگ دیکھ کر میں مسکرایا۔
"بھئی!...... یقین جانو...... میں اس وقت پینٹنگ کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں......!" میں نے مذاق کیا۔ ورنہ تمہاری چہرے نما دوات سے کچھ ضرور لے لیتا............!؟

میرے مذاق کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اب بھی اسی طرح سکتے کی سی کیفیت میں میرے عقب میں دیوار کو گھورے جا رہی تھی۔ یہ بات مجھے بہت عجیب سی لگی۔ میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں جب پلٹ کر دیکھا۔ تو میں بھی شازی کی طرح سن ہو کر رہ گیا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سانس کی رفتار فوراً بڑھ گئی۔ دل کی دھک دھک ۷۲ سے بڑھ کر شاید ۲۰۰ سے اوپر چلی گئی۔ پسینے چھوٹنے لگے۔ حلق میں جیسے کوئی شے پھنس کر رہ گئی۔ آنکھیں جتنی پہلے کھلی تھیں۔ اس سے دوگنا کھل گئیں۔

میں نے تھوک نگلنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ بند تھا۔ کنڈی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ جس کا مطلب تھا۔ باہر سے کسی کا ہماری مدد کے لئے آنا ناممکن تھا۔ آپ کہیں گے باہر سے دروزاہ بھی تو توڑا جا سکتا ہے۔ جی ہاں! بالکل توڑا جا سکتا ہے۔ مگر ایسی صورت میں خطرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا۔ اور یہ رسک لیا نہیں جا سکتا تھا۔ کیوں نہیں کیا جا سکتا تھا؟ یہ بھی سن لیجئے............

وہاں پر ایک عدد خوفناک سانپ موجود تھا۔ کالا سیاہ لمبائی اس کی تقریباً ۸ فٹ اور قطر ۶ انچ کے قریب تھا۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں کہ وہ کیسی بلا تھی؟ میں نے اور شازی نے چونکہ سانپوں کے متعلق کافی کچھ سن اور پڑھ رکھا تھا۔ اس لئے ہماری حالت کا یوں دگرگوں ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ سانپ اس وقت فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ لیکن خطرہ بدستور موجود تھا کیونکہ وہ سویا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ جاگ رہا تھا۔ میری حالت حالانکہ کافی پتلی تھی۔ مگر خدا کا شکر ہو، حواس ابھی بحال تھے۔ ورنہ شائد آج ہم دونوں، بہن بھائی، اس دنیا میں نہ ہوتے۔

میں نے کن اکھیوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے ٹیبل پر لگا بیل کا بٹن دبا دیا۔ اب اس کی آواز ڈرائینگ روم میں سے سنی جا سکتی تھی۔

اس بیل کا مقصد یہ تھا۔ فضلو بابا کو بلایا جائے۔ جو ڈرائینگ روم میں سوتے تھے۔

چند لمحے بعد فضلو باباکی آواز سنائی دی۔ "جی بیٹا............"

وہ شائد جاگے ہوئے تھے۔ اس لئے جلدی آ گئے تھے۔

میں نے جواب دینے کی کوشش کی مگر آواز حلق

سے نکل نہیں پا رہی تھی۔
فضلو بابا نے پھر پوچھا۔ "ہاں بیٹا!............ کیا بات ہے؟ "......... ساتھ ہی انہوں نے دروازے پر ہاتھ سے دباؤ ڈال کر کھولنے کی کوشش بھی کی تھی۔
"سس...... سس ...... سانپ......!!" میرے حلق سے خوفزدہ سی سرگوشی نکلی۔
فضلو بابا کے کان چونکہ کافی پتلے تھے۔ لہٰذا انہوں نے یہ سرگوشی نما آواز بھی سن لی۔
انہوں نے قفل کے سوراخ میں سے اندر جھانکا۔
پھر ان کا بھی وہی حال ہوا۔ جو ہمارا تھا۔ مگر چونکہ وہ باہر تھے۔ لہٰذا خطرے سے بھی محفوظ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فوراً ہی پھریری لے کر مڑے۔
اور بھاگے بھاگے ہمارے ممی ڈیڈی کے پاس پہنچ گئے۔
"غضب ہو گیا صاحب جی!...... غضب ہو گیا......" فضلو بابا چھوٹتے ہی بولے۔
"کیا غضب ہو گیا......؟" ہمارے ممی ڈیڈی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔
"وہ ادھر...... نومی اور شازی کے کمرے میں...... سانپ ہے......!" فضلو بابا نے تھوک نگلا۔ "بہت بڑا سانپ......!"
"اچھا......!" ڈیڈی فوراً بیڈ سے نیچے اتر آئے "آؤ میرے ساتھ۔"

ڈیڈی فضلو بابا کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ممی بھی تھیں۔
قفل والے سوراخ سے جھانکنے کے بعد ڈیڈی بھی خوفزدہ اور پریشان سے ہو گئے۔
"کیا حال ہے نومی شازی کا......؟" ممی پریشانی کے عالم میں گویا ہوئیں۔ "ٹھیک تو ہیں نا وہ............؟"
"نازیہ بیگم!" ڈیڈی بولے "آہستہ بولو!...... اور ...... بلکیوں کرو...... دوسرے کمرے میں چلی جاؤ! شور کرو گی تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔......"
"میں یہیں رہوں گی!...... میرے بچے اندر ہیں......" ممی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"ٹھیک ہے ......! ڈیڈی نے کندھے اچکائے۔ مگر شور نہ کرنا...... ورنہ......" انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔
"ٹھیک ہے ...... میں شور نہیں کروں گی......!" ممی ناک میں آنے والا پانی اور آنسو پلو سے پونچھتے ہوئے مدہم آواز میں بولیں۔ "اے خدایا ...... رحم کر!......" اس کے بعد وہ باہر پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جبکہ ڈیڈی اور فضلو بابا آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟
اچانک ڈیڈی کو مسئلے کا حل سوجھ گیا۔
"فضلو بابا!...... تم سائیں گامے کو جانتے ہو......؟" انہوں نے پوچھا۔
"جی ...... جی صاحب جی!......" فضلو بابا

حدود اربعہ بیان کیا۔ "اس وقت وہ موذی کمرے میں ہے......"

"ارے واہ فضلو بابا!...... واہ!......" سائیں بولے۔

"تو پھر فوراً جاؤ!...... اور اسے ساتھ لے کر آؤ!......" ڈیڈی نے کہا۔

"جی صاحب جی ......!" فضلو بابا نے سر ہلایا۔

"آؤ!...... میں تمہیں گاڑی کی چابی دوں......!" ڈیڈی نے کہا۔ اور فضلو بابا کو ساتھ لے کر کمرے میں چلے گئے۔

فضلو بابا نے چابی لی۔ اور ڈرائیور کو جگایا۔ اور فوراً سائیں گامے کو لینے چلے گئے۔

سائیں گامے ہمارے علاقے کا مشہور سپیرا ہے اور نہ صرف مشہور بلکہ بہت سیانا ہے۔ اس کے پاس تقریباً ہر قسم کا سانپ ہے۔ شائد ہی کوئی سانپ ہو، جو اس نے پکڑا یا دیکھا نہ ہو۔ سائیں گاما اتنا تجربہ کار تھا کہ جیسے ہی منتر پڑھتا یا بین بجاتا سانپ ادھ موا اور مست سا ہو جاتا۔ اور یوں وہ اسے پکڑ کر اپنی پٹاری میں بند کر دیتا۔

ہماری خوش قسمتی کہ سائیں گاما گھر پر ہی مل گیا۔

"ہاں فضلو بابا!...... اتنی رات گئے!!!...... خیریت تو ہے نا......؟" سائیں گامے نے پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے سائیں جی!......" فضلو بابا بولے۔ پھر انہوں نے مختصر الفاظ میں سانپ کا گاما کھل اٹھا۔ "ارے...... یہ تو وہ سانپ ہے...... جو پانچ سال پچھلے میرے پاس سے بھاگ گیا تھا۔"

سائیں گاما کا چہرہ اور خوشی سے چمک اٹھا تھا۔ جیسے اسے زندگی بھر کا سرمایا مل گیا ہو۔

"سائیں جی!...... جلدی چلیں......!!" فضلو بابا بولے۔ "بچوں کی جان خطرے میں ہے ...... کیونکہ بچے اسی کمرے میں ہیں......!"

"بچے اسی کمرے میں ہیں......!!!" سائیں گاما حیرت سے بولا۔

"ہاں سائیں جی......!"

"نکالا کیوں نہیں انہیں......؟"

نکالتے کیسے سائیں جی......!" فضلو بابا بے بسی سے بولے۔ "دروازہ تو اندر سے بند ہے......!"

"کمرے کی کوئی کھڑکی وغیرہ ہے ......؟" سائیں گامے نے پوچھا۔

"نہیں!...... کھڑکی تو ایک بھی نہیں ہے......!" فضلو بابا پریشان ہو گئے۔

"اچھا ٹھیک ہے !...... تم لوگ گاڑی میں بیٹھو!...... میں ابھی آتا ہوں......!" سائیں گامے نے کہا۔ اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ جبکہ فضلو بابا فوراً گاڑی میں آبیٹھے۔

چند لمحوں بعد سائیں گاما ایک تھیلا اٹھائے باہر نکل آیا۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بیٹا طیفا بھی تھا۔

ان کے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ اور سائیں گاما اپنے بیٹے کو سرگوشیوں میں کچھ سمجھانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد سائیں گاما کمرے کے قفل سے اندر کا جائزہ لے رہا تھا۔ خاموشی سے اور غور سے۔ پھر وہ خوشی سے اچھلا۔ "وہی ہے ...... بالکل وہی ہے......" میں نے اور شازی نے اب تک سانپ ہی کی طرف ٹکٹکی لگا رکھی تھی۔

میری گردن لگتا تھا اکڑ چکی ہے۔ (وہ اب بری طرح دکھ رہی تھی) ۔ اور وقت ...... لگتا تھا صدیاں گزر چکی ہیں۔ اور جہاں تک خوف کا تعلق ہے ...... موت کو سامنے دیکھ کر...... اب وہ پہلے سے کم ہو چکا تھا...... اگر اب مجھے فکر تھی تو اپنی بہن شازی کی تھی۔ جس پر لگتا تھا سکتہ ساطاری ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے اگر سانپ ہم پر حملہ کر دیتا تو وہ بے چاری جواب میں کچھ بھی نہ کر پاتی۔

باہر کیا ہو رہا ہے؟ یہ ہم دونوں نہیں جانتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہماری تمام توجہ سانپ پر مرکوز تھی۔ جو اس وقت کا ایک ٹک ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔ شائد ہمارے صبر کا امتحان لے رہا تھا وہ۔

مجھے جتنی دعائیں یاد تھیں۔ وہ سب کی سب میں نہ جانے کتنی بار پڑھ چکا تھا۔

اچانک ہی بین بجنا شروع ہو گئی۔

یہ سائیں گاما تھا۔

وہ کافی دیر بین بجاتا رہا۔ کافی دیر اس لئے کیونکہ ہمیں ہر لمحہ صدیوں پر محیط محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گزری ہو گی۔ جب میں نے طیفے کی سرگوشی سنی۔

اس نے کہا تھا۔ "کیا سانپ مست ہو رہا ہے......؟"

میں نے غور سے سانپ کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں اب واقعی نشہ اور مستی سی لہرانا شروع ہو چکی تھی۔

بین بجتی رہی۔

کچھ دیر بعد پھر طیفے کی سرگوشی سنائی دی۔ "اگر سانپ مست ہو چکا ہے ...... جھوم رہا ہے ...... تو اٹھ کر دروازے کی کنڈی کھول دیں......!"

میں جو سانپ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے جھومتے دیکھا۔ میں نے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔

کم از کم دو منٹ میں، میں نے دو میٹر کا فاصلہ طے کیا۔ جبکہ اگلے تین میٹر طے کرنے میں مجھے صرف ڈیڑھ منٹ لگا تھا۔ بہر حال...... خدا خدا کر کے میں دروازے تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد آدھا منٹ مجھے کنڈی کھولنے میں لگا۔

یہ ست رفتاری میں نے فقط اس لئے اختیار کی تھی۔ تاکہ میری بہن شازی محفوظ رہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے۔ اگر میں تیزی سے حرکت کرتا تو سانپ نشے اور مستی کی کیفیت سے نکل آتا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو نہ جانے کیا ہوتا؟ لہٰذا یہ سب کچھ

مجھے کرنا پڑا۔ اور میرے صبر کی پورے چار منٹ تک، جو مجھے چار صدیوں سے بھی زیادہ محسوس ہوئے، آزمائش ہوتی رہی۔

جیسے ہی دروازہ کھلا۔ سائیں گاما بین بجاتے ہوئے اندر آ گیا۔

جو لوگ باہر کھڑے تھے، میں نے شازی کی طرف اشارہ کر کے ان سے مدہم آواز میں کہا۔

"شازی......!"

مگر میرے پکارنے سے پہلے ہی سائیں گامے کا بیٹا طیفا اندر گیا۔ اور پھرتی سے شازی کو اٹھا کر باہر لے آیا۔

ممی نے روتے ہوئے ہمیں اپنے سینے سے چمٹا لیا اور چومنے اور پیار کرنے لگیں۔ پیار محسوس کرتے ہی شازی کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میں ممی سے صدیوں بعد مل رہا ہوں۔ لہٰذا آنسو تو آنا ہی تھے۔ اور آ رہے تھے۔ ساون بھادوں کی طرح۔ اور میرا خیال ہے۔ یہی حال شازی اور ممی کا بھی تھا۔

اس کے بعد ہم کافی دیر ڈیڈی کے سینے سے بھی لگ کر انہیں محسوس کرتے رہے۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس بلا سے بچ چکے ہیں۔ اس بلا کا کیا ہوا بعد میں؟ یہ بھی سنئے!

کافی دیر بین بجاتے رہنے کے بعد سائیں گامے نے اس خوفناک سانپ کو بے سدھ سا کر دیا۔ پھر منتر پڑھنے کے بعد اسے بوری میں بند کر لیا اور ہمارا شکریہ ادا کرنے کے بعد چلا گیا۔

ڈیڈی نے اسے ہزار روپے کا نوٹ دینے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔

چند دن بعد جب ہم دونوں بہن بھائی اسکول سے واپس آ رہے تھے۔ میری نگاہ اچانک سائیں گامے پر پڑی۔ جو تیز تیز قدم اٹھاتا گاؤں ہی کی طرف جا رہا تھا۔ چونکہ ہم بھی ادھر جا رہے ہیں۔ لہٰذا میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ گاڑی رکی۔ ہم نے اسے گاڑی میں بٹھایا۔ اور دوبارہ چل پڑے۔

"سائیں انکل!......" میں نے کہا۔ "وہ سانپ اب بھی آپ کے پاس ہے......؟"

"ہاں بیٹا!...... ہے......" سائیں گامے نے جواب دیا۔

"کیا کھلاتے ہیں اسے آپ......؟" میں نے دریافت کیا۔

"اسے میں ہر روز پانچ کلو دودھ...... اور گوشت بھی کھلاتا ہوں......!" اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

"اس سے آپ کو کیا فائدہ؟......" شازی بولی۔ "آپ اسے مار کیوں نہیں دیتے......؟"

"توبہ توبہ کرو چھوٹی بی بی!......" وہ ناراض سا ہو کر بولا۔ "ایسی سندر اور نایاب چیزیں تو قسمت والوں کو ملتی ہیں......!"

"وہ آپ کو کچھ نہیں کہتا......؟" شازی نے حیرت سے پوچھا۔

سائیں گاما ہنسا۔ "بھلا مرید بھی پیروں کو کچھ کہہ سکتے ہیں......!" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

اسی طرح کی باتوں میں اس کی منزل آ گئی۔ وہ اتر گیا۔ اور ہم گھر پہنچ گئے۔

دس پندرہ دن بعد ہم کسی کام سے شہر جا رہے تھے۔ ہمارا گزر جب سائیں گاما کے گھر کے قریب سے ہوا۔ تو ہم چونکے۔ وہاں ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ ڈیڈی بھی ساتھ ہی تھے۔ انہوں نے گاڑی رکوائی۔ پھر ایک آدمی کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

"ارے بھئی!...... کیا معاملہ ہے؟......" ڈیڈی نے پوچھا۔ "یہ مجمع کیوں لگا ہوا ہے......؟

"صاحب جی!...... وہ سائیں گامے کو سانپ نے کاٹ لیا ہے......" اس نے بتایا۔ "اور سانپ چونکہ بہت زہریلا تھا...... اس لئے سائیں بے چارہ ...... دوجا سانس نہ لے سکا...... اور مر گیا...... سنا ہے وہ سانپ...... سائیں نے پچھلے دنوں ہی پکڑا تھا ...... بڑی ظالم شے تھی جی وہ...... مگر خدا کا شکر ہے ...... اب وہ بھاگ گیا ہے...... وہ ادھر......" اس نے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ جو وہاں سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ "جنگل کی طرف......!"

"سیانے سچ ہی کہتے ہیں ...." فضلو بابا نے کہا۔

"فضلو بابا اور بچوں کو گھر چھوڑ آؤ......!"

ڈیڈی ڈرائیور سے بولے۔ "میں ذرا یہاں رکتا ہوں!......"

"جی صاحب......!" ڈرائیور نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

ڈیڈی گاڑی سے اتر گئے۔ اور گاڑی یوٹرن لے کر واپس چل پڑی۔

اب آپ ذرا سوچیں۔ اور بتائیں۔ فضلو بابا نے کونسی مثل بولی تھی۔

(جواب صفحہ نمبر ۲۷ پر دیکھیے)

ایک منٹ

آجکل یہ فقرہ ہماری معاشرتی زندگی کا معمول بن چکا ہے۔ ایک منٹ ٹھہریئے، میں ابھی آیا۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک منٹ میں۔

(۱) ایک لاکھ بیس ہزار اخبارات فروخت ہوتے ہیں۔

(۲) دریاؤں سے ۳۵۰۰ ٹن پانی لے لیا جاتا ہے۔

(۳) ۴۶۰۰ نئے جوتے بنتے ہیں۔

(۴) ۱۸ نئی کاریں بنتی ہیں۔

(۵) ۶۰۰۰ شہاب ثاقب آسمان سے گرتے ہیں۔

(۶) ۸۰۰۰ ٹن خوراک انسانوں کے پیٹ میں پہنچ جاتی ہے۔

(۷) معدنی کانوں سے ۳۲۰۰ ٹن کوئلہ نکال لیا جاتا ہے۔

(۸) ۷۰۰ ٹن فولاد تیار ہوتا ہے۔

مرسلہ ...... غلام قادر، ؟

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابلِ اشاعت
تحریروں کا کالم

"فائدہ" "حضرت موسیٰ" محمد زاہد سلیم، کراچی۔ "التجائے کشمیر" فارحہ فضل، کراچی۔ "وفادار کتا" آصف حفیظ، ملتان۔ "ایک کہانی گھسی پٹی" "چٹ پٹی خبریں" "دوپریاں" عون رضا، بہاولپور۔ "دوستی کا جذبہ" نصرت کوثر، اسلام آباد۔ "سچ کا انعام ملتا ہے ضرور" "روبوٹ گھریلو خادم" محمد حیات خان نیاز، راولپنڈی۔ "اپنی شرارت کا خود ہو گئے شکار" سیما عقیل الرحمٰن، حیدر آباد۔ "عمرو عیار اور قرطوس جادوگر" انتظار علی چوہان، کراچی۔ "ٹیپو سلطان" رابعہ زاہد غنی، لاہور۔ "بزدل بنا بہادر" عبدالوہاب عابد، میاں چنوں۔ "صبر کا پھل" قیصر عبدالحمید، کراچی۔ "اندر کا آدمی" منصور داؤد میمن، سکھر۔ "وہ رات" قرۃ العین پاشا، فیصل آباد۔ "صوفیہ رحمان، مردان۔ "اندھیری رات اور کھنڈر" عثمان تنویر، لاہور۔ "بہادر لڑکا" محمد شاکر، کراچی۔ "بلاعنوان" محمد عدنان تاج، اٹک۔ "حمد باری تعالیٰ" "ناکام بابو" منیر احمد فردوس، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "حمد" سید رضا جعفری (؟) "احساس" خرم طارق جگنو، گوجرانوالہ۔ "لڑائی" صدف نعیم بٹ، لاہور۔ "جانور کی کہانی" غلام محمد، وزیر آباد۔ "پیسے کہاں چھپاؤں" عدیل الیاس، پشاور۔ "سونا کون لے گا" رانا طارق جاوید، اوکاڑہ۔ "جادوئی مشین" شاہ ولی خان، پشاور۔ "نعت" عابد پروین (؟)۔ "راجا" عبدالجبار شیخ، لاڑکانہ۔ "شاید کوئی مسیحا آ جائے" عروسہ وحید، گجرات۔ "آخری پتنگ" خرم طارق جگنو، گوجرانوالہ۔ "تقسیم بنگال" محمد عمران بٹ، فیصل آباد۔ "گلستان سعدی سے انتخاب" محمد تابش، کراچی۔ "غرور کا سر نیچا" جویریہ ظفر، کراچی۔ "تین خواہشیں" سیدہ افشاں افتخار، کراچی۔ "وطن کا مجاہد" فاروق حسین خان، کراچی۔ "حمد" ملک عبدالرشید، وزیر آباد۔ "لالچی بادشاہ" ریحان عماد، کراچی۔ "ہم پیارے وطن کے" "خالد بن ولیدؓ" عابد حسین چانڈیو، لاڑکانہ۔ "بادشاہ کون" چنگیز خان، کوئٹہ۔ "عقلمندی" امجد اسلام، ایبٹ آباد۔ "عقلمند حکمران" خوش بخت صوفیہ، ایبٹ آباد۔ "سوئی ہوئی قوم" اشفاق کامران (؟)۔ "علی بابا اور" فوزیہ ودود، کراچی۔ "اسکول کی کتابیں" "چڑیا" "گلاب کا پھول" "تین سہیلیاں" نائلہ ناصرہ، سیالکوٹ۔ "حمد و نعت" سید سخاوت علی جوہر، کراچی۔ "درختوں کے سائے تلے" "مٹی کا آدمی" قمر نواز قیاس، ٹنڈو جان محمد۔

تحریری مباحثہ

لڑکیاں زیادہ بہادر ہوتی ہیں

لڑکیاں بہادر ہوتی ہیں یا لڑکے۔ یہ فیصلہ تو آپ انعام یافتہ مضامین پڑھ کر کر لیں گے۔ ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ اس تحریری مباحثے میں لڑکے اور لڑکیوں دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ملک بھر سے مضامین موصول ہوئے۔ ان میں انعام یافتہ مضامین کا فیصلہ کرنے کیلئے ہم نے آنکھ مچولی کے منجھے ہوئے مضمون نگار، ٹی وی انسائیکلوپیڈیا کے اسکرپٹ رائٹر اور معروف صحافی جناب سہیل احمد صدیقی کو مقابلے کا جج مقرر کیا۔ انہوں نے نہایت توجہ سے سارے مضامین پڑھ کر اوّل، دوئم اور سوئم انعام کا فیصلہ کیا۔ ہم جناب سہیل احمد صدیقی کے شکر گزار ہیں اور ان مضمون نگاروں کے بھی جنہوں نے مضامین ارسال کر کے مقابلے میں شرکت کی۔

پہلا انعام یافتہ مضمون

محمد رافع ، شیخوپورہ

جناب والا یہ موضوع لڑکیوں کے لئے تو کسی حد تک قابلِ فخر ہو گا کہ کہیں تو ان کے نام کے ساتھ بہادری کا لفظ استعمال ہوا، چاہے چار لفظی موضوع میں ہی سہی، لیکن مجھے اندازہ ہے کہ لڑکوں کے لئے تو یہ موضوع دل بستگی کا سامان ہی مہیا کرے گا کہ

"لڑکیاں ـــــ اور بہادر!" جبکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ لفظ "بہادر" بذات خود مذکّر ہے۔ آیئے تجربہ سے یہ بات ابھی ثابت کئے لیتے ہیں۔ آپ ذرا اپنے ذہن میں لفظ "بہادر" لائیں اور پھر جو تصور قائم ہوا اس پہ غور فرمائیں۔ نتیجہ مَیں آپ پر چھوڑے دیتا ہوں۔

اس موقع پہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر غور کر لیا جائے کہ "بہادر" کسے کہا جا سکتا ہے اور بہادر کون ہوتا ہے؟ دیکھا جائے تو اس لفظ کے مفہوم میں بہت گہرائی ہے مثلاً

ا۔ گناہوں سے بچنا بہادری ہے۔

۲۔ اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع کرنے والا بہادر ہے۔
۳۔ مصیبت میں صبر کرنے والا بہادر ہے۔
۴۔ میدانِ جنگ میں اظہارِ شجاعت بہادری کی علامت ہے۔
۵۔ پریشانی، خوف، ڈر کی ضد بہادری ہے۔

ابتدائی تین نکات میں بہادری کی صفت میں تذکیر وتانیث کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بہادری لڑکوں میں بھی پائی جاسکتی ہے اور لڑکیوں میں بھی ــــ اگرچہ اس قسم کی اوریجنل بہادری کا اظہار آجکل کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ درحقیقت یہی وہ بہادری ہے جو ایک مسلم قوم کا خاصہ ہوا کرتی تھی اور ہونا بھی چاہئے۔ تاریخ اسلام کے مطالعے سے اگر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان نہایت جری، دلیر اور شجاع تھے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ننگی تلواریں لئے پھرتے اور جہاں کہیں کوئی کافر نظر آتا اس کو ڈھیر کر ڈالتے۔ بلکہ ان کی بہادری اپنے نفس سے جہاد کرنے، مصیبت میں صبر کرنے اور اپنے ہر عمل میں رضائے الٰہی کو مدنظر رکھنے میں مضمر تھی۔ آج ہمیں معاشرے میں ہر سطح پر ایسے ہی بہادروں کی ضرورت ہے اور یہ ایسا معاملہ ہے کہ اس میں ہمیں تذکیر وتانیث کی بحث کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔

ذرا غور فرمائیے کہ انسانی شخصیت کی کوئی بھی صفت ہمارے سامنے مجسم صورت میں آموجود نہیں ہوتی بلکہ اس صفت کا اظہار انسان کے کردار کے ذریعے ہوا کرتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ بکر عقلمند ہے تو عقلمندی کی صفت کوئی الگ وجود نہیں رکھتی بلکہ اس کا اظہار ہو رہا ہے بکر کے کردار کے ذریعے یاس کے روز مرہ معمولات کے ذریعے۔ بالکل اسی طرح اگر میں کہنے کو تو کہہ دوں کہ "لڑکیاں بہادر ہوتی ہیں" لیکن ان کے کردار اور معمولات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پہ تحفظ پسند ہوتی ہیں، گھر کی چار دیواری میں زندگی بسر کرتی ہیں، باپ بھائی اور شوہر کی صورت میں مردان کی حفاظت اور کفالت کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رب ذوالجلال اور رسول پاکؐ نے ان کی کمزوری اور نزاکت کے پیش نظر نہ صرف ان کو فکر معاش سے آزاد فرمایا بلکہ ان کی تمام تر ذمہ داری مرد کے توانا کندھوں پر ڈال دی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ان کی شخصیت اور کردار کے کسی بھی پہلو سے کہیں بہادری کی صفت کا اظہار ہوتا نظر آرہا ہے؟؟؟ ــــ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ "لڑکیاں بہادر ہوتی تھیں۔"

اب ذرا زاویہ نگاہ تھوڑا سا تبدیل کیجئے۔ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ میدان جنگ میں اظہار شجاعت بہادری ہے تو یہ بہادری صرف مردوں کے حصے میں ہی آئی ہے۔ رسول پاکؐ صحابہ کرامؓ طارق بن زیادؒ، محمد بن قاسمؒ، محمود غزنویؒ، ٹیپو سلطانؒ ــــ الغرض تاریخ اسلام سے ایک طویل فہرست اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہے۔ پھر اپنی مٹی پر جانیں نثار کرنے والے ان شہیدوں کو کون

بھول سکتا ہے جن کی بہادری کا اعتراف نشان حیدر کا اعزاز دے کر کیا گیا۔ اور بھی ہزاروں ہلال جرأت، تمغۂ بصالت، ستارۂ جرأت (گویا جرأتوں کے تمام نشان) مردوں ہی کے سینے پر سجے ہیں۔ بے شک تاریخ کے اوراق میں چند خواتین نے بھی اس شعبے میں اپنے اسمائے گرامی ثبت کئے لیکن ان کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے لہٰذا اصولاً انہیں مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ موضوع کی موافقت میں لڑکوں کو ضرور کچھ اس قسم کے خطابات سے نوازا جائے گا۔

"موسیقی کی تیز دھنوں پہ کمر لچکانے والے یہ لڑکے کیا جانیں بہادری کو؟"

"استاد کی ڈٹ کے پٹائی کھانا اور پھر بھی مسکرائے جانا ان کے نزدیک بہادری ہے۔" والدین کی نافرمانی، اسکول سے بھاگنا، مذاق مذاق میں چوری چکاری کرنا، جلوس میں پولیس کی لاٹھیاں کھانا۔ کیا یہی لڑکوں کی بہادری ہے۔" اس ضمن میں دو باتیں عرض ہیں۔ پہلی یہ کہ اس قسم کی نام نہاد بہادری کے اظہار میں لڑکوں کا اتنا قصور نہیں جتنا بہادری سے متعلق معاشرے میں گردش کرنے والے غلط تصورات کا ہے۔ آپ آج اس اصل بہادری (جس کا میں ابتدا میں تذکرہ کر چکا ہوں) کے تصور کو پروان چڑھائیے پھر دیکھئے کہ کون مار کھانے اور اسکول سے بھاگنے کو بہادری کہے گا۔ جہاں تک موسیقی کے شیدائیوں کا تعلق ہے تو یہ نہ بھولئے کہ ان ہی جوانوں نے ہمیں دل دل پاکستان، تیرا تیرا میرا میرا پاکستان، وطن کہانی، گمنام سپاہی جیسے نغمے دیئے جو وطن سے محبت کے دبے ہوئے جذبوں کو اُبھارتے ہیں اور یہ یقیناً بہادری کا کام ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ لڑکیاں اکثر عقل کو بہادری کا حصہ سمجھ کر اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کوئی فلسفی صاحب ان کی آسانی کے لئے ایک فقرہ بھی لکھ گئے ہیں جسے لڑکیاں ہر ایسے موقع پہ خوب استعمال کرتی ہیں کہ "ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔" اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ "ہر ناکام مرد کے پیچھے ایک سے زیادہ عورتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔" مزید یہ کہ عورتوں کو ناقص العقل کہا جاتا ہے۔ مردوں کو قرآن میں عورتوں پر ایک درجہ فضیلت دی گئی ہے۔ اسلام میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے۔ پھر یہ تاریخی حقیقت بھی تسلیم کہ بہادری تو بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتی ہے اور عقل محو تماشائے لب بام ہی رہ جاتی ہے۔

چلئے مان لیا کہ عقل خدا کی دین ہے جسے چاہے عطا کرے۔ یہ بازار میں بکنے والی جنس نہیں۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ بہادری تو مخصوص ہے مردوں کے ساتھ۔ خدا کی یہ دین صرف مردوں کے حصے میں ہی آئی ہے۔ میری اس بات کی گواہ وہ "مترنم" نسوانی صدائیں ہیں جو ہر گھر میں

چھپکلی، چوہے یا چمگادڑ کے دیدار کے بعد بلند ہوتی ہیں۔ اگر اب بھی آپ مجھ سے متفق نہیں تو TV پر I C I والوں کی کیڑے مار دوا -ZAPP) (IT کا وہ کمرشل ضرور دیکھ لیجئے گا جس میں لال بیگ کو دیکھ کر ایک خاتون پورا زور لگا کر چیختی ہیں۔ کیا ایسی ہی ہوتی ہے بہادری!!!

دوسرا انعام یافتہ مضمون

درخشندہ جبیں، ایبٹ آباد

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر جہاں کچھ لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہو جائیں ضرور گفتگو کرتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ واضح کر دوں کہ جو موضوع ہمیں دیا گیا ہے اس میں بزدلی اور بہادری کو زیر بحث لانا ہے نہ کہ جسمانی طاقت کو عنوان میں لفظ "بہادر" میری بات کی تائید کرتا ہے۔

لڑکیاں جو بن بلایا مہمان ہوتی ہیں جب دنیا میں آتی ہیں تو اسی وقت ان کے وجود اور ان کی اہمیت سے انکار کر دیا جاتا ہے اور ہوش سنبھالتے ہی اپنے ارد گرد کے ماحول میں نظر انداز کئے جانے اور کم حیثیت ہونے کے عذاب میں گزرتی ہیں یہ ماحول اور رویہ ان کی شخصیت اور کردار کو مسخ کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن قارئین! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ پھر بھی لڑکیاں کتنے مضبوط کردار اور قوت ارادی کی مالک ہوتی ہیں۔ اپنی شخصیت کو خود تعمیر کرنا نہ صرف اپنی شخصیت بلکہ خود سے متعلق دوسرے لوگوں کے کردار کو بنانا.. کیا یہ کم بہادری کا کام ہے؟

ہمارے معاشرے میں جو مقام لڑکی کو دیا گیا ہے اور جس قسم کا سلوک لڑکیوں سے کیا جاتا ہے اس کے باوجود لڑکی کا خاموشی سے اس معاشرہ میں رہنا ہی اس کی بہادری کا سب سے بڑا اور قابلِ قدر ثبوت ہے۔

اسکول اور کالج سے گھر تک اور گھر سے اسکول کالج تک وہ ہزاروں قسم کے گھٹیا فقروں اور نگاہوں کا بہادری سے مقابلہ کرتی ہیں۔ اگر وہ بہادر نہ ہوں تو اگلے دن ہی گھر بیٹھ جائیں۔ گھریلو مخالفت اور ماحولیاتی خرابی کے باوجود ان کا تعلیمی ریکارڈ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ہارنے والی نہیں کیونکہ آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ آج دنیا کے ہر میدان میں لڑکیاں لڑکوں سے آگے ہیں۔

ہاں! اگر ہمارے قابل حریف یہ سمجھتے ہیں کہ راستوں میں لڑکیوں کو چھیڑنا، ان پر آوازے کسنا، شیخیاں بھگارنا بہادری ہے تو اس بہادری کا جواب لڑکیاں بہت عمدگی سے دے سکتی ہیں اور دیتی بھی ہیں۔ لیکن زیادہ تر لڑکیاں صرف انہی کے ہم جنسوں یعنی باپ، بھائیوں کی عزت کی وجہ سے خاموش رہتی ہیں۔ اور جب لڑکوں کو جواب مل جائے تو بھیگی بلی بنے دُم دبا کر بھاگ جانے کی فکر کرتے ہیں۔

قارئین! ذرا غور کیجئے ایک کمزور جسم کی مالک

لڑکی ایک مضبوط جسم کی مرد کی عزّت کی محافظ ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ محافظ ڈرپوک نہیں ہو سکتا۔

قارئین کرام! ایک اتنی سی عمر کی لڑکی کا اپنے پیارے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے دور چلے جانا اور ان کے بغیر کہیں زندگی گزارنا، بالکل اجنبی لوگوں میں چلا جانا، اجنبی ماحول میں چلا جانا اور ان کی خواہشات کے مطابق گزارنا زندگی کو، کیا یہ زیادہ بہادری نہیں ہے بہ نسبت اس کے کہ لڑکوں کی طرح ناز نخرے اٹھانا، گھر والوں پر رعب جھاڑنا، ہمیشہ بہتر چیز، بہتر ماحول حاصل کرنا، اپنی اہمیت جتانے کے لئے الٹی سیدھی حرکتیں کرنا۔

اگر لڑکے کی عملی زندگی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۲۵ یا ۲۶ سال کی عمر میں شروع ہوتی ہے تو لڑکی کی عملی زندگی تو ہوش سنبھالتے ہی شروع ہو جاتی ہے اس کے باوجود زیادہ بہادری کا دعویٰ کرنا کچھ زیب نہیں دیتا۔

میرے معزز حریف! زیادہ نہیں صرف ایک سال کے لئے اپنے ماں باپ سے دور بہن بھائیوں سے دور، اپنے گھر، اپنے ماحول، اپنے علاقوں سے، اپنے پیاروں سے دور اپنی خواہشوں اور اپنے آرام کو تج کر کے صرف دوسروں کی خدمت کرنے اور اس کے صلے میں کچھ نہ ملنے کی حالت میں جاکر اجنبی لوگوں میں رہ کر دیکھیں تو شاید نہیں بلکہ یقیناً آپ اندازہ کر سکیں کہ لڑکی کتنی بہادر ہوتی ہے۔ کتنی مضبوط ہوتی ہے۔

معزز قارئین! خدا تعالیٰ نے عورت کو ماں کے درجہ پر فائز کیا ہے۔ اب ایک لڑکی جو ماں ہے وہ بیٹا اور بیٹی دونوں کی پرورش کرتی ہے۔ کیا خدا تعالیٰ ایک بزدل اور ڈرپوک کو مستقبل کے ایک بہادر مرد کی حفاظت، نگہداشت اور تربیت اور سب سے بڑھ کر تخلیق کا فرض اور صلاحیت دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ کم عمر مائیں بھی اپنی اولاد کی خاطر قربانیاں دیتی ہیں اور اپنے سکون، اور زندگی کو ان کے لئے وقف کر دیتی ہیں۔ اولاد اگر مصیبت میں ہو تو اسے مشکل سے نکالنے کے لئے خود کو اذیتوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ اور پھر بھی وہ بہادر نہیں (آپ کے خیال میں) تو جناب عالی یہ کہاں کا انصاف ہے؟

یہی لڑکیاں اپنی عزّت اور اپنے پیاروں کی حفاظت کی خاطر یقینی موت کی وادیوں میں اتر جاتی ہیں اور اس کے متعلق میں کوئی واقعہ نہیں لکھوں گی کیونکہ روزمرہ کے اخبارات اس حقیقت اور لڑکیوں کی بہادری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

لڑکیاں بھی انسان ہیں وہ فرسٹریشن کا شکار ہو سکتی ہیں، نشہ کر سکتی ہیں، ڈاکے ڈال سکتی ہیں، چوریاں کر سکتی ہیں، قتل کر سکتی ہیں، لیکن وہ نہیں کرتیں۔ کیوں اس لئے کہ وہ بزدل ہیں؟

نہیں صدر محترم! کیونکہ اپنے سے کمزور کو زیر کر لینا بہادری نہیں بلکہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور ماحول کو اپنے حق میں ہموار کرنا بہادری ہے۔ یہ بہادری نہیں کہ لڑکوں کی طرح نشہ کر لیا، گھر

میں پریشانی ہے تو باہر گئے اور جھگڑے کر کے آ گئے اور باہر کچھ ہوا تو گھر آ کر ماں، بہنوں پر رعب ڈال لیا۔ یہ تو سراسر بچکانہ اور احمقانہ طرزِ عمل ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت سی لڑکیاں بھی یہ کام (چوری، ڈاکے، قتل) کرتی ہیں لیکن یہ بات بھی ان کی بہادری کے زمرے میں آتی ہیں کیونکہ وہ اپنے سے طاقتور یعنی مردوں کو شکار کرتی ہیں۔

صدر محترم! اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے یہی کہوں گی کہ بعض لڑکوں کی طرح بعض لڑکیاں بھی بزدل ہوتی ہیں۔ لیکن آپ یہ دیکھیں کہ جو کام بھی لڑکے کرتے ہیں وہ لڑکیاں بھی کرتی ہیں لڑکوں کو تو خدا نے صحت مند اور طاقتور جسم عطا کیا ہے وہ یہ کرنے کے اہل ہیں لیکن لڑکیاں کمزور جسم کے باوجود صرف اپنی قوت ارادی اور خطرات سے ٹکرا جانے کی صلاحیت کے بل بوتے پر ان میدانوں میں بھی کود پڑی ہیں جنہیں مرد اپنی میراث سمجھتے تھے۔

کشمیر، بوسنیا، فلسطین، افغانستان اور باقی تمام ممالک میں مجاہدہ لڑکیوں کو دیکھیں۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ یہ کمزور لڑکیاں ایسے کام بھی کر سکتی ہیں؟ لیکن وہ کرتی ہیں۔ اپنے مجاہد بھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ان کے شانہ بشانہ بعض مقامات اور حالات میں بڑھ کر مقابلہ کر رہی ہیں۔

حضرت عائشہؓ، ام سلیمؓ، حضرت خولہؓ، رضیہ سلطانہؒ، فاطمہ جناحؒ، بہادر تھیں تب ہی تو تاریخ نے انہیں یہ مقام دیا ہے۔ بندرانا ئیکے، اندرا گاندھی، مارگریٹ تھیچر، خالدہ ضیاء، بے نظیر بھٹو، حسینہ واجد، تانسو چلر، مسز کمار تنگا، اور ان کے علاوہ بہت سی خواتین حکومت کرتی رہی ہیں اور کر رہی ہیں اور ان ہی کی طرح اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ اگر وہ سب زیادہ بہادر نہیں ہیں تو اتنے بہادروں یعنی مردوں پر حکومت کیسے کر رہی ہیں۔ تعصب سے قطع نظر ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے ہی عوام نے انہیں ان اہم عہدوں پر فائز کیا ہے۔

قارئین کرام! زیادہ بہادری کے سلسلے میں ابھی بھی آپ کو کوئی شک ہے تو اس سوال کا جواب کہ "زیادہ بہادر کون ہے" حاصل کرنے کے لئے معزز دوستو! اپنی ماں، اپنی بہنوں، بیٹیوں اور ارد گرد کی لڑکیوں کی زندگی، ان کی صلاحیتوں اور ان سے کی جانے والی زیادتیوں کے باوجود ان کا صبر دیکھیں ان کی زندگی کی بے رنگی اور بے کیفی دیکھیں اور اس کے باوجود ان کا حوصلہ دیکھیں تو مجھے کامل یقین ہے کہ آپ وسیع القلب اور وسیع النظر ہونے کا ثبوت دیں گے۔

ہم لڑکیاں نہ صرف خود بہادر ہیں بلکہ اپنے بھائیوں کو ڈھارس اور ان کو حوصلہ دینے والی ہیں۔ آپ لوگوں (لڑکوں) کو صرف ہمارے دم سے بہادری ملی ہوئی ہے کیونکہ ایک ماں جو آپ کے اندر سے تمام خوف نکالتی ہے ایک بہن جو آپ کی تسلّی ہے، آپ کو جینا سکھاتی ہے۔ آپ کی تمام بہادری اور کارنامے بھی ان ہی عورتوں کی بہادری

اور کارنامے ہیں۔

تیسرا انعام یافتہ مضمون

عندلیب، حافظ آباد

عزیز دوستو!یہ حقیقت ہے کہ واقعی لڑکیاں لڑکوں سے بہادر ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھتے ہیں کہ بہادری ہوتی کیا ہے؟ بہادر اس کو کہتے ہیں جو برداشت کر سکے، ہر مشکل کا مقابلہ ڈٹ کر ہمت سے کرے۔ اور لڑکیاں جو نازک آبگینوں کی طرح ہوتی ہیں، جسمانی طور پر اگرچہ لڑکوں سے بہت کمزور ہیں لیکن وہ جس ہمت سے، حوصلے سے مشکلات کا سامنا کرتی ہیں، اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں بہادر ہیں۔یہ لڑکے جو خود کو بہادر ظاہر کرتے ہیں، لڑائیاں کرنا، فساد پھیلانا اور ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہونا ان کا کام ہے اور وہ ان ہی گھناؤنی عادات کو اپنی بہادری کہتے ہیں۔لڑکے اپنی بہادری بس ڈرائیوروں کو خوب دکھاتے ہیں۔جب کوئی شخصیت بے حد کمزور ہو جاتی ہے، وہ اپنی انانیت کا کھلے عام مظاہرہ شروع کر دیتی ہے۔ یہی بزدلی لڑکوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔

یہ لڑکے دوسروں پر ظلم کر سکتے ہیں، دوسروں پر قابو پا سکتے ہیں لیکن بہادر نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"پہلوان وہ نہیں جو کسی طاقتور کو پچھاڑے بلکہ وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے (غصہ کو پچھاڑے)"

اس حدیث سے ثابت ہو گیا ہے کہ بہادر کون ہے۔ معصوم لڑکیوں پر جتنے مظالم ڈھائے جاتے ہیں، پیدائش سے لے کر موت تک وہ ظلم کی چکی میں پستی ہیں لیکن خاموشی سے یہ زہر کے گھونٹ پئے جاتی ہیں۔شرم و حیا کو اپنا زیور اور بہادری وشجاعت کو اپنی پہچان بنا کر جیتی ہیں۔

اپنی زندگی میں تمام مسائل کا بہادری سے مقابلہ کرتی ہیں۔گھر میں جو امتیازی سلوک ان کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے وہ اس کا بہادری سے مقابلہ کرتی ہیں۔تعلیمی میدان میں وہ اس تعلیمی نصاب کو برداشت کرتی ہیں جس کا انہیں عملی زندگی میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ مردوں کے لئے اور لڑکوں کے لئے بہتر ہے۔ اس مرد کے معاشرے میں اگرچہ وہ خود کو بہادر ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔اپنے اصول گھڑے ہوئے ہیں لیکن یہ سب خود فریبی ہے۔

عورت کی بہادری یہ ہے کہ وہ گھر کے تمام کاموں کو خندہ پیشانی سے انجام دیتی ہے۔ لڑکی ہی ایک ماں ہے، بہن ہے، بیوی ہے، بیٹی ہے اور تمام حیثیتوں سے وہ مرد پر برتری رکھتی ہے۔

لڑکوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ گھر سے باہر کام کریں اور روزی کمائیں لیکن یہ لڑکے جو خود کو بڑا بہادر کہتے ہیں لڑکیوں کو باہر کی دنیا میں گھسیٹ لائے۔

کیونکہ یہ بہادری تو ایک لیبل ہے۔اندرونی طور پر تو مرد اتنا کمزور ہے کہ اپنی ذمہ داری بھی پوری نہیں کر سکتا اور لڑکیوں سے مدد لیتا ہے کہ وہ معاشی کاموں میں بھی اس کا ہاتھ بٹائے۔ اور پھر جب لڑکیوں پر دوہرے فرائض عائد کئے گئے تو اس نے بہادری سے ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کیا۔

لڑکیاں بہت بہادر ہیں کہ وہ جہاز اڑا سکتی ہیں، جوتوں کی فیکٹریاں بنا سکتی ہیں، خلا میں سفر کر سکتی ہیں، ملک کی حکومت چلا سکتی ہیں، غرض کہ وہ کون سا کام ہے جسے لڑکی نہیں کر سکتی حالانکہ یہ تمام کام مرد کے کرنے کے ہیں۔ کیا کوئی لڑکا لڑکیوں کے کرنے والے کام کر سکتا ہے ؟؟؟ ہرگز نہیں اس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے۔ یہ تو صرف لڑکیوں کے ہی حوصلے ہیں۔ان کا کام سڑکوں پر آوارہ گردی کرنا، راہ گیروں کو تنگ کرنا اور آوازے کسنا لڑکیوں کو راہ چلتے چھیڑنا ہے اور گھٹیا قسم کی حرکات کرنے والے بہادر ہوتے ہیں کیا؟؟؟

لڑکے تو ہر پل اپنی ذمہ داری سے فرار چاہتے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ جو لوگ اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے وہ بزدل ہوتے ہیں اور یہ صفت لڑکوں میں بخوبی ملتی ہے۔ لڑکیاں زیادہ بہادر ہیں کہ ان کے ذمہ جب کبھی جو بھی کام لگایا گیا انہوں نے بہادری سے کام کیا، حضرت عائشہؓ، حضرت ام عمارہؓ، چاند بی بیؒ اور بہت سی عورتوں نے جس بہادری سے کام کیا لڑکے اسے کیسے کر سکتے ہیں۔

ہماری تاریخ عورتوں کی بہادری کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اور حضرت اسماء بنت ابو بکرؓ نے بہادری کی ایسی اعلیٰ مثال پیش کی ایسی بہادری کی مثال آج تک کسی مرد نے نہ تو پیش کی ہے اور نہ ہی کر سکتا ہے۔ اور ایک وہ بھی بہادر لڑکی تھی (حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا) جس کا بیٹا شوہر کی غیر موجودگی میں وفات پا گیا اور جب شوہر واپس آیا تو اس نے پہلے اسے کھانا کھلایا اور بولی کہ اگر تمہارے پاس کسی کی امانت ہو اور وہ واپس مانگے تو تم کیا کرو گے اس نے جواب دیا کہ میں واپس کر دوں گا تو اس نے تحمل سے جواب دیا کہ تمہارا بیٹا اللہ کی امانت تھا اور اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی ہے۔

کیا اتنی بہادری کسی مرد کی دیکھی ہے؟

عورت ہی نے ان کو جو آج بہادر بنے پھرتے ہیں جنم دیا ہے۔ اسی نے مردوں کو بہادری کا درس دیا ہے۔ اگر کسی بھی معاشرے میں آپ لڑکیوں کو کمزور کرتے ہیں تو وہ معاشرہ اپنی جڑوں سے اکھڑ جاتا ہے۔ اور اگر وہاں لڑکیوں کو ان کا حق دے دیا جاتا ہے تو معاشرہ اتنا عظیم ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ہی جنت کا نمونہ پیش کرنے لگتا ہے۔

Habib Bank Limited

تعلیم

قومی ترقی کا ایک اہم ستون!

ملک سے ناخواندگی دُور کر کے فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ بامعنیٰ تعلیم کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔

حبیب بینک اپنی اسکول بینکنگ اسکیم، اسپانسرڈ اسکالرشپ اور قرضِ حسنہ اسکیموں کے ذریعے ملک میں تعلیم کے فروغ کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

کشمیر جاگتا ہے

محمد شاہد فیروز

کروٹ زمیں نے لی ہے موسم بدل رہا ہے
رستے سنور رہے ہیں اور دھند چھٹ رہی ہے
مایوسیوں کی چادر چہروں سے ہٹ رہی ہے
بے کیف زندگی کا موسم گزر گیا ہے
ہر آدمی کے دل میں اک جوش و ولولہ ہے
کشمیر جاگتا ہے کشمیر جاگتا ہے

خورشیدِ عزم چمکا اور چُھٹ گیا اندھیرا
سر پر کفن کو باندھے پھر لوگ گھر سے نکلے
جن کی شجاعتوں سے کوہ و دمن بھی لرزے
ہر آنکھ میں سمایا اب ایسا اک سویرا

جس میں وفا ہے شامل مرنے کا حوصلہ ہے
کشمیر جاگتا ہے کشمیر جاگتا ہے

جذبات کا سمندر منہ زور ہو رہا ہے
باطل کی طاقتیں بھی دم توڑنے لگی ہیں
جنت سی اس زمیں سے منہ موڑنے لگی ہیں
کشمیر ہے ہمارا ہر سو یہی صدا ہے
کفر و درندگی کا انجام آچلا ہے
کشمیر جاگتا ہے کشمیر جاگتا ہے

طوفان بن گئی ہیں چلتی ہوئی ہوائیں
دریا کے پانیوں میں بڑھنے لگی روانی
انجام کو ہے پہنچی اب ظلم کی کہانی
شعلہ بنی ہوئی ہیں بے نور سی فضائیں
ہر نقش اک حقیقت بن کر اُبھر رہا ہے
کشمیر جاگتا ہے کشمیر جاگتا ہے

سوتا جاگتا ابوالحسن

نیّر مسعود

پانچویں قسط

خلیفہ ہارون الرشید سوداگر کے بھیس میں ابوالحسن نامی شخص سے ملا۔ اور ایک رات اس کا مہمان رہا۔ ابوالحسن کی خواہش پوری کرنے کے لئے خلیفہ نے اسے ایک دن کا بادشاہ بنا دیا۔ خلیفہ کی خواب گاہ میں ابوالحسن کی آنکھ کھلی تو اسے اس تبدیلی پر یقین نہ آیا۔ بالآخر غلاموں اور کنیزوں کے یقین دلانے پر اس نے خود کو امیرالمومنین سمجھنا شروع کر دیا۔ خلیفہ بنتے ہی اس نے فسادی مولوی اور اس کے دوستوں کو سزا دلوائی اور ماں کو انعام واکرام سے نوازا۔ اگلی صبح وہ دوبارہ اپنے پرانے گھر میں موجود تھا اور خلیفہ سے ابوالحسن بن چکا تھا۔ مگر وہ یہ سب کچھ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ خود کو خلیفہ سمجھ رہا تھا اور لوگ اسے پاگل۔ اسی پاگل پن میں اس نے اپنی ماں کی پٹائی کر ڈالی۔ اور پڑوسیوں پر بھی لٹھ لے کر دوڑا۔ لوگوں نے اسے پکڑ کر داروغہ کے حوالے کر دیا اور داروغہ نے اسے جیل میں بند کر دیا۔

(منظر) قید خانہ

[ابوالحسن لوہے کے ایک پنجرے میں بند ہے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور بال بکھرے ہوئے ہیں۔ ابوالحسن کی ماں داخل ہوتی ہے]

ماں: (پنجرے کے قریب جاتی ہے) میرا لال! (رونے لگتی ہے) میں تجھ پر قربان! (سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر ابو الحسن کی بلائیں لیتی ہے) پندرہ دن سے پنجرے میں طوطے کی طرح بند ہے۔

ابو الحسن: (ماں کے ہاتھ پکڑ کر) ہائے میری اماں! (چیخیں مار مار کر روتا ہے) مجھے یہاں سے نکلواؤ اماں! روز مجھے پچاس پچاس کوڑے مارتے ہیں۔ مجھے امیر المومنین کہتے ہیں! نہیں اماں، میں امیر المومنین نہیں بننا چاہتا!

ماں: (خوش ہو کر) پھر اب تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟

ابو الحسن: (آنسو پونچھ کر) میں تمہارا بیٹا ہوں ابو الحسن!

ماں: ہائے تجھے پہلے یہ بات کیوں نہ سوجھی؟ ناحق اپنی بھی درگت بنوائی اور مجھے بھی ہلکان کیا۔

ابو الحسن: (اپنا ماتھا رگڑتا ہے) سمجھ میں نہیں آتا اماں۔ وہ سب مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کنیزیں تھیں، غلام تھے، خواجہ سرا تھے، گانا ہوتا تھا، دربار لگا تھا۔ کیا یہ صرف خواب تھا؟

ماں: میں تو جانتی ہوں یہ سب اسی موصل کے سوداگر کی کارستانی ہے۔ وہ موا شیطان تھا جس نے تجھے بہکا دیا۔

ابو الحسن: ہاں ہاں ضرور یہی بات تھی۔ خدا غارت کرے اس کو! مگر اماں مجھ کو یہاں سے چھٹکارا دلاؤ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔

ماں: (پھر ابو الحسن کی بلائیں لیتی ہے) اے خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔

داروغہ: بڑی بی جاؤ بس! اب کل آنا۔

ماں: داروغہ صاحب! داروغہ صاحب! میرا بیٹا ٹھیک ہو گیا! بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اب وہ اپنے کو ابو الحسن کہتا ہے۔ سچ! پوچھ کے دیکھ لیجئے!

داروغہ: ہاں!؟ (ابو الحسن سے) کیوں جناب اب تو آپ کے دماغ سے کیڑے جھڑ گئے؟

ابو الحسن: جی بالکل، بالکل! اور کیا جلدی ہی نہ چھوڑا گیا تو سر کے بال بھی جھڑ جائیں گے!

داروغہ: خوب!! کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟

ابو الحسن: شوق سے۔ خاکسار کو ابو الحسن کہتے ہیں۔

داروغہ: (تعجب کے لہجے میں) بھئی واہ! اور یہ بڑی بی جو کھڑی ہیں، یہ کون ہیں؟ آپ انہیں پہچانتے ہیں؟؟

ابوالحسن: کیوں نہیں، یہ میری والدہ محترمہ ہیں جنھوں نے مجھے بچپن سے............

داروغہ: (بات کاٹ کر) بس بس! تو گویا اب تم بالکل ٹھیک ہو! اچھا تو پھر اب تمہیں آزاد کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

[پنجرے کا قفل کھول دیتا ہے۔ ابوالحسن باہر نکل کر ماں سے چمٹ جاتا ہے]

ماں: (ابوالحسن کو تھپکتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے داروغہ صاحب!

داروغہ: مگر دیکھو ابوالحسن، اب تمہارے سر پر یہ بھوت نہ سوار ہونے پائے...... ورنہ......

ابوالحسن: (کان پکڑ کر) میری توبہ! ایسی بادشاہی کو دور سے سلام جس میں بیٹا اپنی ماں کو بھول جائے۔ ہائے اماں! میں نے تمہیں کیا کیا کہہ ڈالا!

ماں: اب ان باتوں کو بھول جاؤ بیٹے۔

داروغہ: اور آئندہ اپنی ماں کا خیال رکھنا۔

ماں: آؤ چلیں۔

[دونوں داروغہ کو سلام کر کے جاتے ہیں۔ داروغہ کچھ دیر تک ان کو جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر مڑ کر پنجرے کا قفل بند کرنے لگتا ہے]

(منظر) بغداد کا پل

[ابوالحسن کو قید سے چھوٹے مہینہ بھر سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اب پھر وہ پہلے کی طرح روز ایک مہمان کو اپنے گھر لے جا کر اس کی دعوت کرتا ہے۔ اس وقت بھی وہ پل پر بیٹھا کسی مسافر کا انتظار کر رہا ہے اور دھیرے دھیرے گنگنا رہا ہے]

ابوالحسن: (گنگنانا بند کر کے اپنے آپ سے) ارے بھئی کوئی اللہ کا بندہ ادھر بھی آ نکلے۔ کیا مصیبت ہے! کیا آج کوئی نہیں ملے گا! سب کے سب کھانا ٹھونس کر اپنے اپنے گھر میں ڈھیر ہیں؟؟

(ایک دم ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا بنا کر داہنی طرف دیکھتا ہے) اوہوہو...... کوئی آ رہا ہے! کہیں باہر ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ (اور غور سے دیکھتا ہے) ...... پیچھے پیچھے ایک دم

چھلا بھی لگا ہوا ہے۔ غلام ہے شاید...... اررر...... رے باپ......!! (بوکھلا جاتا ہے) ...... یہ...... یہ تو وہی موصل کا سوداگر معلوم ہوتا ہے......!! کم بخت ادھر کہاں سے آ ٹپکا! خدا بچائے ایسے منحوس سے!...... (پل کی طرف مڑ کر سکڑا ہوا بیٹھ جاتا ہے) الٰہی خیر، الٰہی خیر!

[قدموں کی آہٹ قریب آتی جاتی ہے۔ خلیفہ ہارون رشید موصلی سوداگر کے بھیس میں اپنے غلام کافور کے ساتھ پل پر آتا ہے۔ ابو الحسن کو دیکھتا ہے اور پہلے ہی نظر میں پہچان کر ٹھٹھک جاتا ہے]

خلیفہ: اخاہ!! (کھنکھارتا ہے) میں نے کہا...... (اور زور سے کھنکھارتا ہے۔ مگر ابو الحسن اسی طرح منہ پھیرے بیٹھا رہتا ہے۔ خلیفہ اس کے قریب جاتا ہے) ...... میں نے کہا بھائی ابو الحسن السلام علیکم! مجھے پہچانا؟

ابو الحسن: (منہ پھیرے پھیرے) جاؤ میاں اپنا رستہ ناپو۔ میرے سر پر کیوں کودے پڑ رہے ہو؟ میں کسی کو نہیں پہچانتا۔

خلیفہ: آئیں!! اتنی جلدی بھول گئے!! ابھی ڈیڑھ مہینہ بھی نہ گزرا ہوگا، تم نے اپنے مکان پر لے جا کر میری دعوت کی تھی۔ واہ! کیا لذیذ کھانا تھا!! اب تک زبان اس کے مزے لیتی ہے!

ابو الحسن: کی ہوگی دعوت۔ روز ہی کسی کی دعوت کرتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ایک ایک کی صورت بھی یاد رکھتا پھروں۔

خلیفہ: مگر کیا مجھے بھی بھول گئے؟؟

ابو الحسن: کیوں؟ آپ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں!

خلیفہ: یہ بے مروتی! آخر تمہیں مجھ سے کیا تکلیف پہنچی کہ اتنے ناراض ہو؟ مجھے بتاؤ تو سہی شاید کچھ کام آ سکوں۔

ابو الحسن: کچھ نہیں، آپ تو بڑے بھولے بھالے ہیں! جب سے آپ سے ملا ہوں آرام ہی آرام ہے! (خلیفہ کی طرف مڑ کر) نا بھائی! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا احسان کرو کہ میرے پاس سے چلے جاؤ۔

خلیفہ: (ابو الحسن کے گلے سے لگ جاتا ہے) واہ! یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ میں بھلا تمہارے جیسے

دوست کو چھوڑ دوں؟ مگر آخر ہوا کیا؟ تمہیں خدا کی قسم بتاؤ تو سہی بات کیا ہے۔ کیوں مجھ سے اس قدر خفا ہو!!

ابو الحسن: اب پوچھتے ہی ہو تو بتائے دیتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میں نے جب تمہاری دعوت کی تھی تو کہہ دیا تھا کہ باہر کا دروازہ بند کرتے جانا۔ مگر تم نے میری بات نہ مانی......

خلیفہ: ہاں یہ تو سچ ہے! واقعی مجھے خیال نہیں رہا تھا۔

ابو الحسن: اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دروازہ کھلا پا کر شیطان اندر گھس آیا۔ اور اس نے میرے دماغ میں یہ خیال ڈال دیا کہ میں خلیفہ ہو گیا ہوں۔

خلیفہ: (تعجب سے) اوہو تو پھر؟

ابو الحسن: پھر یہ کہ اسی خیال میں آ کر میں نے اپنی ماں کو خوب مارا...... خدا مجھے معاف کرے...... اور اپنے پرانے پڑوسیوں پر لٹھ لے کر دوڑا۔ آخر انہوں نے مجھے پاگل جان کر داروغہ کو بلا لیا اور داروغہ نے مجھے بند کر دیا۔ اور روز شام کو میری پیٹھ پر پچاس کوڑے لگواتا اور پوچھتا تھا "اور کوئی خدمت امیر المومنین......!"

خلیفہ: (ہنسنے لگتا ہے) بھئی خوب رہی! یہ تو اچھی خاصی کہانی ہو گئی!!

ابو الحسن: (بگڑ جاتا ہے) یہ کوئی ہنسنے کی بات ہے؟ اگر تمہیں یقین نہ آتا ہو تو یہ دیکھو کوڑوں کے نشان۔ (پیٹھ کھول کر نشان خلیفہ کو دکھاتا ہے)

خلیفہ: (افسوس کرتا ہے) ہا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے دوست پر یہ مصیبت پڑی ہے۔

ابو الحسن: صرف تمہاری وجہ سے!

خلیفہ: اچھا خیر جو ہوا سو ہوا۔ میرا قصور معاف کر دو اور ایک مرتبہ پھر مجھے اپنے گھر لے چلو اس بار تو موصل سے آیا ہی اس لئے ہوں کہ ایک دفعہ اور تمہارے ساتھ کھانے پینے کا لطف اٹھاؤں۔

ابو الحسن: نہیں نہیں مجھے معاف ہی رکھو۔ تم کو بتا تو چکا ہوں کہ اب میں نے یہ قاعدہ بنا لیا ہے کہ ایک مرتبہ سے زیادہ کسی کو اپنے گھر نہیں لے جاتا ــــ تمہیں ایسا ہی شوق ہے تو بیٹھو۔ میں ابھی سارا سامان لے آتا ہوں۔ یہیں کھائیں پئیں گے، پل پر بیٹھ کر۔

خلیفہ: واہ، اس میں کیا مزہ؟ نہیں دوست! مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو، دیکھو نا میں موصل سے

صرف تم سے ملنے آیا ہوں! میرے بھائی بس ایک مرتبہ میری خاطر اپنا قاعدہ توڑ دو۔

ابو الحسن: (کچھ دیر سوچنے کے بعد) خیر، اب تمہاری بات کیا ٹالوں۔ چلو، مگر ایک وعدہ ابھی سے کر لو۔

خلیفہ: وہ کیا؟

ابو الحسن: کہ اب کی بار جاتے وقت باہر کا دروازہ بند کرنا نہ بھولو گے؟

خلیفہ: (ابو الحسن کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنستا ہے) وعدہ، وعدہ پکا وعدہ!!

ابو الحسن: ایک شرط اور بھی ہے۔

خلیفہ: کوئی شرط بھی ساتھ میں لگی ہوئی ہے؟

ابو الحسن: ہاں اور وہ یہ کہ آئندہ کبھی میری طرف کارخ بھی نہ کرنا!

خلیفہ: افوہ!! اچھا چلو یہ بھی منظور! بس؟؟

ابو الحسن: آؤ چلیں۔

[جاتے ہیں]

(منظر) خلیفہ کا محل

[خلیفہ کے سونے کا کمرہ۔ غلام کنیزیں اور خواجہ سرا خلیفہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ خلیفہ داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے کافور ابو الحسن کو اپنے کندھے پر لادے ہوئے داخل ہوتا ہے]

سب لوگ: (خلیفہ کو جھک کر آداب کرتے ہیں) السلام علیکم یا امیر المومنین!

خلیفہ: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ .... مسرور!!

مسرور: امیر المومنین!

خلیفہ: (ابو الحسن کی طرف اشارہ کر کے) اس کو پہچانتے ہو مسرور؟

مسرور: کیوں نہیں امیر المومنین یہ وہی مسخرا جوان ابو الحسن ہے جس کو پہلے بھی ایک مرتبہ حضور...........

خلیفہ: .... ٹھیک ٹھیک .... اس بے چارے کو میری وجہ سے بہت تکلیفیں اٹھانا پڑی ہیں..... آج پھر میں سوداگر کے بھیس میں اس سے ملا۔ اس کے گھر جا کر دعوت کھائی اور

پھر اسی طرح بے ہوش کر کے اسے اپنے ساتھ اٹھوا لایا۔ آج بھی یہ میری جگہ سوئے گا .... اور کل سویرے یہ ابوالحسن نہیں ہو گا!

مسرور: میں سمجھ گیا امیر المومنین۔

خلیفہ: اور اب میں اسے اتنا انعام دوں گا کہ یہ اپنی تمام پچھلی تکلیفیں بھول جائے .... اس کو میرا لباس پہنا کر بستر پر لٹا دو۔

[خواجہ سرا خلیفہ کے سونے کا لباس لے کر ابوالحسن کی طرف بڑھتے ہیں]

(ابوالحسن کے دوسری بار خلیفہ بننے کی دلچسپ داستان اگلے شمارے میں پڑھئے)

بڑا وکیل

فریادی بڑا پریشان تھا کیونکہ ماتحت عدالت نے اس کا مقدمہ خارج کر دیا تھا۔ اب اسے اپیل کے لئے اعلیٰ عدالت کا رخ کرنا تھا مگر وہ اس سے پہلے یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ آیا اس کے مقدمے میں جان ہے یا اس کی سعی رائیگاں جائے گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت بمبئی میں کون سا وکیل دیانت داری سے رائے دے سکتا ہے پھر فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک نام آیا اور وہ آگے بڑھنے لگا۔

شام کا اندھیرا چھا چکا تھا اور بمبئی کے پر رونق شہر میں زندگی رواں دواں تھی۔ فریادی وکیل کے دفتر میں داخل ہوا۔ دروازے کی تختی پر لکھا تھا۔

بیرسٹر محمد علی جناح

وہ مختلف مراحل کے بعد وکیل کے سامنے تھا۔ فریادی نے اپنا مدعا بیان کیا جس کے بعد وکیل نے کہا۔ "میری فیس اس فائل کے مطالعے کے گھنٹے کے حساب سے ہوگی۔ آپ سیکریٹری کو فیس جمع کرا دیں۔" جب رقم کا اندازہ بتایا تو فریادی نے پریشان نظروں سے کہا۔ "میرے پاس رقم بہت کم ہے۔"

وکیل نے معذرت کرتے ہوئے اسے چلے جانے کا مشورہ دیا وہ جاتے جاتے مڑا اور قریب آ کر کہا۔ "اچھا سر آپ یہ پیسے رکھ لیں اور اس وقت تک مطالعہ کریں جب تک یہ رقم فیس کے طور پر وصول نہ ہو جائے پھر وہاں تک ہی اپنی رائے لکھ کر دے دیں۔ وکیل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے ایک ہفتے بعد آنے کا مشورہ دیا۔

جب فریادی رائے اور فائل لینے آیا تو وکیل نے اسے یہ نوید دی کہ میں نے تمہاری مکمل فائل پڑھ لی ہے اور رائے لکھ دی ہے فریادی کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا مگر وکیل نے اسے مزید متحیر کرتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں جاتے ہوئے سیکریٹری سے باقی رقم بھی لیتے جانا، میں نے تمہاری فائل ایک گھنٹے میں ہی ختم کر لی تھی۔"

یہ تھے ہندوستان کے ایک بڑے وکیل محمد علی جناح جو میدان سیاست کے بے تاج بادشاہ کہلائے اور قائد اعظم کا لقب پایا۔

مرسلہ۔ غلام حسین میمن۔ حیدر آباد۔

روشنی

ایک شہزادے کی عید

حضرت سیدنا عمر (رضی اللہ عنہ) نے ایک مرتبہ عید کے دن اپنے شہزادے کو پرانی قمیض میں دیکھا تو رو پڑے شہزادے نے عرض کیا کہ پیارے ابا جان! آپ کس لئے رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا، "بیٹے! مجھے اندیشہ ہے کہ آج عید کے دن جب لڑکے تم کو اس پھٹے پرانے قمیض میں دیکھیں گے تو تمہارا دل ٹوٹ جائے گا شہزادے نے جواباً عرض کیا، "دل تو اس کا ٹوٹے جو رضائے الٰہی کو نہ پاسکا یا جس نے ماں باپ کی نافرمانی کی ہو اور مجھے امید ہے کہ آپ کی رضامندی کے طفیل اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے راضی ہوگا۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ رو پڑے۔ شہزادے کو گلے لگایا اور اس کے لئے دُعا کی۔

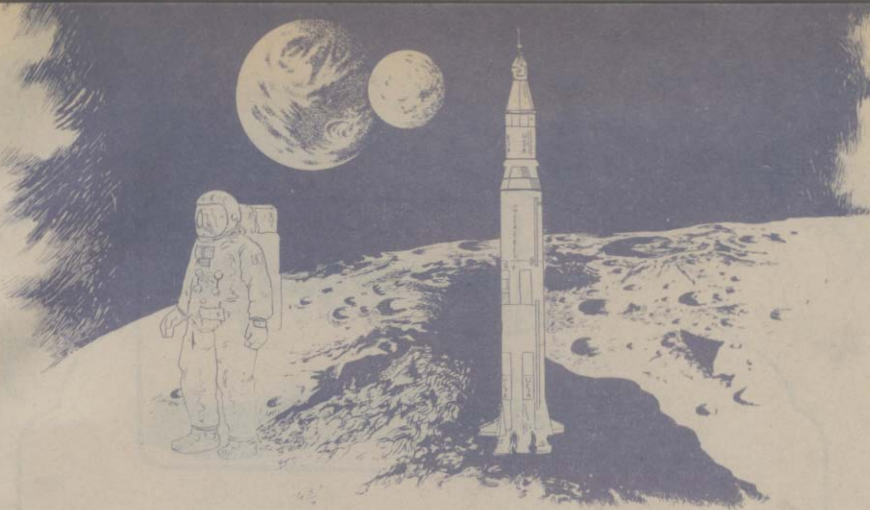

اسلام اور سائنس

صرف قرآن مجید میں ہی نہیں احادیث مبارکہ سے بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ سائنس اور اسلام کا آپس میں گہرا ربط ہے

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی ترقی کے لئے جتنی آسانیاں دین اسلام میں شامل کردی ہیں اتنی کسی اور مذہب میں نہیں ہیں لیکن اس کو مسلمانوں کی بدقسمتی ہی کہئے کہ وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھارہے بلکہ آپس کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں اور ہماری کتاب قرآن مجید سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھارہے ہیں۔

قرآن شریف ایسی کتاب ہے جس میں ہر طرح کا علم ہے اس میں سائنس بھی شامل ہے اور صرف قرآن مجید میں ہی نہیں احادیث مبارکہ سے بھی یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ سائنس اور اسلام کا بہت گہرا ربط ہے۔

حضورؐ کا فرمان ہے "کھانا پیٹ بھر کر نہ کھاؤ بلکہ پیٹ کا ایک حصہ خالی رکھو اور کھانے کے

درمیان پانی نہ پیو آج کے ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں جدید تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ روزے رکھنے سے انسان کے جسم میں موجود چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے :

"ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا"

(سورہ انبیا : ۳۰ آیت)

علامہ عبداللہ یوسف علی

نے پانی کو پروٹوپلازم سے مشابہت دیتے ہوئے کہا ہے کہ پروٹوپلازم (Portoplasm) تمام جاندار اشیا کا بنیادی جز ہے۔ اور پروٹوپلازم کی بنیادی طاقت کا انحصار اس میں موجود پانی کی وجہ سے ہے۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :

"خدا گٹھلی اور دانہ کو شگوفہ کر کے درخت روئدہ کرتا ہے۔

(سورہ الانعام : آیت ۹۵)

اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ درخت پھلوں کے بیج سے اگتے ہیں، ایک اور جگہ اس طرح فرمایا ہے کہ :

"اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور ٹہنیوں پر چڑھتی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لئے شفا ہے (سورہ النحل : آیت ۶۸، ۶۹)

اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ شہد کی مکھی شہد رس چوس کر بناتی ہے شہد میں بہت شفا ہے ایک اور جگہ اس طرح سے ارشاد ہوتا ہے کہ :

"وہی اللہ تو ہے جس نے دن اور رات کو پیدا کیا۔ سورج اور چاند کی تحلیق کی اور دوسرے (اجرام فلکی) جو اپنے دائرہ نما رستوں پر رواں دواں ہیں۔

(سورہ انبیاء آیت : ۳۳)

عیسائیوں کے مذہب میں ہے اور لوگ بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ زمین اپنی جگہ پر قائم ہے اور دوسرے اجرام فلکی اس کے گرد چکر لگاتے ہیں لیکن گلیلیو کے تجربات نے ثابت کردیا کہ زمین اور باقی سیارے سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں اور یہ بات آج سے تقریباً" چودہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ مسلمانوں کو بتادی تھی پھلوں میں جنس یا نرومادہ کا موجود ہونا قرآن مجید میں اس طرح بتایا گیا ہے :

"اور ہر طرح میووں کو دو دو کے جوڑوں (نر اور مادہ) میں بنایا وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لئے اس میں بہت

نشانیاں ہیں" (سورہ رعد آیت ۳)

یہ کچھ آیتیں تھیں جو اس وقت نازل ہوئی تھیں جب انسان بالکل جاہل تھا۔ اور اس کو کچھ علم نہ تھا ایسی اور اس طرح کی بہت سی آیتوں کا سہارا لے کر مسلمان علم کی دوڑ میں میں کئی صدیوں تک دوسری قوموں سے آگے رہے لیکن افسوس جب انہوں نے اس بابرکت کتاب کو چھوڑ دیا اور فرقوں میں بٹ گئے تو یہ علم و حکمت دوسری قوموں کے ہاتھ میں چلی گئی اور آج ہم ان قوموں کے ذہنی غلام بن کر زندگی گزار رہے ہیں---!!

○ جو شخص سوال پوچھنے میں تیز ہو وہ جواب دینے میں کمزور ہوتا ہے۔

○ اپنے اور اپنے باپ کے دوستوں کی عزت کرو۔

○ حکمت اور دانائی غریب کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

مرسلہ ...... عبدالوحید ساگر بلوچ، پنگور

○ جس شخص کا ظاہر اور باطن ایک نہیں ہوتا وہ کامیابی حاصل کر کے بھی خوش نہیں ہوتا۔

○ کسی کا دل نہیں دُکھانا چاہئے، کیونکہ جو دل دُکھاتا ہے وہ خود بھی ایک دل کا مالک ہوتا ہے۔

○ صبر کرنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ ...... عدیل احمد عدی، کراچی

آٹوگراف

○ ...... غصب اور غصے سے بچو کہ زیادتی عقلمند کے دل کو بھی مُردہ بنا دیتی ہے۔

○ ...... تیرے دستر خوان پر ہمیشہ نیک لوگوں کو جمع ہونا چاہئے۔

○ ...... جاہل سے دوستی نہ کرو۔ دانا آدمی کے غصے میں بھی دانائی کی بات ہوتی ہے اس کے غصے کو بے پروائی سے نہ ڈالو۔

مرسلہ...... عبدالوحید ساگر بلوچ، پنجگور

○ ...... بحث گفتگو کی موت ہوتی ہے۔

○ ...... انسان سے محبت کرنا خدا سے محبت کرنا ہے۔

○ ...... مت چنو ایسے پھول جو ہنسی مسکراتی زندگی کو اجاڑ دیں۔

○ ...... کسی کا دل مت دکھاؤ، کیونکہ دکھی دلوں کی فریاد آسمانوں کا جگر چیر دیتی ہے۔

مرسلہ ...... عارفہ شارق، کراچی

اس ماں کو زندہ رہنا ہے

حاجی مظہر حسین لاشاری

ان کلیوں کے چٹکانے کو
خوشبو ہر سو مہکانے کو
اس لو کو نُور بنانے کو
جو کھویا ہے وہ پانے کو
ہر ظلم اس دل پہ سہنا ہے
اس ماں کو زندہ رہنا ہے

یہ ہونٹ سدا ہنستے ہی رہیں
یہ آنکھیں روشن تارے بنیں
دل دریا بلکہ بحر بنے!
یہ عمر سدا بڑھتی ہی رہے
ان پودوں کو خوں دنیا ہے
اس ماں کو زندہ رہنا ہے

تم سُکھ دیکھو ماہتاب بنو
تم نادر تم نایاب بنو
تم سر سبز و شاداب بنو
ہر دور کا روشن باب بنو
ہر پل ہر سانس یہ کہنا ہے
اس ماں کو زندہ رہنا ہے

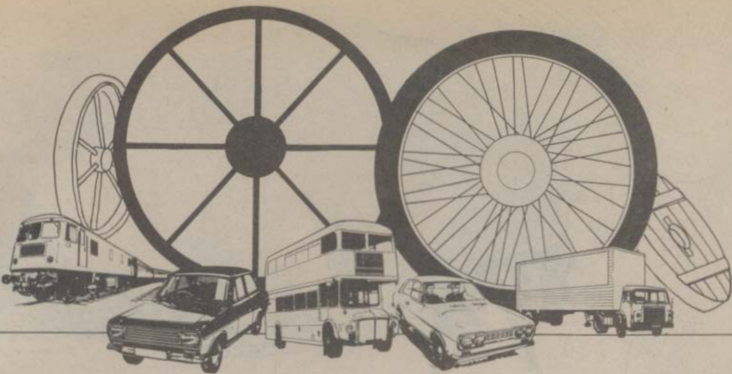

انسان کی سب سے پہلی ایجاد

پہیا

محمد ابراہیم

آج کے دور میں ایسی دنیا کا تصور کتنا عجیب اور مضحکہ خیز لگتا ہے کہ جہاں پر سواری کے لئے گاڑیاں نہ ہوں، نہ ہوائی جہاز، نہ ریلیں، نہ تانگے، بیل گاڑیاں اور چھکڑے ہوں لیکن قدیم زمانے میں دنیا کی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے آمدورفت اور سامان نقل و حمل کے لئے جانوروں کو استعمال کیا۔ لیکن جیسی ہی پہئے کی ایجاد ہوئی انسانوں کی تہذیب میں ایک زبردست انقلاب آیا۔

دراصل پہیہ ہی انسان کی سب سے پہلی ایجاد ہے۔ سب سے پہلا پہیہ کب اور کس نے ایجاد کیا؟ یہ سوال تو یقیناً آپ کے ذہن میں ہو گا۔ تو آیئے ہم بتاتے ہیں کہ یہ کیسے کب اور کس نے ایجاد کیا؟

ایشیا میں تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح سے لوگ لکڑی کے پہیوں کی گاڑیاں استعمال کر رہے تھے۔ شروع شروع میں لوگ بوجھ کو اپنے سر یا پیٹھ پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتے تھے پھر آہستہ آہستہ یہ کام جانوروں سے لیا جانے لگا۔ لیکن کچھ ایسی بھاری چیزیں بھی تھی جن کو انسان اور جانور دونوں ہی اٹھانے سے قاصر تھے۔ ان کو لوگ دھکیلتے ہوئے یا پھسلاتے ہوئے لے جاتے تھے۔ بھاری بھرکم چیزوں کے نیچے درختوں کے گول گول تنے کاٹ کر رکھ دیئے جاتے اور ان پر چیزیں آسانی سے لڑھک جاتی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ درختوں کے تنے کے تصور سے انسان پہیا بنانے میں کامیاب ہوا۔ رومیوں نے لکڑی کے بجائے لوہے کے پہئے بنائے جو تھے تو دیرپا لیکن بھاری بھی

بہت تھے۔ ایک سے زیادہ سواریوں کے لئے رفتہ رفتہ بگھیاں، بیل گاڑیاں اور اسی قسم کے دو چار چار پہیوں والی گاڑیاں بننے لگیں۔ لیکن ہر عام آدمی مہنگی گاڑیوں کو نہیں خرید سکتا تھا۔ چنانچہ بائیسکل کی ایجاد زمانے کی یادگار ہے۔ پھر مزید آرام و سہولت کے لئے ربڑ کے پہیئے ایجاد کئے گئے اور ان میں چوپاؤں کے بجائے انجن لگائے گئے۔ جب انسان نے پہیا ایجاد کیا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ یہ ایجاد اتنی زبردست ترقی کرے گی۔ اور اب وہ زمانہ آچکا ہے کہ بڑی بڑی ایجادوں میں پہیئے کا استعمال ایک لازمی چیز قرار دے دیا گیا ہے۔

تنگ ہیں اس سے سارے بچے

مولا بخش

"شاہی" اس کا نام ہے بچو!
پڑھنے لکھنے سے گھبرائے
مار پٹائی اس کی عادت
حلوہ کھائے، پُوری کھائے
جونہی گھر سے باہر جائے

لڑنا اس کا کام ہے بچو!
مکتب میں وہ ڈنڈے کھائے
کرتا ہے دن رات شرارت
چورن کھائے چٹنی کھائے
بچّوں کو وہ خوب ستائے

اس کو چھیڑے، اس کو مارے
تنگ ہیں اس سے بچّے سارے

یہ کہانی ایک مشہور شاعر نے لکھی ہے آپ کو
ان کا نام بتانا ہے۔ انہوں نے پاکستان
کے لئے بہت اچھے اور خوب صورت ملّی
نغمے بھی لکھے ہیں انکی پہچان پاکستان سے ہے

ادیب بتایئے انعام پایئے

انعام یافتہ کہانی

مسافر کی کہانی

انتخاب: عابد محمود

پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک مسافر سفر پر روانہ ہوا۔ یہ ایسا ویسا نہیں، بلکہ بہت ہی عجیب سفر تھا۔ اس مُسافر کو اپنا سفر شروع کرتے وقت تو بہت لمبا دکھائی دیا، مگر جب وہ آدھا راستہ طے کر چکا تو بہت ہی چھوٹا معلوم ہونے لگا۔

کچھ عرصے تک تو مسافر اندھیرے میں چلتا رہا نہ تو اسے کوئی چیز دکھائی دی اور نہ کوئی آدمی ملا۔ مگر آخر کار چلتے چلتے اسے ایک بچّہ نظر آیا۔ اس نے بچّے سے پوچھا۔ "ننھے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" بچے نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ کھیلا کرتا ہوں آؤ تم بھی میرے ساتھ کھیلا کرو۔"

مسافر اس کے ساتھ کھیلنے لگا اور سارا دن کھیلتا رہا دونوں بہت خوش تھے۔ دن بہت سہانا تھا۔ ہوائیں گا رہی تھیں۔ سورج کی کرنیں پانی پر بچھی جاتی تھیں، پانی چمک رہا تھا۔ پرندے چہچہا رہے تھے، موسم کی تعریف میں گیت گا رہے تھے پھر وہ خوش کیوں نہ ہوتے؟

جب بارشیں ہوئیں تو پھر بھی وہ خوش تھے بوندوں کی پھوار ان کے دل کو لبھاتی تھی۔ پتے گرتے تو وہ انہیں تیتریاں سمجھ کر پکڑنے دوڑتے۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی بھاگتی تو یہ کہتے کہ گھر سے بھاگ نکلی ہے اور پھر سوچتے کہ اس کا گھر کہاں

ہے؟ وہ دیکھتے اور خوش ہوتے اور دیکھتے کہ ہوائیں شور مچاتی ہیں-------------------
---بادلوں کو ہانکے لئے جاتی ہیں۔ درختوں کو جھکاتی ہیں۔ سمندر کو دق کرتی ہیں۔ وہ شور مچاتا ہے غصّے میں بھر جاتا ہے۔ اٹھ کر لپکتا ہے جن دنوں میں برف پڑتی ہے، ان دنوں کا کیا کہنا! روئی کے گالے ہلکے ہلکے چپّے چپّے آہستہ آہستہ زمین پر اُترتے۔ جدھر نظر اٹھا کر دیکھتے سفیدی ہی سفیدی نظر آتی۔ پھر وہ خوش کیوں نہ ہوتے؟

ان کے پاس بہت سے اچھے اچھے کھلونے تھے۔ بہت سی مورتوں والی کتابیں تھیں ان کتابوں میں بہت سے صاحبوں اور میموں کی تصویریں تھیں۔ وہ انہیں دیکھتے اور خوش ہوتے۔

ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ بچّہ کہیں گُم ہو گیا۔ مُسافر نے اسے بہت آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔ کوئی سُنتا ہی نہ تھا۔ بہت ڈھونڈا مگر بے فائدہ۔ اسے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ بے چارہ مسافر کیا کرتا۔ آگے بڑھا، رستہ سُنسان تھا چلتا گیا۔ آخر کار اسے ایک لڑکا ملا۔ یہ لڑکا بہت خوبصورت تھا۔ مسافر نے اس لڑکے سے پوچھا۔ "کیوں میاں تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" لڑکے نے جواب دیا۔ "میں ہر وقت پڑھا کرتا ہوں آؤ تم بھی میرے ساتھ پڑھا کرو۔"

مسافر نے اس کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتا گیا اور بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ عمرو عیّار کی کہانی، علی بابا چالیس چور، غرض کہ بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کہ میں بتا نہیں سکتا اور وہ خود بھی نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ جب وہ سبق ختم کر چکا تو وہ سب کچھ بھول چکا تھا!

پڑھنے کے بعد یہ کھیلتے کودتے، شرارتیں کرتے۔ ان کے بہت سے دوست تھے۔۔۔۔ اس لڑکے کی طرح سب بھولے بھالے اور خوبصورت۔ یہ اتنے بے تکلف تھے اور ان میں اتنا پیار تھا گویا سمجھتے تھے ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ان ہی رنگ رلیوں کا ایک دن تھا کہ لڑکا کہیں غائب ہو گیا۔ مسافر نے اسے بھی پکارا۔ لیکن اسے بھی نہ پایا۔ آخر اپنا رستہ لیا۔ رستہ سنسان تھا۔ مگر چلتا گیا، آخر کار اسے ایک نوجوان دکھائی دیا۔ اس نے اس نوجوان سے پوچھا۔ "کیوں میاں تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" نوجوان نے جواب دیا۔ "میں عاشق ہوں میرا کام عشق ہے آؤ تم بھی کسی پر عاشق ہو جاؤ؟"

مسافر اس کے ساتھ چل پڑا۔ انہیں ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی دکھائی دی۔ یہ لڑکی کیا تھی بس یوں سمجھو، دوسری سُندری تھی۔ نوجوان کو تو عاشق ہونا تھا سو ہو گیا جس طرح وہ .... میں نام کیوں لوں۔ سندری پر ہو گیا تھا۔ یہ عاشق و معشوق کا جوڑا لڑ بھی پڑتا، جس طرح سندری ..... اور "وہ" لڑ پڑتے تھے۔ سندری اور .... "اس" کی طرح وہ ایک دوسرے کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ روتے رہتے آخر ایک دن آگ تاپ

رہے تھے باتوں باتوں میں شادی کا اقرار ہو گیا۔

مسافر کی قسمت کہ ایک دن یہ بھی اس سے کھو گئے۔ مسافر نے انہیں بھی پکارا، مگر یہ بھی نہ آئے۔ مسافر اور کیا کرتا، اپنا راستہ لیا چلتا گیا۔ راستہ سُنسان تھا، مگر چلتا گیا آخر اسے ایک ادھیڑ عمر کا ایک آدمی ملا۔ مسافر نے آدمی سے پوچھا۔ "کیوں میاں! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "کام دھندے پر لگا رہتا ہوں آؤ تم بھی کام کیا کرو؟"

مُسافر اس کے ساتھ جنگل کو چل پڑا۔ شروع شروع میں تو یہ جنگل اچھا کشادہ تھا چلنے کو رستہ ملتا تھا مگر جوں جوں یہ آگے بڑھا جنگل گھنا ہوتا گیا، اندھیرا بڑھتا گیا اور انہیں ڈر لگنے لگا۔ یہ شخص اکیلا نہ تھا اس کے ساتھ تقریباً اسی کی عمر کی ایک عورت بھی تھی۔ یہ اس کی بیوی تھی ان کے بچے بھی تھے اور وہ بھی ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ یہ سب کے سب اور مسافر ساتھ ساتھ آرہے تھے یہ جنگل میں گُھس گئے۔ درخت کاٹتے تھے۔ رستہ بناتے تھے، بوجھ اٹھاتے تھے اور آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ تو وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں بہت سے راستے مختلف اطراف کو نکلتے تھے۔ یہاں ایک بچے نے کہا۔ "میں سمندر کو جا رہا ہوں۔" دوسرے نے کہا۔ "میں ولایت جا رہا ہوں۔" تیسرے نے کہا۔ "میں اپنے اللہ میاں کے پاس جاتا ہوں۔"

سب رونے لگے۔ جُدائی بڑی چیز ہوتی ہے۔ سب جُدا ہو گئے ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ اختیار کیا اور چلے گئے ہر ایک بچے کی رخصت پر مسافر اس شخص کو دیکھتا وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوتا تھا۔ سورج ڈوبنے کو جا رہا تھا۔ اس شخص کے بال سفید ہو گئے تھے مگر انہیں تو کام دھندے میں مصروف رہنا تھا۔ ٹھہرتے کیسے چل پڑے اور چلتے ہی رہے۔ رفتہ رفتہ باقی بچے بھی رخصت ہو گئے۔ وہ شخص اس کی بیوی اور مسافر اکیلے رہ گئے۔ تینوں آگے بڑھے۔ درخت زرد ہو رہے تھے....اور پتے گر رہے تھے چلتے چلتے وہ ایسی جگہ پہنچے، جو بہت تاریک تھی۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ کچھ نظر نہ آتا تھا مگر یہ تینوں بڑھتے جاتے تھے۔ اتنے میں بیوی دفعتاً ٹھہر گئی اور کہا! "مجھے کوئی بلاتا ہے۔" سب سننے لگے۔ بہت دور سے آواز آئی۔ "امی امی" یہ اس بچے کی آواز تھی جس نے کہا تھا کہ "میں اپنے اللہ میاں کے اس جاتا ہوں۔" بچے کے ابا نے کہا۔ "بچے ذرا ٹھہرو۔ سورج غروب کو ہونے والا ہے۔" وہ وہ شخص رو رہا تھا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ مگر بچے نے کچھ نہ پروا کی۔ اور پھر پُکارا۔ "امی امی" بیوی نے میاں کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پچھلے قدم چلنے لگی چلتی جاتی۔ "میرے پیارے نے مجھے بلایا ہے میں جاتی ہوں۔" اور وہ چلی گئی۔ دونوں آگے چلے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ شفق پھولی ہوئی تھی۔ سورج اور شفق انہیں بالکل ہی قریب معلوم ہوتے تھے۔ یہاں وہ شخص بھی غائب ہو گیا۔ مسافر نے پُکارا کوئی جواب نہ آیا۔

وہ جنگل سے باہر نکل آیا کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت ہی بوڑھا آدمی ایک گرے ہوئے درخت پر بیٹھا ہے اور رو رہا ہے۔

مسافر اس بوڑھے کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی "ہمنوائی" کرنے لگا۔ گھمبیر شام اس کے سامنے تھی۔ اس کے سب "دوست" چپکے سے اس کے اردگرد آکھڑے ہوگئے۔ وہ ننھا بچہ، ہونہار لڑکا، گھبرو پریمی، ابا، امی، ننھے بچے سبھی وہاں موجود تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ سے وہیں تھے..... کبھی نظروں سے اوجھل ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ سب سے محبت کرنے لگا۔ سب کو دیکھ کر خوش ہوتا اور سب اسے عزت و محبت سے دیکھتے!! ☆

ادیب بنئے

آپ بھی لکھیں . . . مگر

منور احمد صدیقی

ادیب بننے کا ضروری سامان:۔

○ "سوچ و فکر کی دیگچی" (بالکل صاف نہ ہو)

○ "علمی مواد" یہ جگہ جگہ سے اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ (ردّی کی ٹوکری سے بھی)

○ "عاجزی و انکساری کی چٹنی" (مرچیں ہرگز نہ ملائیں)

○ "زبان کی چاشنی کا شربت" (میٹھا اگر کم ہو تو مزید مٹھاس ملائی جا سکتی ہے)

○ "کاغذ اور قلم" حسبِ ضرورت

○ "رومال" (احتیاطاً) ایک عدد

ان سب چیزوں کے علاوہ ایک عدد ردّی کی ٹوکری بھی خرید لیں کہ کبھی بھی (بلکہ اکثر) اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

سب سے پہلے سوچ و فکر کی دیگچی میں کاغذ رکھ کر اس کے اوپر علمی مواد رکھیں اور قلم کی مدد سے خوب اچھی طرح کُوٹ لیں۔ کافی مشقت کے بعد ایک نئی چیز تیار ہوگی۔ (جو یقیناً ہوگی آپ کی تصنیف) اب اسے صاف سُتھرے طریقے سے ایک کاغذ پر نکال کر لفافے کے منہ میں ڈال دیں نئی چیز کو ایک بار پھر چیک کر لیں اگر خوش ذائقہ ہو تو عاجزی و انکساری کی چٹنی اور زبان کی چاشنی کے شربت کے ساتھ ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیجئے (اگر پسند آگئی تو) جناب آپ بن گئے ادیب ورنہ احتیاطاً آپ کو ایک عدد رومال استعمال کرنا پڑے گا اپنی ناکام کوشش پر !!!

اسکول نہیں جاؤں گا

نعیم احمد نعیم

مائیکل جیکسن بن جاؤں گا

بچہ:- دل گانوں سے بہلاؤں گا
یا پیڑ پر چڑھ جاؤں گا
اسکول سے ڈرتا ہوں میں
اسکول نہیں جاؤں گا

امی:- یوں تو بگڑ جاؤ گے تم
اب ڈانٹ ہی کھاؤ گے تم
اسکول سے ڈرتے ہو کیوں
اسکول ہی جاؤ گے تم

بچہ:- اسکول میں جاؤں مگر
اسکول میں ہوتے ہیں سر
بس چیختے ہیں مجھ ہی پر
اسکول نہیں جاؤں گا

امی:- جب پیڑ پہ چڑھتے ہو تم
اور کھیلتے رہتے ہو تم
پھر سر سے کیوں ڈرتے ہو تم
اسکول ہی جاؤ گے تم

بچہ:- اب معاف اچھا کیجیے
ہاتھ میں بستہ دیجیے
یہ گیند بلا لیجیے
یہ آپ کا کہنا ہے تو
اسکول ہی جاتا ہوں میں

دُم کٹا چوہا

انتخاب: ظفر علی

یہ کہانی ایک مشہور شاعر و ادیب کی ہے۔ آپ کو ان کا نام بتانا ہے۔ انہوں نے بڑوں کیلئے بہت اچھے سفرنامے بھی لکھے۔ مزاح نگاری میں ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ اب یہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں انہیں زندہ جاوید رکھیں گی۔

انعام یافتہ کہانی

یہ قصّہ ہے ایک چوہے میاں کا جو ایک درزی کے گھر رہتے تھے ایک دن بل سے نکل کر شرارتیں کر رہے تھے کہ ان کی دُم سیڑھی کے ڈنڈے میں پھنس گئی زور لگا کر جو کھینچا تو دُم کٹ گئی۔

چوہا ہوا غمگین
رویا آنسو تین تین
بولا عید ہے قریب
ہائے میں غریب
عید کیسے مناؤں گا
دُم کٹا کہلاؤں گا

دُم اُٹھا کر درزی کی بیوی کے پاس گئے اور کہا۔

نانی، نانی، نانی
ذرا پی کے ٹھنڈا پانی
میری دُم سی دے
میری دُم سی دے

وہ تھی بدمزاج، اُس نے جھڑک کر کہا:

چھوڑ اپنا راگ تو
بھاگ بھاگ تو
ارے تیرا ستیاناس
جا کسی موچی کے پاس

چوہا گیا موچی کے پاس اور کہا:

اے موچی چاچا
لال تیرا لاچہ
ذرا میری دُم سی دے
ذرا میری دُم سی دے

موچی بولا سی دیتا ہوں لیکن تاگا میرے پاس نہیں جاؤ نورباف جولاہے کے پاس اور تاگا لاؤ۔

آگے جو چوراہا تھا
وہاں یہ جولاہا تھا
چوہا بولا صاف صاف
اے بھائی نور باف
آیا ہوں میں بھاگا
لینے کو تاگا

جولاہا اچھا آدمی تھا محبت سے بولا :

بیٹے میں بیمار ہوں
اُٹھنے سے لاچار ہوں
مُرغی کے پاس جاؤ
اس سے ایک انڈا لاؤ
انڈا جو میں کھاؤں گا
تگڑا ہوجاؤں گا
تگڑا ہو جاؤں گا
تاگا بناؤں گا

اب چوہا مُرغی کے پاس گیا اور کہا:

اے مُرغی خالہ
اوڑھ کر دوشالہ
دو ایک انڈا
گرم ہو کے ٹھنڈا
آپ کھاؤں کا ہے کو
انڈا دوں جولاہے کو
اس سے لوں تاگا
جاؤں گا پھر بھاگا
موچی کے پاس
موچی سئیے دم میری
عید میں مناؤں گا
ناچوں گا گاؤں گا

مُرغی نے کہا :

چوہے چوہے رے بیچارے
تو آیا میرے دوا رے
پہلے مجھ کو دو چوگا
میرا پیٹ بھرا ہو گا
ایک انڈا دوں گی

چوہا ایک کسان کے پاس گیا اور کہنے لگا :

بابا کسان جی
اونچی تیری شان جی
میں تجھ پر قُربان جی
مُرغی کا کھانا دو
مجھے تھوڑا دانہ دو
مجھے تھوڑا دانہ دو
مُرغی دے انڈا
انڈا دوں جولا ہے کو
اس سے لوں تاگا
جاؤں پھر بھاگا
موچی کے پاس

موچی میری دُم سیئے
دیکھ تیرا بچّہ جیئے

کسان نے کہا میرے پاس چھلنی نہیں ہے چوہا ایک بُڑھیا کے پاس گیا اور کہا :

سنو دادی امّاں
میں ہو گیا نِکمّا

میری دُم کٹ گئی
مجھ کو دو چھلنی

بُڑھیا نے کہا چھلنی ٹوٹی ہوئی ہے بکری کے پاس جاؤ تانت کا ٹکڑا لاؤ۔

چوہا بکری کے پاس گیا اور بولا :

اے بکری باجی
تیرا بیٹا بنے حاجی
ترے موتی جیسے دانت
مجھے دے تھوڑی سی تانت

بکری کہنے لگی :

میرا پیٹ تو ہے خالی
کیسے کروں میں جُگالی
میری سوکھ گئی آنت
تجھے دوں کہاں سے تانت
جاؤ کھیت جی کے پاس
لاؤ تھوڑی سی گھاس

چوہا کھیت کے پاس گیا اور کہا :

سنو میاں کھیت
آدھی مٹی آدھی ریت
میرا دل ہے اُداس
مجھے دو تھوڑی سی گھاس

کھیت نے کہا، میں تو خشک پڑا ہوں پانی پیوں تو گھاس اُگاؤں۔ اب چوہا چشمے کے پاس گیا اور اسے ساری کہانی سنائی۔ چشمے کو چوہے پر ترس آیا۔ اس نے اچھال کر کھیت میں پانی ڈالا، کھیت نے گھاس اُگائی بکری نے گھاس کھا کر تانت دی، بڑھیا نے تانت سے چھلنی بنائی، کسان نے چھلنی سے دانہ چھانا، مُرغی نے دانہ کھا کر انڈا دیا، جولاہے نے انڈا کھا کر تاگا بنایا، اور موچی نے چوہے کی دُم سی دی ---- چوہا خوش، ہم بھی خوش!!

انتظار فرمائیے

"مار گئی مہنگائی" اور "پاکستان خطرے میں ہے"، ان عنوانات کے تحت منعقدہ مقابلے میں آنکھ مچولی کو اب تک سینکڑوں دلچسپ اور مزیدار کہانیاں موصول ہو چکی ہیں۔ کہانیوں کی جانچ پڑتال کا کام ابھی جاری ہے۔ اس مقابلے کے نتائج کا اعلان جون ۱۹۹۵ء میں کیا جائے گا۔

دنیائے حیرت

انتخاب، اسمٰعیل سرسانہ، ملتان

جی ہاں یہ لیموں ہے کوئی رگبی کی گیند نہیں۔ برطانیہ میں اُگایا جانے والا یہ سب سے بڑا لیموں ہے جو عام سائز کے لیموں سے کئی گنا بڑا ہے ...... اس کا وزن تقریباً (۴٫۸۰۵) کلو ہے۔

اتنا موٹا تازہ کدو ہمارے خیال میں تو اسے شہنشاہ کدو ہونا چاہیے ...... یہ بھی برطانیہ میں اُگایا گیا ہے۔ اس کا وزن ۳۴ ۱۸۲٫ کلو ہے۔

سائمن اور پانی کی ملکہ

سیدہ افشاں افتخار

سائمن اور اس کے ساتھی اس وقت ایک بحری جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ سمندر کی پرسکون لہریں دیکھ کر سائمن نے کہا۔ "ہمارا سمندری سفر کتنا اچھا گزر رہا ہے شاید ہی اس سے پہلے کوئی سفر ایسا آرام دہ گزرا ہو۔" لیکن اس کا تجربہ کار ملاّح کچھ اور ہی سوچ رہا تھا وہ بولا۔ "مگر اس سمندر میں ایک مقام ایسا ہے جہاں پہلے کئی جہاز تباہ ہو چکے ہیں۔ اور جس کی وجہ بھی ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہ آ سکی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد سمندر میں اچانک طغیانی سی آ گئی بڑی بڑی لہریں جہاز سے ٹکرانے لگیں۔ جہاز مضبوط ہونے کے باوجود جلد ہی ڈوب گیا۔ جہاز پر سوار تمام افراد ڈوب گئے صرف سائمن بچا وہ لکڑی کا تختہ پکڑ کر تیرتا رہا۔ مسلسل تیرنے سے اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے حیرانی سے چاروں

طرف دیکھا اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی بڑے سمندری جانور کے ڈھانچے پر ہو۔ اس کے چاروں طرف پانی تھا لیکن پانی اس ناک کان منہ میں نہیں جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک خوبصورت عورت اس کے پاس آئی اس نے سر پر تاج لگا رکھا تھا۔ سائمن نے اس سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں اور میں اس وقت کونسی جگہ پر ہوں؟" عورت نے جواب دیا۔ "زیر آب ایک شہر ہے اور میں یہاں حکومت کرتی ہوں۔ آؤ میں تمہیں یہاں کی سیر کراؤں۔" ملکہ سائمن کو ایک بڑی کھڑکی کے پاس لے گئی جہاں سے سمندر کی تہہ صاف نظر آ رہی تھی۔ یہاں سے سائمن نے اپنے ڈوبے ہوئے ساتھیوں کو بھی دیکھا اسے یہ سب کچھ انتہائی عجیب و غریب لگا۔ ملکہ اسے کئی کمروں میں بھی لے کر گئی جو بیش قیمت خزانوں اور خوبصورت چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔ "میرے پانی کے ملازموں کا کام ہے کہ وہ سمندر میں طغیانی پیدا کریں اور جہازوں کو ڈبو دیں۔" ملکہ کہتی رہی۔ "پھر ہم سمندر سے ہر قیمتی چیز اُٹھا لیتے ہیں مجھے بتاؤ! کیا دنیا میں ہمارے شہر سے زیادہ امیر کوئی شہر ہے؟" یہ سُن کر سائمن غصہ سے بولا۔ "دنیا کا سب سے زیادہ غریب شہر بھی تمہارے شہر سے زیادہ امیر ہے جہاں آسمان ہے، سورج، چاند، ستارے ہیں، دھوپ ہے، دھنک ہے، بارش ہے اور اس کے علاوہ وہاں ایسے حسین قدرتی مناظر ہیں جن کو دیکھ کر انسان اپنا سب دُکھ درد بھول جاتا ہے۔"

"تو کیا تم ان بیش قیمت چیزوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔" ملکہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "ہرگز نہیں یہ بے جان ٹکڑے مجھے ہرگز وہ خوشی نہیں دے سکتے۔" سائمن نے قطعی لہجے میں کہا۔

یہ سُن کر ملکہ شرمندہ ہو گئی پھر دھیرے سے بولی۔ "شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں تم چاہو تو یہاں سے چلے جاؤ میرے ملازم تمہیں زمین پر پہنچا دیں گے۔" ملکہ کے اس فیصلے سے سائمن خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "لیکن کیا تم میرے ساتھ زمین پر نہیں چلو گی۔" ملکہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "کاش میں بھی اس جنّت کی سیر کر سکتی لیکن میرے لئے یہ ممکن نہیں میں صرف پانی میں زندہ رہ سکتی ہوں مگر میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں آئندہ کوئی جہاز تباہ نہیں کروں گی۔" اس کے بعد ملکہ نے سائمن کو بہت مال و دولت کے ساتھ اس کے وطن روانہ کر دیا۔ سائمن نے تھوڑی سی دولت اپنے پاس رکھی اور باقی غریب اور ضرورت مندوں میں بانٹ دی۔

○ ہمیشہ ضرورت مند کے کام آؤ۔
○ کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھانا نیکی ہے۔
○ اگر دنیا میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو ماں باپ کی عزت کرو۔

سیموئیل آشانی، کراچی

تصویر بناؤں کیسے

آرزو کنول

میں مصوّر ہوں
اور رنگوں کے آگے کھڑی ہوں
اور دیکھتی ہوں
یہ میرا وطن ہے
جہاں لوگ وحشت کی تصویر ہو گئے ہیں
"یہ تصویر میں بھی بناؤں"
میں یہ سوچتی ہوں
میں مصوّر ہوں
مجھے لگ رہا ہے
کہ یہ رنگ
سورج کے رنگوں سے مل کر بنے ہیں
ابھی کچھ دنوں میں
ابھی کچھ پلوں میں
یہ سورج یہیں سانس لے گا
جہاں میں کھڑی ہو لیکن!
میں تصویر بناؤں کیسے؟
کہ رنگ مہنگے ہو گئے ہیں......!!

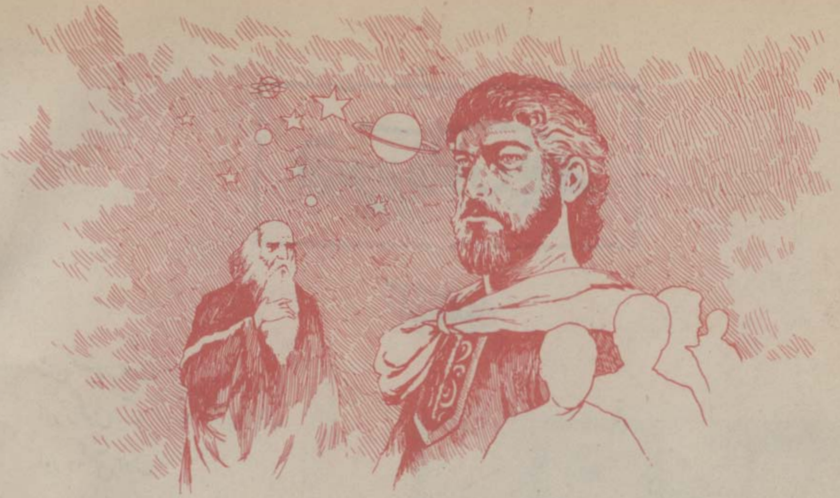

سپر نووا

چنگیز خان

آسمان پہ ہو رہا کیا ہے
یہ ستارہ سا ٹوٹتا کیا ہے

رات کا شاید آخری پہر تھا کہ میں نیند سے بیدار ہو گیا اور میری نگاہیں کسی چیز کے تعاقب میں آسمان کے شمالی حصے کی جانب گئیں تو وہاں سوائے ستاروں کے جھرمٹ کے اور کچھ نہ تھا پھر یکلخت وہاں چند قریبی ستاروں تک سرخ و نارنجی رنگ پھیل گیا۔

پل بھر میں میرا دماغ اس جیسے سینکڑوں سوالوں تک وسیع ہو گیا اور خود ہی اس کی تردید کی "لیکن یہ سب کیا ہے جسے میں سمجھنے سے قاصر ہوں یا اللہ ہمیں اپنی امان میں رکھ" وہ روشنی ۳ منٹ کے بعد ایک انچ تک وسیع ہو کر رک گئی۔ چونکہ میرا تعلق فلکیات سے دلچسپی رکھنے والے خاندان سے ہے۔ یعنی میرے والد اور چچا کا شمار ملک کے نامور ماہر فلکیات میں ہوتا ہے اس لئے پراسرار روشنی کے بارے میں میرا تجسس بھی موروثی ثابت ہوا۔ ڈیڈی سے زیادہ مجھے چچا جانی سے بڑی انسیت تھی کوئی بھی مسئلہ ہو میں حل انہی سے پوچھتا ہوں۔ میں انہیں کے کمرے میں گیا لیکن چچا جانی تو گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے میں

نے انہیں جگا کر دھبے والی بات بتائی تو وہ بجلی کی سی رفتار سے باہر آگئے۔ اور اس سرخ و نارنجی رنگت والے دھبے کو بغور دیکھنے لگے۔ ایک منٹ کے بعد میں نے ان کے ساکت وجود کو ہلا کر پوچھا

"چچا جانی یہ دھبہ کیسا ہے؟"

لیکن جواب دینے کے بجائے وہ مسکرا کر اونچی آواز میں کہنے لگے "آج وہ چیز دیکھ لی جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔"

پھر وہ مجھ پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھے اور اس میں بیٹھ کر باہر چلے گئے میرے ذہن میں بہت سارے سوالات ابھر رہے تھے ---- پھر اچانک مجھے عقب سے ڈیڈی کی آواز سنائی دی۔

"یہ تمہارا چچا کہاں گیا؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے آسمان پر موجود دھبے کی جانب اشارہ کیا جونہی ڈیڈی نے اس دھبے کو دیکھا تو وہ بھی انگشت بدنداں رہ گئے ایک منٹ بعد ڈیڈی بھی گاڑی کی طرف بڑھے

"ڈیڈی آپ کہاں جا رہے ہیں اور یہ سب کیا؟"

مگر انہوں نے بھی میرے سوال کو نظر انداز کیا اور باہر نکل گئے۔

---☆----☆----

دن کے تقریباً" ۱۱ بجے میں صحن کے وسطی درخت کے نیچے بیٹھا ناول پڑھ رہا تھا کہ گیٹ کا دروازہ کھلا اور ڈیڈی اور چچا جانی کی گاڑیاں بالترتیب اندر داخل ہوئیں گاڑیاں پارک کر کے ڈیڈی اپنے اور چچا اپنے کمرے کی جانب روانہ ہوئے۔ میں نے دوڑ کر چچا جانی کو ان کے کمرے کے قریب پکڑ لیا اور ان سے دھبے کے بارے میں سوال کیا انہوں نے بجائے جواب دینے کے کہا۔

"اس وقت میں تھک گیا ہوں جاگنے کے بعد سب کچھ بتادوں گا"

"اور---اوراب مجھے آپ کے جاگنے کا انتظار کرنا پڑے گا"

"مجبوری ہے کیونکہ مجھے تفصیل میں جانا پڑے گا اور تفصیل میں جانے کے لئے سر کھپانا پڑے گا جو اس وقت میں قطعاً" نہیں کر سکتا" یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلے گئے۔ .... دھڑام سے دروازہ بند ہوا چٹخنی لگنے کی آواز آئی اور پھر میں نے ان کے بستر پر دراز ہونے کی آواز بخوبی سنی۔

"اچھا تو تمہیں معلومات چاہیں اس دھبے کے بارے میں لیکن بیچ میں ٹوکنا نہیں---!!"

"ٹھیک ہے آپ بتائیے!" میں نے کہا۔

چچا جانی نے کہنا شروع کیا :

"جس دھبے کو تم دھبہ سمجھ رہے ہو وہ دھبہ دراصل سپر نووا انفجاری ستارہ کہلاتا ہے"

"سپر---نووا----ان----انفجاری

ستارہ یہ کیا بلا ہے؟"
"میں نے کہا تھا ناکہ بیچ میں نہ ٹوکنا' وہی تو بتا رہا ہوں"
"اچھا اچھا اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔"

تو سنو!.....ایسے ستارے جو اپنی عمر مکمل کرلیتے ہیں وہ زندگی پوری ہونے کے بعد ایک دھماکے کے ساتھ خلا میں پھٹ جاتے ہیں۔ ان کے پھٹنے کے بعد جو پھلجھڑی سی چھوٹتی ہے اور گیس اور گرد کی صورت میں ان کا جو ملبہ بکھرتا ہے وہ کبھی کبھار کسی خوش قسمت ماہر فلکیات کی دوربین سے دیکھنے میں آجاتا ہے ان پھٹنے والے ستاروں کو **انفجاری** ستارہ یا سپرنووا کہتے ہیں۔ ستارے پھٹتے رہتے ہیں لیکن عام طور پر ان کا مشاہدہ نہیں ہوپاتا اس لئے کہ وہ ہماری طاقتور سے طاقتور دوربین کی دسترس سے بھی دور ہوتے ہیں۔ مابعد التاریخ دور میں اب تک جو سب سے روشن "سپرنوا" دیکھا گیا ہے اسے ایس این ۱۰۰۶ کہتے ہیں اسے اپریل ۱۰۰۶ء میں "بیٹالوپی" کے قریب دیکھا گیا تھا عام طور پر پھٹنے والا ستارہ چند دنوں سے چند ماہ کے اندر معدوم ہوجاتا ہے لیکن یہ روشن ترین سپرنووا تقریباً" دوسال تک اپنی پھلجھڑی نما روشنیاں بکھیرتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سپرنووا تین ہزار نوری سال کی مسافت پر پھٹا تھا اس کے بعد ۱۰۵۴ء' ۱۶۰۴ء اور ۱۸۸۵ء میں بھی ستاروں کے پھٹنے کے بعد ان کا مشاہدہ کیا گیا تھا۔

حال میں ۲۳ فروری ۱۹۸۷ء کو ایک **انفجاری** ستارے کو پھٹتے ہوئے دیکھا گیا یہ منظر سب سے پہلے "**ایان شیلٹسن**" نے حادثاتی طور پر دیکھا تھا۔ ہوا یہ کہ چلّی کی رصدگاہ پر موصوف آسمان کے ایک مخصوص حصے پر تحقیق کے سلسلے میں اپنی طاقتور کیمروں کی مدد سے تصویریں کھینچ رہے تھے۔ ایک رات تصویریں اتارنے کے بعد فلم ڈیولپ کرتے وقت اسے ستاروں کے جھرمٹ میں ایک دھبہ سا نظر آیا۔ پہلی نظر میں **ایان شیلٹسن** اس دھبے کے بارے میں یہ سمجھا کہ شاید تصویر خراب ہوگئی ہے۔ لیکن بعد میں جب انہوں نے دوبارہ دوربین سے مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ دھبہ پھٹنے والا ستارہ یا "سپرنووا" ہے۔ یہ سپرنووا زمین سے ایک لاکھ ۷۰ ہزار نوری سال کی مسافت پر تھا۔ مئی ۱۹۸۷ء میں یہ اتنا روشن تھا کہ برہنہ آنکھوں سے بھی اس کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ دو تین ماہ بعد یہ ستارہ معدوم ہوگیا اور آج مئی ۹۵ء میں اسے بنا کسی طاقتور کیمرے کی مدد سے برہنہ آنکھ سے دیکھا جارہا ہے میں نے خلائی تحقیقاتی ادارے کو اس "سپرنووا" سے آگاہ کردیا ہے" چچا جانی نے اتنا ہی کہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ٹرن---ٹرن--!!

چچا جانی نے فون اٹھایا خلائی سینٹر سے چچا جانی کے لئے بلاوے کا پیغام تھا پیغام سننے کے بعد وہ چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ آج کے جدید دور میں جہاں سائنسدانوں کے کیمروں کی آنکھیں ہر وقت آسمان پر مرکوز رہتی ہیں وہ آدھے گھنٹے تک اس نایاب روشنی سے کیسے غافل رہے؟؟ حالاں کہ تحقیقاتی اداروں کو اپنے فرائض میں ہر لمحہ چاق چوبند رہنا چاہئے---!!

مشہور پرندوں اور جانوروں کی مجموعی عمریں

جانور و پرندے	عمر
شیر	۴۰ سال
کتا	۱۵ سال
بلی	۱۳ سال
گائے	۲۵ سال
ہاتھی	۱۰۰ سال
اونٹ	۴۰ سال
مگرمچھ	۳۰۰ سال
کوا	۱۰۰ سال
طوطا	۶۰ سال
خرگوش	۵ سال
مور	۲۴ سال
کبوتر	۲۰ سال
مرغی	۱۴ سال
تیتر	۱۵ سال
کچھوا	۳۵۰ سال
راج ہنس	۱۰۰ سال
بھیڑ	۱۲ سال

مرسلہ...... حسن علی شجراہ، جیکب آباد

کیا آپ جانتے ہیں

☆ دنیا کی سب سے بڑی عمارت نیویارک امریکہ انٹر نیشنل ٹریڈ سینٹر ہے۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا میوزیم البرٹ میوزیم لندن ہے۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا بینک 'بینک آف امریکہ' واشنگٹن میں ہے۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا ریڈیو سینٹر روس میں ہے۔

☆ دنیا میں سب سے بڑا پارک کینیڈا میں ہے۔

☆ دنیا کی سب سے بڑی آرٹ گیلری روس میں ہے۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا ائرپورٹ کنیڈی ائرپورٹ، امریکہ ہے۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ اسکول شکاگو میں ہیں۔

☆ دنیا کی سب سے لمبی سڑک تاشقند روس میں ہے۔

مرسلہ : سید افتخار احمد دانش، کراچی

یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلہ ہے

شاعر: صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
انتخاب: آصف اقبال

یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلہ ہے   یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلہ ہے
اس گھر کے باہر جنگلہ ہے   یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلہ ہے
یہ انڈے ہیں
یہ انڈے گھر میں رکھے تھے   اس گھر کے باہر جنگلہ ہے
یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلہ ہے
یہ چوہا ہے
چوہے نے انڈے چکھے تھے   یہ انڈے گھر میں رکھے تھے
اس گھر کے باہر جنگلہ ہے   یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلہ ہے
یہ بلّی ہے
بلّی نے چوہا مارا تھا   چوہے نے انڈے چکھے تھے
یہ انڈے گھر میں رکھے تھے   اس گھر کے باہر جنگلہ ہے
یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلہ ہے

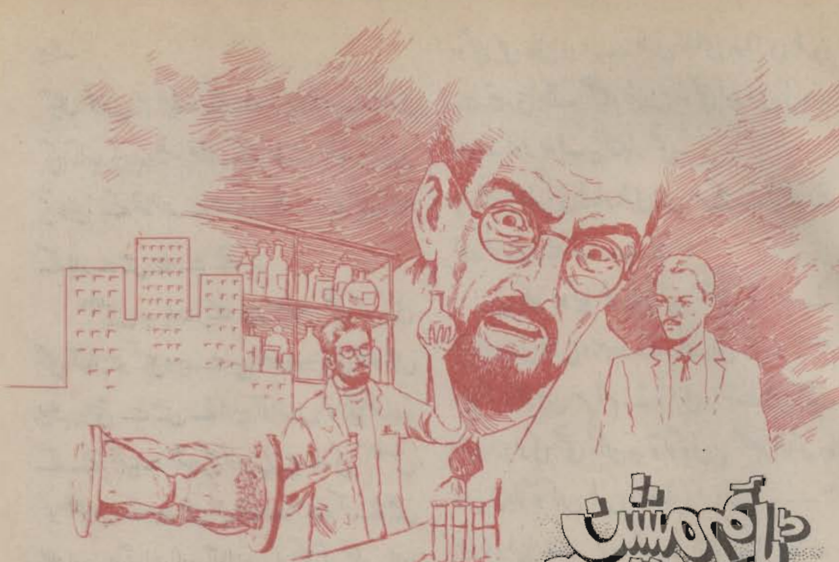

ٹائم مشین کی ایجاد

شمائلہ قاسم

پروفیسر غفار بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ ان کا اسسٹنٹ غوری بھی ان کی مدد کر رہا تھا کبھی پروفیسر ایک چیز اٹھانے کو کہتے کبھی دوسری چیز، پھر اچانک ان کے سامنے رکھے ہوئے ریڈیو سیٹ سے آواز اُبھرنے لگی جو کہ پروفیسر کے بچپن کی آواز تھی، "تم نے میری گاڑی کیوں توڑی اب میں تمہیں اپنا کوئی کھلونا نہیں دکھاؤں گا" یہ سنتے ہی پروفیسر خوشی سے چلّانے لگا "آہا میری ایجاد کامیاب ہوگئی اب میرا ساری دنیا میں نام ہوگا ساری دنیا مجھے پہچانے گی میں اس صدی کا سب سے بڑا سائنسدان بن جاؤں گا۔"

اسسٹنٹ غوری بھی بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا پروفیسر نے لگاتار چھ ماہ محنت کے بعد اس صدی کی سب سے حیرت انگیز چیز "ٹائم مشین" بنا ڈالی تھی۔

پروفیسر غفار ٹائم مشین کو آف کر کے بولے "دیکھا غوری میں نہ کہتا تھا کہ ہم ٹائم مشین ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"آپ کو بہت بہت مبارک ہو سر، آپ نے بہت محنت کی ہے اب یہ مشین ہم انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کریں گے" غوری

بولا۔
"ہاں غوری تم ٹھیک کہتے ہو۔" پروفیسر نے غوری کی تائید کی پروفیسر غفار کے سامنے اخبار' ریڈیو' ٹی وی' کے نمائندے موجود تھے اور وہ اپنی ایجاد کے بارے میں بتارہے تھے :
"ہمیں یہ بات پہلے ہی معلوم تھی کہ کوئی بھی آواز جو کسی وجہ سے پیدا ہو وہ دنیا کی فضا میں ہمیشہ رہتی ہے میں نے ان آوازوں کو کیچ کرنے کے لئے تجربات شروع کردیئے چھ ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد میں ایسا اینٹینا ایجاد کرنے میں کامیاب ہوگیا جو ان آوازوں کو کیچ کرسکے۔ ان تجربات میں میرے مددگار غوری نے بھی میری مدد کی اور آج اس دنیا کی سب سے حیرت انگریز ایجاد آپ کے سامنے ہے شکریہ" لوگ تالیاں بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

پوری دنیا میں پروفیسر کی ایجاد کا تہلکہ مچا ہوا تھا۔۔۔۔ دنیا کے اخبارات میں اس ایجاد کے بارے میں بڑی بڑی سرخیاں شائع ہوئی تھیں دنیا کے چند بڑے ممالک نے ٹائم مشین خرید لیں۔ بڑی بڑی کمپنیاں اس مشین کو بنانے لگیں پھر ایک خوفناک بات ہوئی اس مشین کی مدد سے پروفیسر کے ملک کو اپنے دشمن کے خفیہ راز معلوم ہوگئے اور یہ بھی کہ وہ ان کے ملک کے خلاف کیا سازش کررہا ہے اور پھر دونوں ملکوں میں جنگ شروع ہوگئی یہی حال دوسرے ملکوں کا بھی ہوا اسی طرح سے تیسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ایجاد تھی۔

پروفیسر غفار اپنی لیبارٹری میں سر پکڑے بیٹھے تھے اور غوری سے کہہ رہے تھے :
یہ کیا ہوگیا غوری! یہ مشین تو ہم نے انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بنائی تھی۔" "ہم کیا کرسکتے ہیں سر ہم نے تو اپنی دانست میں ایک مفید ایجاد کی تھی لیکن یہ تو لوگوں پر منحصر تھا کہ وہ اس ایجاد کو کس طرح استعمال کرتے ۔۔۔۔" غوری اپنا جملہ پورا کرنے بھی نہ پایا تھا کہ دھماکے کی آواز آئی۔ زبردست دھماکہ ۔۔۔!!

اور پروفیسر کی تجربہ گاہ ملبے کا ڈھیر بن گئی ان کی تجربہ گاہ پر بمباری ہوگئی تھی۔ دو ایف سولہ طیارے ملبے کے ڈھیر سے اُٹھنے والے دھوئیں کے اوپر سے جارہے تھے!!

طیاروں کی آواز سن کر پروفیسر غفار کی آنکھ کھل گئی۔ ان کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہورہا تھا ان کے بستر پر ایک کتاب اوندھی پڑی ہوئی جس کا نام تھا "مستقبل کی ایجادیں" اور پروفیسر رات اسی کتاب میں ٹائم مشین کے بارے میں پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے ۔۔۔!!

انسان حرم میں جا کے بھی انساں نہ ہوا
پتھر صنم کدے میں گئے تو خدا ہو ئے

مرسلہ...... اظہر خان، بلوچ، بھکر شہر۔

یہ آزادی جس کسی سے روٹھ جائے ایک بار
صدیوں کرنا پڑتا ہے قوموں کو اس کا انتظار

مرسلہ...... صائمہ کنول، حیدر آباد۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

مرسلہ...... نعیم احمد نعیم، کراچی۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

مرسلہ...... فدا حسین بلوچ، تربت

یہ شعر مجھے پسند ہے

قارئین کے منتخب اشعار

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

مرسلہ...... محمد زاہد سلیم، کراچی۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

مرسلہ...... جویریہ تھانوی، کراچی

وہاں تاریک لمحوں کے عوض سورج کو ٹھکرا دو
جہاں اپنا ضمیر اپنے لئے الزام بن جائے

مرسلہ...... عبدالروف رونی، ملتان کینٹ۔

وہ انسان نہیں جو ڈر جائے حالات کے خونی منظر سے
اس دور میں جینا لازم ہے جس دور میں جینا مشکل ہو

مرسلہ...... صائمہ کنول، حیدر آباد۔

یہ بساطِ ہستی بھی ایک بساطِ حیرت ہے
پختہ کار ہوتے ہیں لوگ یہاں مات کھانے سے

مرسلہ...... فیصل احمد خان، کراچی۔

خاک کے پُتلے میں دیکھو کیا تکبّر تیز ہے
خاک سے ہی پیدا ہوا خاک سے پرہیز ہے

مرسلہ...... حاجی مظفر حسین، بہاولنگر

گونگے بنے رہے تو بھی مانتے تھے بات
بولے تو ہم کسی کو بھی قائل نہ کر سکے

مرسلہ...... فریدہ رشید، لاہور

تو اِدھر اُدھر کی بات نہ کر یہ بتا قافلہ کیوں لُٹا
مجھ راہزن کی خبر نہیں تیری راہبری سے سوال ہے

مرسلہ...... فریدہ رشید، لاہور

ساحل کے تماشائی ہر ڈوبنے والے پر
افسوس تو کرتے ہیں بچایا نہیں کرتے

مرسلہ...... شیام لعل، لسبیلہ

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

مرسلہ...... فدا حسین بلوچ، تربت

اے بی سی

محمد اظہر خان

اے بی سی جلدی کرو جی
ڈی ای ایف اسکول چلیں سب
جی ایچ آئی کرنی ہے پڑھائی
جے کے ایل کرکٹ میرا کھیل
ایم این او ایک اور ایک دو
پی کیو آر کشتی لگے پار
ایس ٹی یو کوئل بولے "کُو"
وی ڈبلیو ایکس یہ ہے اسکول بس

تتلی

محمد اشعر انعام

ان کلیوں کی میں رانی ہوں
میں پھولوں کی شہزادی ہوں
میں تتلی ہوں میں تتلی ہوں
میں پیاری پیاری تتلی ہوں
پر رنگ برنگے ہیں میرے
ہر باغ میں پھیرے ہیں میرے
میں کتنی پیاری تتلی ہوں
میں پھولوں کی شہزادی ہوں

نوٹس بورڈ

مقابلوں کے نتائج اور ضروری اعلانات نوٹس بورڈ پر درج کیے جائیں گے۔
ہر مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن روانہ کرنا ضروری ہے۔
کوپن صفحہ نمبر ۲۴۰ پر ملاحظہ فرمایئے۔

آپ کی پرجوش فرمائش پر قلمی دوستی کا ایک نیا سلسلہ "ہیرو کے مہمان" کے عنوان سے شروع کیا جارہا ہے۔ اس میں ایسے بچوں کا تعارف اور تصاویر شائع کی جائیں گی جو اس ماہ میں پیدا ہوئے ہوں۔ ادارہ آنکھ مچولی کے علاوہ اُسی مہینے میں پیدا ہونے والے کوئی قومی ہیرو بھی بچوں کے میزبان ہوں گے۔ اپنے تعارف اور شناختی کارڈ سائز بلیک اینڈ وائٹ تصویر آج ہی روانہ کر دیجیے

آپ کے ایسے دوست جو آنکھ مچولی پڑھنا چاہتے ہوں لیکن اسے خریدنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، آپ انہیں آنکھ مچولی کا تحفہ مفت پیش کر سکتے ہیں آپ ان کا نام اور پتا کوپن میں لکھ کر ہمیں بھیج دیجیے ———— ادارہ ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی دس ساتھیوں کو اپنا ممبر بنالے گا اور انہیں ایک سال کے لیے آنکھ مچولی مفت جاری کر دیا جائے گا۔ اس طرح آپ ایک نیک کام کریں گے اور ادارہ آنکھ مچولی کو بھی ایک نیک کام کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔

کوپن برائے "سالانہ خریداری"

نام ____________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ____________

رقم ____________ بذریعہ ____________

پتا ____________

فون نمبر ____________

کوپن برائے "ہیرو کے مہمان"

نام ____________ تاریخ پیدائش ____________ جماعت ____________

تعلیمی ادارہ ____________ مشغلہ ____________

پتا ____________

____

کوپن برائے "تحفہ آنکھ مچولی"

میرے دوست کا نام ____________

جماعت ____________

گھر کا پتا ____________

____

کوپن برائے "سب سے بہترین"

سب سے اچھی کہانی ____________ مصنّف ____________

سب سے اچھی نظم ____________ شاعر ____________

بھیجنے والے کا نام اور پتا ____________

____

محاورہ کہانی

صائمہ دلدار

آپ نے آپ بیتیاں بہت سنی ہوں گی لیکن محاورہ کہانی شاید ہی سنی ہو۔ چلئے آج آپ کو محاورہ کہانی سناتے ہیں۔

دراصل ہمارے ایک انکل ہیں انہیں اردو سے بہت لگاؤ ہے اور محاورات تو ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ بس جناب چند روز ہمارے گھر کیا رہ کر گئے ہمیں بھی اپنا ہمنوا بنا گئے۔ تب سے یہ حال ہے کہ ہمارے محاورات سے ہر ایک کی جان تنگ ہے۔ کم بخت ہر وقت زبان پر سوار رہتے ہیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ بھائی جان اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہوئے فرمانے لگے۔ اس دفعہ میں ضرور فلم میں چانس حاصل کروں گا۔ ایسے لمحوں میں ہم بھلا چپ رہ سکتے تھے فی الفور بولے "یہ منہ اور مسور کی دال" ہم تو خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے کہ محاورہ بالکل فٹ بیٹھا تھا۔ ادھر بھیا تو غصے سے آگ بگولا ہو گئے انہیں غصے سے لال پیلا ہوتے دیکھ کر امی نے تو ہمیں وہ بے نقط

کی سنائیں کہ زمین آسمان ایک کردیا۔ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھے سو کان دبا کر بیٹھ رہے۔ دل ہی دل میں ٹھان لی کہ اب خواہ دنیا ادھر کی ادھر ہوجائے اپنی ٹانگ قطعی نہیں کسی مسئلے میں اڑائی۔ کچھ دن سکون سے بیٹھ رہے۔ لیکن آخر کب تک کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آرے نہیں نہیں گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ لیکن ہماری شامت آئی تو ہم نے خالہ نصیبن کے گھر کا رخ کیا۔ خالہ نصیبن تو آفت کی پرکالہ ہیں۔ لگائی بجھائی میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں۔ چلتا پھرتا کمستان ریڈیو ہیں وہ۔ ہاں تو جب ہم خالہ کے گھر داخل ہوئے تو خالہ کی بیٹھک سے آتی آوازوں نے ہمارے قدم روک لئے۔ اب ہم نمبرون جاسوس بنے دروازے سے کان لگائے کھڑے تھے۔ اندر حسب معمول خالہ اپنی کسی جاننے والی سے محلے والیوں کی بدخوئیاں کررہی تھیں۔ اب یہ ہماری قسمت کہ خالہ نصیبن نے معلوم نہیں کب اٹھ کر اچانک دروازہ کھول دیا اور دھڑام سے ہم فرش خاک پر بچھے تھے۔ ہمارا تو کاٹو بدن تو جسم میں لہو نہیں والا معاملہ تھا۔ خالہ نصیبن ہمیں اپنی شعلہ بار اور مہمان خاتون حیران کن نظروں سے تک رہی تھیں۔ ہم نے اب اٹھ کر حالات کی سنگینی کا اندازہ کیا اور خالہ سے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی ناکام سعی کی جو کہ لاحاصل رہی۔ مگر خالہ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بقول خالہ انہوں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہماری شکل ہمارے عمل کی چغلی کھا رہی تھی۔ نتیجتاً" ابو' امی سے وہ ڈانٹ پلوائی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔

ایک دن ہمارے گھر کافی دور پار کے عزیز آئے۔ وہ ابو سے باتوں میں محو تھے کہ ہم بھی قریب جا بیٹھے۔ وہ صاحب ابو کو اپنے گھر میں ہونے والی چوری اور تھانیدار کی لاپرواہی کے بارے میں بتارہے تھے۔ ہم بلا سوچے سمجھے بولے۔ "الٹا کوتوال چور کو ڈانٹے۔" وہ صاحب ہماری بدتمیزی پر ہمیں گھورنے لگے اور اپنا غصہ بھی ساتویں آسمان پر پہنچادیا ان کے ساتھ تو جو ہوا سو ہوا۔ ابو کا پارہ ان سے بھی ہائی تھا کہ ہم جب بھی بولے الٹ بولے۔ ہم شرمندگی کے مارے چلو بھر کر پانی میں ڈبکی لگانے کراچی او سوری باہر چلے گئے۔ پٹنے کی تھوڑی کسر رہ گئی تھی۔ بس اللہ میاں کو رحم آگیا اور ہم بال بال بچ گئے۔ اپنا یہ حال دیکھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ محاوروں کی یہ کہانی آنکھ مچولی کے خاص نمبر میں بھیج دینی چاہیئے پھر یہ بھی سوچا کہ اگر نہ چھپی تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے----!!

NUT CHOCOLATE
Milk Chocolate with Nuts
HACKS DROPS
HERO
HACKS
mentholated drops.
HERO
creamy milk chocolate
with rich coconut filling.
ORANGE CANDIES
real orange taste.
NUT CHOCOLATE
milk chocolate
full of nuts.
MOVE TO PAXY'S GALAXY OF SWEET STARS
Paxy's
SIND CHOCOLATE WORKS
Plot No. 11, K-28(C), University Road, Karachi-74800, Pakistan.

Chiclets
FUN
ADAMS
PEPPERMINT
Chiclets
Chewing Gum
FLAVOR COATED GUM
Chiclets
Available in 4 exciting flavours.
ADAMS
Chiclets
pop in freshness